

محی الدین نواب کے نشر قلم سے دو پیار کرنے والوں کی داستان

ابجاذت

محی الدین نواب

محی الدین نواب کے نشر قلم سے دو محبت کرنے والوں کی داستان

اجازت

محی الدین نواب

ایف آئی پی بلیشرز اینڈ بک سیلرز

چوک میوہ پیتال نسبت روڈ لاہور
فون: ۷۷۳۸۵۳

دیباچہ

بھلے وقتوں کی بات ہے جب ایک ملک سے کسی دوسرے ملک میں جانے کے لئے خاص تردد کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ لوگ آسانی سے ایک سے دوسرے ملک آ سکتے تھے۔ وہ تجارت بھی کرتے اور محنت مزدوری بھی۔ انسانی آبادی کے پھیلنے کے نتیجے میں مسائل میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ترقی پذیر ممالک میں روزگار کے مواقع کم اور ملوثہ انتہائی گھیل ہونے کی وجہ سے ان ممالک کے لوگوں نے ترقی یافتہ ممالک کا رخ کرنا شروع کر دیا جہاں روزگار کے مواقع وافر اور معاشرے بھی پرکشش تھے۔ یہ رجحان اتنا بھانک رہا کہ نئے دیکھ بھون ملک جانے کی کوشش کر رہا ہے۔ ترقی پذیر ممالک کی اس یلغار پر وہاں کے لئے ترقی یافتہ ممالک نے اپنے ایمگریشن قوانین میں سختیاں کر کے اس ہوا کے آگے بندھا دینے کی کوشش کی۔

یہاں سے لوگوں نے انسانی فطرت کے عین مطابق چور و دواڑے ڈھونڈنے شروع کر دیئے اور غیر قانونی طریقوں سے ان ممالک میں داخل ہونے لگے اور چوری چھپے وہاں محنت مزدوری کرنے لگے۔ غیر قانونی ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کے لئے مسائل ہی مسائل کھڑے ہو گئے۔

محمد امین نواب نے ان ہی تارکین وطن کے مسائل کے پس منظر میں یہ خوبصورت کہانی لکھی ہے جو روزی کی تلاش میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر سات سمندر پار جاتے ہیں۔ یوں تو نواب صاحب نے معاشرے کے ہر موضوع پر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے لیکن ایمگریشن قوانین اور غیر قانونی تارکین وطن کے بارے میں جس انداز سے لکھا ہے یہ انہی کا خاصا ہے۔ اپنی روایت کے مطابق اپنے نثر قلم سے کٹ دار تحریر لکھی ہے۔

اشاکش ۱۔

علی میاں پبلی کیشنز

۲۰۔ عزیز مارکیٹ، ارجو بازار

لاہور۔ فون: ۳۲۴۴۱۳

یہ ایک ایسے پاکستانی کی کہانی ہے جو غیر قانونی طور پر انگلینڈ میں مقیم ہے۔ اسے پاکستان میں ایک لڑکی سے محبت ہو جاتی ہے اور بڑی مصیبتوں کے بعد ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ یہ ایک الگ استثنائی دلچسپ کہانی ہے۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیوی کو انگلینڈ بلا چاہتا ہے مگر امیگریشن قوانین آڑے آتے ہیں کیونکہ وہ خود وہاں غیر قانونی طور پر رہا ہے۔ پھر وہ اپنے دوست کے کاغذات پر اپنی بیوی کو دوست کی بیوی ظاہر کر کے انگلینڈ لیتا ہے۔ یہاں سے کہانی نہایت سنسنی خیز ہو جاتی ہے جب اس کے دوست کی نیت خراب ہو جاتی ہے اور وہ اس کی بیوی پر قبضہ جمالیتا ہے۔ دونوں کے درمیان اس کشمکش کو بڑا خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے ”اجازت“ پڑھنے والے بہت سے لوگوں کو اس میں اپنا چہرہ نظر آجاسکے کیونکہ یہ ہمارے ارد گرد پھیلے ہوئے لوگوں کی کہانی ہے۔ بچے موضوع اور کہانی کے اعتبار سے محی الدین نواب کا یہ ایک منفرد ناول ہے۔

ادوارہ

انسان کی زندگی میں کبھی ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں سے وہ گزر نہیں پاتا۔ اسے اس مقام پر قدم رکھنے کی اجازت نہیں ملتی۔ اگر وہ امیگریشن قوانین پر پورا اترے تو کسی ملک کی زمین پر قدم رکھنے کی اجازت مل جاتی ہے۔ اگر ناپسندیدہ رویہ اختیار کرے تو اپنے سماج میں بچا جگہ نہیں ملتی۔ اگر اس میں حسن و خوبی ہو پھر ایسے میں حسن نظر مل جائے تو کسی کے دل میں جگہ مل جاتی ہے۔ گویا کبھی کبھی جگہ بنانے کے لیے حسن سلوک حسن ذہانت اور حسن نظری ضرورت پیش آتی ہے۔

جیسی ایک جھگڑے سے رک گئی۔ وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا اچھل کر اگلی سیٹ کی پشت سے ٹکرایا پھر جھنجھلا کر بولا۔ ”کیا مذاق ہے؟“

ڈرائیور نے پلٹ کر کہا۔ ”مذاق کے“ ڈی“ اے والے کرتے ہیں“ دو گھنٹے پہلے یہ راستہ صاف تھا۔ اب یورڈ لگا دیا گیا ہے کہ سڑک کی مرمت ہو رہی ہے۔“

پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے دوا اسکرین کے پار دیکھ کر پھر سوچا۔ ”کوئی سڑک مرمت کرنے والا نظر نہیں آ رہا ہے۔ راستہ صاف ہے۔“

ڈرائیور نے کہا۔ ”بھائی صاحب! میل دو میل“ چار میل کے قافلے پر کہیں تو سڑک مرمت ہو رہی ہو گی۔ ”سڑک بند ہے“ کا بورڈ میاں لگا دیا ہے۔ جگھے والے دو چار میل پہلے ہی خطرے کی گھنٹی بجادیتے ہیں۔“

نوجوان اب دوا اسکرین کے پار نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ کھڑکی کے پار چوڑیوں کی ایک دکان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسنے شوق سے دیکھ رہا تھا جسے اس کی نگاہیں نہیں دل بھی ادھر کھنچا جا رہا ہو۔ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”خدا کی پٹلا“ کتنی حسین ہے۔“

ٹھیکسی ڈرائیور نے ایک نظر نوجوان پر ڈالی۔ پھر اس کی نگاہوں کی سمت چوڑیوں کی دکان کی طرف دیکھا وہاں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، البتہ اس کے نرم و نازک ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ دکان کے کاؤنٹر پر ایک اوجیز عمر کی عورت اسے چوڑیاں پہنا رہی تھی۔

چوڑیاں، مشرقی عورت کا احترام سنگھار ہیں، گلابیوں میں پہنچنے ہی دل کی طرح جیتے لگتی ہیں۔

پہننے وقت جب کلائی چوڑیوں میں داخل ہوتی ہے تو کلائی دالی خابوں میں داخل ہونے لگتی ہے۔

وہ انجی کون ہو گا؟ کیا ہو گا؟ جو چوڑیوں دالی کلائی کو تھانے آئے گا۔ اے انجی! آج ہی جلد آ کے ذرا دیکھ لے۔ دنیا کی پہلی اور آخری جھکڑی ہے جو میں نے تیرے نام سے پہنی ہے۔

نوجوان پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکلے گا، ٹھیکسی ڈرائیور دوسری طرف سے گھوم کر اس کے پاس آیا۔ پہلے جوان مسافر کو دیکھا اس کے بعد چوڑیوں کی دکان کی طرف دیکھا، پھر پوچھا ”آپ نے فرمایا تھا کہ لندن سے آ رہے ہیں؟“

نوجوان پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ صرف اسی لڑکی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ڈرائیور نے کہا ”بھائی صاحب! یہ لندن نہیں کراچی ہے۔ پاکستان ہے۔ یہاں کسی عورت کو ویسے پھاڑ کر دیکھنا گناہ ہے“ جرم ہے۔“

اس نے اپنے سر سے ٹوپی اتاری پھر سنبھلے سر کو اس کے سامنے جھکا دیا۔ نوجوان نے چونک کر پوچھا ”یہ کیا؟“

”یہ قدرتی مٹھاپن نہیں ہے۔ نوجوانی میں ایک بار کسی کو چھیڑا تھا اب تک مٹھا چلا آ رہا ہوں۔“

”میں چھیڑا نہیں چاہتا۔ صرف اس کا نام اور پتا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

”اوسے اوسے“ یہ کیا غضب کرنے جا رہے ہیں۔ نام پوچھنے پر دس پتا پوچھنے پر

”یہ دس کیا ہے؟“

”کوڑے۔ یہاں لڑکیوں کو چھیڑنے پر کوڑے لگتے ہیں۔“

”مگر وہاں تو ایسا نہیں ہوتا۔ آخر عورت بھی انسان ہے۔ جس طرح ہم کسی مرد سے باتیں کرتے ہیں اسی طرح کسی عورت سے بھی کر سکتے ہیں۔“

”اس سے پہلے کہ آپ باتیں کرنے کے قابل نہ رہیں میرا کرایہ ادا کر دیجئے۔ میں ڈکی سے سامان نکال رہا ہوں۔“

وہ غصے میں پاؤں پٹختا ڈکی کی طرف گیا۔ پھر اسے کھولتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا تو نوجوان وہاں سے غائب تھا۔ چوڑیوں کی دکان پر پہنچ گیا تھا۔ اس لڑکی کے چہرے کھڑا ہو گیا تھا۔ مرد، عورتیں، بوڑھے، بچے فٹ پاتھ پر سے گزر رہے تھے۔ اس دکان میں بھی چند عورتیں چوڑیاں پسند کر رہی تھیں۔ اگرچہ وہ منہلی ماحول سے آیا تھا تاہم ایک مشرقی لڑکی کو مخاطب کرتے ہوئے ہنچکا رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے؟ کس طرح مخاطب کرے؟ وہ چوڑیاں پہن چکی تھی۔ کاؤنٹر کے پاس سے پلٹنے لگی۔ اچانک اپنے رویہ پر ایک انجی کو دیکھ کر چند لمحوں کے لیے سسے ہوئے انداز میں ساکت رہ گئی۔

سسے ہوئے حسن میں غضب کی جاذبیت تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں دشت سے یوں پھیل گئی تھیں جیسے شکاری کے سامنے پہنچنے ہی ہنی چوڑیاں بھول گئی ہو۔

مسافرات کو راستہ بھولتے ہیں۔ وہ دن کو راستہ بھول رہی تھی۔ اچانک کوئی سامنے آ جائے تو بڑی محبت سے ڈر لگتا ہے، کہیں یہ وہی تو نہیں جو میرا راستہ بدلے آیا ہو؟

کوئی انجی راستہ بدلے آئے تو پہلی بار یقیناً ڈر لگتا ہے۔ اس نے خوفزدہ ہو کر بیچ ماری۔ ”ڈرنا بھائی!“

دوسرے کاؤنٹر پر سے ایک اوجیز عمر کے شخص نے پلٹ کر لڑکی کو دیکھا پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”لا حول ولا قوہ یہ سالیان جب دولہا کتنی ہیں تو بھائی کیوں کتنی ہیں؟“

ایک ادیز عمر کی عورت تیزی سے چلتے ہوئے لڑکی کے پاس آئی۔ پھر بولی۔ ”کیا بات ہے مونہ؟“

مونہ کا خوف قدرے کم ہو گیا تھا۔ وہ ہچکچا رہی تھی۔ اپنی بہن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی ”آپا! اوہ۔ وہ میرا مطلب یہ ہے یہ..... یہ.....“

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، کیا کہنا چاہیے؟ وہ کیوں بیچ بڑی تھی؟ جانے اس اجنبی کو کیا سمجھ بیٹھی تھی۔ اس کی آپا نے پوچھا۔ ”کیوں بھی کیا بات ہے؟“

اس ادیز عمر کے شخص نے بھی قریب آ کر پوچھا۔ ”ہاں کیا بات ہے؟ دیکھو مسٹر! یہ دونوں ہمیں ہیں۔ میں ان میں سے ایک کا دولہا اور دوسری کا بھائی ہوں۔ عجیب رشتہ ہے۔ بہر حال آپ فرمائیے؟“

”جی میں لندن سے آیا ہوں۔“

”لندن سے تو پوسٹ کارڈ بھی آ جاتا ہے۔ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میں اسی محلے میں رہتا ہوں۔ اپنی گلی اور گھر کا راستہ بھول گیا ہوں۔ پتا معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“

دکان کے باہر سے عیسٰی ڈرائیور نے بیچ کر کہا۔ ”او بھائی صاحب! میں کہہ رہا ہوں، لگی گلی میں آپ کا مکان ہے۔ سلمان اٹھائیں اور چلے جائیں۔ شکر کریں مجھ جیسا ایماندار عیسٰی دلال مل گیا ورنہ آپ ادھر عشق فرماتے جاتے ادھر آپ کا سلمان غائب ہو جاتا۔“

مونا فوراً ہی اپنی آپا کے پیچھے چلی گئی۔ سوائے نظروں سے اجنبی کو دیکھنے لگی۔ سمجھتا چاہتی تھی، عشق کا تعلق کس سے ہے۔ یہ بات ڈرائیور کس کے لیے کہہ رہا ہے؟

ادھر یہ پریشان ہو گیا تھا اس نے ہچکچاتے ہوئے معذرت طلب نظروں سے مونہ اس کی بہن اور بہنوں کو دیکھا، پھر لپکتا وہاں دکان کے باہر آیا۔ ڈرائیور کے بازو کو پکڑ کر جھجھوڑتے ہوئے بولا۔ ”کیوں بسا، پھوڑ رہے ہو۔ ذرا انتظار نہیں کر سکتے۔ میں دیننگ چارجر ادا کروں گا۔“

”میرا بازو تو چھوڑو۔ لڑکی دیکھ رہی ہے۔“

اس نے جلدی سے بازو چھوڑ کر مونہ کی طرف دیکھا۔ وہ دکان کے اندر ابھی تک آپا کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی اور اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا بڑی بڑی کنوڑا سی آنکھیں تھیں۔ اور ہی سے دل میں گھر گھر تھیں۔ اس کے بہنوں نے دکان کے باہر آ کر پوچھا۔ ”کیوں میاں! یہ کیا بات ہوئی؟ یہ ڈرائیور تمہارا پتا جانتا ہے تم اگلی گلی میں رہتے ہو اور ہم سے پتا پانپنے آئے تھے۔“

”وہ بات اصل میں یہ ہے کہ میں آپ کا پتا پوچھ رہا تھا۔“

”میرا پتا؟“

”جی ہاں، لندن میں کسی لڑکی سے بات کی جائے تو وہ برا نہیں مانتی بلکہ اپنا پتا بھی بتا دیتی ہے۔ میں تو آپ کا پتا پوچھ رہا ہوں۔“

وہ ادھر باتیں کر رہا تھا، ادھر مونہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی شرمیلی ادا میں جانے اس کے لیے تھیں مگر، جیسی کی جان لے رہی تھیں۔ ایسی ادا میں اس نے مغربی ماحول میں نہیں دیکھی تھیں۔ وہ اپنی آپا کے پیچھے چھپ بھی رہی تھی اور چور نظروں سے دیکھتی جی جاری تھی۔ شرمانے کا عجیب انداز تھا۔ جیسے اجنبی سے کوئی نات نہ ہو مگر چور نظروں کا رشتہ ہو۔

اس کا بہنوں کہہ رہا تھا۔ ”میاں صاحبزادے! میں آج کل کے نوجوانوں کو خوب بھگتا ہوں۔ لندن سے آئے ہو سیدھے گھر جاؤ۔ کسی اور کا پتا پوچھو گے تو گھر تک نہیں پہنچ پاؤ گے۔“

وہ اپنی بہن کا بازو تھام کر اس کے ساتھ چلتے ہوئے دکان سے باہر آئی اپنے بہنوں کے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ نوجوان نے کہا۔ ”میں آپ کے شرمیں اجنبی ہوں۔ اگر آپ سے کچھ پوچھتا ہوں تو جواب دینا آپ کا فرض ہے۔ ایک چھوٹا سا سوال ہے۔ کیا کسی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا کسی سے تعارف حاصل کرنا جرم ہے؟“

”لندن سے تم پہلے نہیں آئے ہو۔ میاں سینکڑوں آتے ہیں۔ خود میرے دوست کا بھائی لندن میں رہتا ہے۔“

نوجوان نے چونک کر پوچھا۔ ”کون رہتا ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ وہاں سے میرے کتنے

ہی دوستوں نے اپنے رشتہ داروں کو سلام بھیجا ہے۔ مجھے ان تک سلام پہنچانا ہے۔ آپ کے دوست کے بھائی کا نام کیا ہے؟

”تم اسے نہیں جانتے اور وہ ہمیں کیا سلام بھیجے گا جب سے بھائی کا انتقال ہوا ہے اس نے ہمیں بھی بھلا دیا ہے۔ اس کے ماں باپ نے خواہ مخواہ اس کا نام مروت خاں رکھا۔ اس کا نام بے مروت ہونا چاہیے۔“

”مروت؟“ نوجوان نے اپنی ایک ہتھیلی پر دوسری ہتھیلی سے زور داتالی بجاتے ہوئے کہا۔ ”بھئی مروت خاں تو بریے فورڈ میں میرے ساتھ ہی رہتا ہے اور آپ کا جو نقش کھینچتا ہے ہو ہو آپ دیسے ہی ہیں۔ کیا نام بتایا تھا اس نے آپ کا ٹھہریے ہیں یاد کرتے ہیں۔“

وہ اپنی کتھنی پر انگلی رکھ کر سوچنے لگا۔ کن اکھیں سے موناکو دیکھنے لگا۔ وہ پھر اپنے آپ کے پیچھے پھینے لگی۔ اس نے کہا۔ ”مجھے یاد نہیں آ رہا ہے۔ کہنے تو ابھی ٹیکسی کی ڈکر سے اپنا سلمان نکال کر اس میں سے نوٹ بیک نکالوں اور آپ کا نام بتاؤں؟“

”اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا نام خلیل احمد ہے۔ اگر تم سچ کہہ رہے ہو تو اس نے یقیناً میرے نام کوئی خط بھیجا ہو گا۔“

”بالکل یاد آ گیا واقعی آپ کا نام خلیل احمد ہے۔ اس نے صرف خط ہی نہیں بلکہ تحفے بھی بھیجے ہیں۔ آپ نے تو میری مشکل آسان کر دی۔ اب مجھے دو سروس سے آپ کے گھر کا پتہ پوچھنا نہیں پڑے گا۔ آپ ہی بتا دیں۔“

”ہمارا پتہ کیا ہے۔ وہ سڑک کے آس پار دوسری گلی میں دسواں مکان ہے۔ پورا محلہ خلیل احمد کو جانتا ہے جس سے پوچھو گے وہ ہمارے گھر پہنچا دے گا۔“

نوجوان نے موناکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بس سمجھ لو کہ میں پہنچ گیا۔“

موناکو نے اپنی آپا کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ”چلے۔“

آپا نے اپنے میلا، کے بازو کو تھام کر کہا۔ ”چلے۔“

خلیل احمد نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”خرو آہ میں انتظار کروں گا۔“

نوجوان نے الدوا کی انداز میں ہاتھ ہلایا مگر وہ موناکو دیکھ کر ہاتھ ہلا رہا تھا۔ وہ جاری تھی۔ دور ہوتی جا رہی تھی۔ وہ ایک ٹک کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ پھریوں لگا جیسے آس پاس کی دنیا کم ہو گئی ہو۔ صرف وہی وہ ہو۔ اس کے راستے میں پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی ہوں۔ موناکو چال میں شاعرانہ حسن تھا۔ اس کے قدم یوں اٹھ رہے تھے جیسے باد صبا کی ہتھیلی پر پاؤں رکھ کر چل رہی ہو۔

محبت ایسے ہی سحر چھوکتی ہے۔ ساری دنیا کو نظروں سے اوجھل کر دیتی ہے۔ اپنے اور اس کے سوا کوئی نظر نہیں آتا۔

پھولوں کی راہ گزر ڈھواں ڈھواں سی تھی۔ وہ آگے جا رہی تھی۔ اس کا آئینل اڑتا ہوا پیچھے کی طرف لہرا رہا تھا۔ جیسے اجنبی کو چھوڑنا نہ چاہتا ہو۔

وہ ایک قدم آگے بڑھتی تھی۔ پھر ایک ادانے ناز سے گھوم کر دیکھتی تھی۔ اپنی نگاہوں کا چارہ ذاتی تھی پھر آگے بڑھ جاتی تھی۔

حالانکہ وہ بے چاری کب کی جاچکی تھی لیکن کسی کے جانے سے تصور نہیں جاتا۔ کھلی آنکھ کا سپنا رہ جاتا ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”بھائی صاحب! واپس آ جائیے۔ دیننگ چارجر بڑھتے جا رہے ہیں۔“

نوجوان نے چونک کر ڈرائیور کو دیکھا۔ پھر اس فٹ ہاتھ کی طرف دیکھا، جس پر سے گزرتے ہوئے ابھی موناکو تھی۔ اب وہ نہیں تھی۔ چاروں طرف ٹریفک کا شور تھا۔ گاڑیوں کے ہارن بج رہے تھے۔ کہیں قہقہے مچ رہے تھے کہیں زور زور سے باتیں کرتے ہوئے لوگ گزر رہے تھے۔ ہر طرف شور تھا ہنگامہ تھا۔ سب کچھ تھا مگر وہ نہیں تھی۔

یہ دنیا کتنی ہنگامہ پرور ہو گئی ہے۔ آنکھوں کے فریم میں نہ کسی تصویر کو رہنے دیتی۔ نہ تصور کو قائم رہنے دیتی ہے۔ اپنی بے پناہ آوازوں کے پھر مار کر تمام پنہوں کو پھٹا پھوڑ کر دیتی ہے۔

گئی۔ اب تو میں جب تک اپنے بیٹے کی شادی نہیں کروں گی، اس وقت تک واپس نہیں جانے دوں گی۔“

”اوہ مئی آپ یوں سمجھ لیں کہ میں نے کر لی ہے۔“

”کیا؟“ سب نے اسے چونک کر دیکھا۔ باپ نے پوچھا ”کیا دلا جی ہے؟“

”پاکستانی ہے۔“

”تو نے وہاں کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کر لی اور ہمیں اطلاع نہیں دی۔“

”مئی وہاں نہیں کی ہے۔ اس بے چاری نے تو شاید کبھی انگلینڈ میں قدم بھی نہ رکھا ہو۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پاکستان میں ہے اور تم انگلینڈ میں پھر شادی کیسے ہوئی؟“ باپ نے پوچھا ”کیا ٹیلیفون کے ذریعے؟“

”اوہ فوہلیا! آپ لوگوں کی شرکت کے بغیر بھلا میں شادی کر سکتا ہوں۔ شادی بیس ہوئی۔ ابھی تو میں اسے راضی کرنے والا ہوں۔“

”ماں نے گاؤاری سے کلمہ ”کیا ترے لیے لڑکیوں کی کمی ہے جو کسی کو راضی کرے گا کسی کی خوشامد کرے گا۔“

”اس کے پیلانے کلمہ ”جب اس کے باپ نے تمہاری خوشامد کی تھی تو یہ کیوں نہ ہے۔“

”مئی نے پیا کو گھور کر دیکھا۔ پھر کلمہ ”دیکھو بیٹا، شادی بھلے اپنی مرضی سے کرو لیکن حاندان ہمارے برابر کا ہو، لڑکی لکھی پڑھی نہ ہو کوئی بات نہیں مگر ہستی والی ہو۔ آخر اتنا بڑا گھر کون نبھالے گا۔“

”مئی! مگر سنبھال ہے تو کسی گورنس کو رکھ لیجے دو چار ملازموں کا اضافہ کر لیجیے۔ میں شادی کروں گا اور وہ یہاں رہے گی تو کیا میں پردیس میں بیٹھاساؤ زندگی اسے خط لکھتا رہوں گا۔ اوہ فوہلی! پہلے تو اسے راضی کرنا ہے۔ ابھی بنیاد پڑی نہیں اور ہم ہوالی نکل بنا رہے ہیں۔“

”وہ دینے کی طرف جاتے ہوئے ہوا۔“ ”میں غسل کرنے جا رہا ہوں۔ میرے لیے

وہ گھر میں داخل ہوا تو سب کے لیے جیسے عید ہو گئی۔ بچے چاروں طرف سے دوڑتے ہوئے آئے۔ کوئی کہہ کر رہا تھا۔ ”بھائی جان آگئے۔“ کسی نے حج کر اعلان کیا۔ ”ہاموں جان، ہاموں جان،“ کوئی اس کے قدموں سے پٹ کر ہولا۔ ”چچا جان آگئے۔“ ایک کمرے سے اس کی ماں بلائیں لیتی ہوئی نکلی۔ ”میں صدمے میں واری اسے میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں۔ اچانک اپنے آنے کی خوشیاں دو گے تو دل خوشی سے دھڑکنے بند ہو جائے گا۔“

”لازم اس کا سامان اٹھائے اوپری منزل کی طرف جا رہے تھے۔ اس کی بڑی بہن زینے سے اترتی ہوئی ہوئی۔ ”ابھی چھت پر کوا کا نس کا نس کر رہا تھا۔ میں سمجھ گئی۔ ضرور میرا بیٹا آئے دلا ہے۔“

”زینے کی بلندی سے اس کے بہنوئی نے کلمہ ”کامران! تمہاری آپا اپنے شوہر کی بولی نہیں سمجھی، کوئے کی سمجھ لیتی ہیں۔“

”اس کے والد نے ایک کمرے سے نکلتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔ ”ارے کای! تم اچانک کیسے آگئے۔ اپنے آنے کی اطلاع تو دی ہوئی۔ ہم اسیر پورٹ لینے آ جاتے۔“

”اوہ پیلانے میں آپ لوگوں کو سر براز دینا چاہتا تھا۔ مئی! سچ بتائیے میں اطلاع دے کر آتا تو اتنی زیادہ خوشی حاصل ہوتی؟“

”ارے بیٹا، تم جیسے بھی آتے مگر میرے لیے خوشیاں ہی لے کر آتے۔“

”باپ نے اس کے قریب آتے ہوئے کلمہ ”تم زندگی میں دوبارہ اچانک آتے ہو یا جب پیدا ہوئے تھے تو ہم سمجھتے تھے ہمارے ہاں بیٹی ہو گی مگر تم اچانک بیٹا بن کر آ گئے۔ سچ پوچھو تو اچانک آنے کی خوشی زیادہ ہوتی ہے۔ آج بھی ہو رہی ہے۔“

”بڑی بہن نے اپنی گود کے بچے کو دکھاتے ہوئے کلمہ ”دیکھو کای! کتنا پیارا بچہ! ہمارا بھانجا ہے تمہارا۔ اس کے لیے کیا لائے ہو؟“

”میں نے کلمہ ”چل ہٹ، ابھی میرا بیٹا آیا ہے اور بہن کا حق وصول کرنے کھڑی؟

گر اگر تم چائے بنا دیجئے۔“

”وہ آئے گی۔ اسی سے بنوا لیتا۔ میں صاف صاف کہہ دیتی ہوں۔ میری ہوس میرے پاس رہے گی۔“

وہ نے پتے سے پلٹ کر بولا۔ ”شادی خوشیوں کا نام ہے اور ماں اپنے بچوں سے کبھی کوئی خوشی نہیں جھینتی۔“

باپ نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ”معلوم تو ہو، تم کتنے دنوں کے لیے آئے ہو۔“
”پورے ایک ماہ کے لیے۔ آج چار تاریخ ہے۔ مجھے ہر حال میں اگلے ماہ کی چار تاریخ کو یہاں سے جانا ہو گا۔“

اس کے پایا نے ہنستے ہوئے اپنی بیگم سے کہہ۔ ”تم فکر نہ کرو۔ ہوس تمہارے پاس رہے گی۔ ہمارے برخوردار ایک مہینے میں بیوی کو لندن نہیں لے جائیں گے۔“

”پاپا! میں آپ کا بیٹا ہوں۔ جس بات کی ضد کرتا ہوں، وہ پوری کرتا ہوں۔ جب وہ میری شریک زندگی ہوگی تو پھر میری زندگی کی شریک رہے گی۔ میرے ساتھ یہاں سے جائے گی۔ میں ایسے قانون کو تسلیم نہیں کرتا جو انگریزیشن کے نام پر مجھوں کو تقسیم کرتا ہو۔“

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا اوپر چلا گیا۔ ماں نے کہہ۔ ”بیٹا کچھ زیادہ ہی دیوانہ لگتا ہے جانے کے دیکھ لیا ہے۔“

کامران اوپر کی منزل کے ایک کمرے کے سامنے رک گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، اندر خلی کرہ نظر آ رہا تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہہ۔ ”آہ! اگر وہ شریک حیات بن کر آ جاتی تو اس وقت میرے سامنے ہوتی اور سر پر آچل رکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بڑی او سے میرا استقبال کرتی۔ میں اسے ستانے کے لیے منہ پھیر لیتا۔“

وہ دروازے کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ اچانک چیچے سے آواز سنائی دی۔ ”آپ ناراض ہو گئے؟“

وہ ایک دم سے چونک گیا۔ پلٹ کر دیکھا تو کمرے کے اندر موٹا کھڑی ہوئی تھی۔ سر پر آچل درست کرتے ہوئے شرابی تھی۔ جھکی جھکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

کامران نے حیرانی سے اور بے یقینی سے دیکھا پھر پوچھا۔ ”تم؟ کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟“

وہ شراب گل کی طرح ہولے سے بل کھا گئی۔ اس کی طرف سے گھوم کر دودر سنگھار بھری طرف جانے لگی۔ کامران نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو بند کیا جیسے خواب اور حقیقت کو معلوم کرنا چاہتا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ نہیں تھی۔ کمرہ بھلی کی طرح خالی تھا۔

وہ تیزی سے چلا ہوا کمرے کے اندر آیا۔ ہر طرف دیرانی تھی۔ ایک ظلم خیال لمحہ محبت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس لیے وہ سر میں سما گئی تھی۔ کمرے میں نہیں تھی۔ اس کے سر میں تھی۔

لازم سلمان لا کر اس کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ اس نے باپوسی سے اپنے سامان کو بٹھا۔ پھر ایک سوٹ کیس اٹھا کر اسے بستر پر رکھتے ہوئے کھولنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی ۱۶ لگے۔ ”کیا تمہاری سی تمنا ہے۔ آج احساس ہو رہا ہے۔ اتنے دنوں بیوی کے بغیر گزارا کرتا رہا۔ سارے کام خود ہی کرتا رہا۔ اب قفل کرنے کے لیے تالیہ نکالو۔ صابن اٹا لیا۔ پھر قفل کرو۔ اگر بیوی ہوتی تو.....“

”کیا میں نہیں ہوں؟“ اچانک ہی دس بھری آواز سنائی دی۔

اس نے تیزی سے پلٹ کر قفل خانے کی طرف دیکھا۔ ہاتھ روم کا دروازہ ذرا کھلا تھا اور دروازے کے پیچھے سے سر نکال کر شرباتے ہوئے ذرا مسکراتے ہوئے رہی تھی۔ ”میں نے قفل کا تمام سامان رکھ دیا ہے۔ آئیے نا۔“

یہ سن کر ہی وہ دروازے کے پیچھے چھپ گئی۔ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ تڑپا ہوا۔ ”میں آ رہا ہوں۔ سر کے بل آ رہا ہوں۔“

وہ دوڑتے ہوئے ہاتھ روم میں پہنچا۔ تیزی سے دروازہ کھولتے ہوئے اندر گیا۔ اٹے پٹے فرش پر پھسلنے پھسلنے منہ بٹھل گیا۔ پھر اس نے دروازے کے پیچھے دیکھا۔ وہ تھی۔ ہاتھ روم خالی تھا۔

اپنے کے پاس سے اس کی بڑی آپا نے بلند آواز میں کہہ۔ ”کامی! میں نے غسل

خانے میں صابن، شیمپو اور تولیہ رکھ دیا ہے اور کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟“
اس نے نامراد لہجے میں کہا۔ ”جس کی ضرورت ہے نہیں ہے۔“

یہ کہتے ہی اس نے دروازے کو ایک دھڑاک سے بند کر دیا۔ جھنجھلا کر جلدی جلدی کپڑے اتارنے لگا۔ ساتھ ہی بیڑوانے لگا۔ ”کسی شاعر نے بچ کہا ہے۔ کہتے ہیں جن کو عشق غلغل ہے داغ کا۔ یعنی داغ کا کوئی پرزہ دھسلا ہو۔ پرانے گھر کی لڑکی اپنے گھر کو نظر آتی ہو تو سمجھ لو دو میں سے کوئی ایک بات ہوگی۔ یا تو لڑکی اپنے گھر آئے گی یا لڑکا پاؤں خانے جانے لگے۔“

وہ بیڑوانا جا رہا تھا۔ اپنے سر کو چرے کو اور بدن کو ملتا ہوا صابن کا جھاگ بنا رہا تھا۔ سر اور چرے پر جھاگ زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ہوئے دونوں ہاتھ پاؤں کی طرف لے جا کر اپنی پیٹھ مرگڑتا چاہتا تھا لیکن ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا۔ ”کیا مصیبت اپنی پیٹھ کیسے صاف کروں۔ کیا جانوروں کی طرح دیوار سے مرگڑنا شروع کر دوں۔ اسی کہتے ہیں ایک بیوی کی ضرورت ہے۔ وہ ہوتی تو کم از کم میری پیٹھ پر.....“

وہ بولے بولے ایک دم سے رک گیا۔ چونک کر سر اٹھایا۔ آنکھیں کھول نہیں سکتا تھا۔ چہرہ جھاگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے آنکھوں پر سے جھاگ کو ہٹاتے ہوئے پوچھا ”کہوں ہے؟“

مترنم ہنسی سنائی دی۔ اسے اپنی پیٹھ پر ملائم ہاتھوں کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ تازک سے ہاتھ اس کی پیٹھ پر صابن لگا رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ چوڑیاں ٹھٹھک رہی تھیں۔

اس نے حیرانی سے خوش ہو کر پوچھا۔ ”مونا تم، یعنی کہ تم۔ میں ابھی تمہیں ہوں۔ میری آنکھوں میں صابن ہے۔ ذرا ایک منٹ۔“

اس نے شاور کھول دیا۔ جلدی جلدی منہ سے صابن چھڑانے لگا۔ کہنے لگا ”جہیں ان قدموں کی قسم ہے، جن قدموں سے چل کر یہاں آئی ہو۔ واپس نہ جا ابھی ایک منٹ صرف ایک منٹ۔“

اس کی بیڑواہٹ کے دوران مترنم ہنسی جاری تھی۔ کبھی وہ ہنستی تھی کبھی م

لی۔ اس نے چرے کو اچھی طرح مرگڑ کر صابن کے جھاگ کو صاف کیا۔ پھر پلٹ کر کھنگھلا۔ وہ مترنم ہنسی کم ہو گئی تھی۔ گزرتے ہوئے وقت نے اس کے سامنے سے اس کے لہجوں کو چھال لیا تھا۔ وہ ہاتھ مٹا گئے، جن کا لمس محسوس ہو رہا تھا؟

دھنک، دھنک میری پوروں کے خواب کر دے گا

وہ لمس میرے بدن کو گلاب کر دے گا

قبائے جسم کے ہر تار سے مرگڑتا ہوا

کرن کا پیار مجھے آفتاب کر دے گا

جنوں پسند ہے دل اور تجھ تک آنے میں

بدن کو تار، لبو کو چناب کر دے گا

اس نے بے ہنسی سے ایک گہری سانس لی پھر شاور کو کھول دیا۔ تیز پانی کی دھار اس پر برسنے لگی۔ ”آہ، صابن نہ سہی، شاور ہی سہی۔“

☆-----☆-----☆

وہ ہاتھوں میں ایک بڑا سا پیکٹ اٹھائے مختلف مکانوں کو گشتا جا رہا تھا۔ خلیل احمد لے تا ہوا تھا کہ دوسری گلی میں دسواں مکان ہے۔ وہ مکان خبروں کے سامنے بیچ گیا۔ اس کا لبیاں تھا کہ خلیل احمد تھے اور خط کے انتظار میں دروازے پر کھڑا ہو گا۔ اسے دیکھتے ہی فرش آدھے کے گاہ موٹا کھین کھڑکی سے جھانک رہی ہوگی۔ اس کی آنکھوں میں انتظار کی محسوس اور شکایت ہوگی اور وہ خاموش نگاہوں سے سوال کرے گی۔ ”کیا آنے والے یوں انتظار کراتے ہیں۔ جاؤ، میں نہیں بولتی؟“

لیکن مکان نمبر دس کے سامنے سناٹا تھا۔ آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کھرکیاں بھی بند تھیں اور دروازے بھی۔ وہ ذرا باپس ہو گیا۔ پھر بڑی آگے بڑھ کر دروازے تک پہنچ گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ پھر بیڑوانے لگا۔ ”لندن میں ہر گھر کے دروازے پر کل تل کا لٹن ہوتا ہے۔ یہاں تو نظر نہیں آ رہا ہے۔“

اس نے دروازے پر دستک دی پھر انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ دستک دی۔ تیسری بار دستک دینا چاہتا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ غلیل احمد نظر آئے۔ اسے دیکھتے ہی بولے۔ ”آہ صاحبزادے تم آئی گئے۔“

”جی ہاں، اندر آ جاؤں؟“

اس نے اجازت حاصل کرتے ہوئے ذرا اندر کی طرف جھانک کر دیکھا۔ شاید مونا نظر آ جائے لیکن غلیل احمد باہر آ گئے اس کے ہاتھوں سے پکٹ لپٹے ہوئے بولے۔ ”اچھا تو مروت خان نے یہی تحفہ بھیجا ہے؟“

”جی ہاں، یہ آپ تینوں کے لیے ہے۔“

”کون تینوں؟“

”جی ایک تو آپ کے لیے دوسرا آپ کی بیگم صاحبہ کے لیے اور تیسرا مس موہ کے لیے۔“

غلیل احمد نے چونک کر پوچھا۔ ”تیس میری سالی کا نام کیسے معلوم ہوا؟“

”میں نے، وہاں دکان میں کسی کو نام لیتے ہوئے سنا تھا۔“

”اچھا، وہ مروت خان کا خط کہاں ہے؟“

”خط؟ وہ..... وہ تو کہیں گم ہو گیا۔“

”واہ کیسے گم ہو گیا؟ اب ہمیں کیسے معلوم ہو کہ مروت خان نے کیا بھیجا اور تم نے کیا پوچھا؟“

”اندر چلے، میں بتا دیتا ہوں۔“

وہ بار بار اندر کی طرف جھانک کر دیکھ رہا تھا لیکن وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ غلیل احمد نے کلمہ ”تم ادھر کیا دیکھ رہے ہو۔“ ادھر دیکھو اور جواب دو۔“

”جی اس پکٹ میں آپ کے لیے ایک سوٹ ہیں۔ آپ کی بیگم صاحبہ کے لیے ساری ہے اور مس مونا کے لیے پرنیوم۔“

”اور؟ آگے بولو اور کیا ہے؟“

”جی، اور تو کچھ نہیں ہے۔“

”ہوں، تم غلیل احمد کو الوداع دیتے ہو۔“

”کیا مطلب۔ میں نہیں سمجھا؟“

”میں سمجھتا ہوں۔ تم فراڈ ہو۔ امانت میں خیانت کرنے والے ہو۔ اس نے

ہمارے لیے ایک اسٹیریو کیسٹ ریکارڈر بھیجا ہے۔“

”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں، اتنی بڑی چیز میں کیسے لاسکا ہوں وہاں سے۔“

”دنیا جہاں کے لوگ لاتے ہیں۔ تم کیسے نہیں لاسکتے؟“

”جناب! مجھے ذاتی طور پر تحفہ دینا ہوتا تو میں یقیناً لے آتا لیکن مروت خان نے

ایسی کوئی چیز نہیں بھیجی ہے۔“

”بھئی ہے۔ ہمارے پاس نیلی گرام آیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ وہ ہمارے

ہاتھوں میں تھا، نام بھول رہا ہوں کیا نام بتایا تھا تم نے؟“

”مجھے کامران کہتے ہیں۔ پیار سے کافی کھاتا ہوں۔ آپ بھی مجھے پیار سے کا.....“

”میں مروت خان کا وہ ٹیلیگرام بڑے پیار سے ہمارے ماں باپ کے سامنے پیش

کروں گا اور کہوں گا، یہ لڑکا امانت میں خیانت کرتا ہے۔ اس ٹیلیگرام میں صاف طور پر لکھا

ہے، مسٹر کامران کے ہاتھوں ایک اسٹیریو کیسٹ ریکارڈر روانہ کیا جا رہا ہے۔ وصول

فرمائیں۔“

”آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ مجھ پر خواہ مخواہ الزام لگا رہے ہیں۔ کیا آپ مجھے وہ

ٹیلیگرام دکھاتے ہیں؟“

”ابھی دکھا سکا ہوں۔ بیگم! ذرا وہ ٹیلیگرام لے کر آنا۔“

مونا کی آنٹا ایک کمرے سے نکلیں پھر دروازے کی طرف آتے ہوئے بولیں۔ ”وہ

اب کہاں ہے۔ وہ تو گم ہو چکا ہے۔“

کامران نے کلمہ ”آپ لوگوں نے پہلے تو مجھے نہیں بتایا تھا کہ مروت خان کا

ٹیلیگرام بھی آیا ہے اور اس میں کسی اسٹیریو کیسٹ ریکارڈر کا بھی ذکر ہے۔“

”پہلے ٹیلیگرام نہیں آیا تھا۔ تم سے ملاقات کرنے کے بعد ہم گھر پہنچے تو وہ موصول

ہوا۔“

مونا کی آپائنے کہل۔ ”اوسر ہم نے ٹیلیگرام پڑھا اور وہ گم ہو گیا۔“
 کامران نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ٹیلیگرام آیا۔ آپ لوگوں نے پڑھا اور وہ گم بھی ہو گیا۔“
 ”کیوں نہیں ہو سکتا مروت خان نے ہمارے نام خط بھیجا تھا؟“
 ”جی ہاں بھیجا تھا۔“
 ”لیکن وہ گم ہو گیا؟“
 ”جی ہاں گم ہو گیا۔“

مروت خان

”جب تمہارے ہاتھوں سے خط گم ہو سکتا ہے تو ہمارے ہاتھوں سے ٹیلیگرام کیوں نہیں گم ہو سکتا؟ افسوس ہم نے سوچا تھا، تم کسی عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتے ہو۔ جب وہ خط اور تحفے لے کر آؤ گے تو ہم تجس گھر کے اندر لے جائیں گے۔ عزت سے بٹھائیں گے۔ مونا نے تمہارے لیے گرامر کم پکڑے تیار کیے تھے مگر افسوس۔“
 اس نے خوشامداند انداز میں خلیل احمد کے دونوں ہاتھوں کو تھام کر کہل۔ ”آپ افسوس نہ کریں۔ میں لندن سے بہت سامان لے کر آیا ہوں۔ ہو سکتا ہے مجھ سے بھول چوک ہو گئی ہو۔ میں اپنے سلمان میں تلاش کروں گل۔ مروت خان نے اسٹیریو کیسٹ ریکارڈر ضرور بھیجا ہو گل میں وعدہ کرتا ہوں، کل صبح تک آپ کا وہ ریکارڈر لے آؤں گا! آئیے ہم اندر چل کر اطمینان سے باتیں کریں۔“
 خلیل احمد نے ہاتھ بڑھا کر اس کا راستہ روکتے ہوئے کہل۔ ”ہرگز نہیں، تم نے ہمارے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ کل ہمارا ریکارڈر لے آؤ۔ تمہیں اندر آنے کی اجازت مل جائے گی۔ خدا حافظ۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے کے اندر گیا۔ پھر اس نے ایک جھکے سے اسے بند کر دیا۔ کامران نے بند دروازے کو بے بسی سے دیکھا۔ پھر پلٹ کر بیڑا لے لگا۔ ”یہ کیا بات ہوئی؟ مروت خان کو مجھ پر الزام لگانے کی کیا ضرورت تھی؟ آخر وہ مجھے کیسے جانتا ہے؟“
 یوں بیڑا دھرتے ہوئے اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اہانت میں سر ہلا کر کہل۔ ”فیک اسی طرح جانتا ہو گا جس طرح میں اسے جانتا ہوں۔“

اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔ پھر بے بسی سے کہل۔ میں کیسے الزام دوں کہ سسر خلیل احمد جھوٹ بول رہے ہیں؟ اب کچھ میں آ رہا ہے کہ دو فرسٹ کلاس بمشے ایک دوسرے کو جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔“
 وہ پاپس ہو کر وہاں سے چلا آیا۔ اس کی والدہ نے پوچھا۔ ”تمام دن کہاں رہے؟ اتنے دنوں بعد آئے ہو۔ کچھ وقت ہمارے ساتھ بھی گزارو۔“
 ”آپ کے ساتھ اتنی زندگی گزار چکا ہوں۔ جس کے ساتھ گزارنا ہے، اس کی عمر میں ہوں۔“

”آخر وہ ہے کون؟ کچھ بتایا کیوں نہیں؟“
 ”اگر میں بتا دوں اور وہ میری زندگی میں آنا پسند نہ کرے تو آپ کو بتانا بے سود ہو گا۔“
 ”وہ میرے بیٹے کو پسند نہیں کرے گی؟ تم ان کے گھر کا پتا بتاؤ۔ ہم کسی سے کم نہیں ہیں، وہ ہمیں سات سلام کر کے لڑی دیں گے۔“
 ”مجھے لڑی والوں سے نہیں مانگنا ہے۔ لڑی کے خود اسے مانگنا ہے۔“
 ”یہ کیا بات ہوئی؟“

”سیدھی سی بات ہے۔ میں یہاں سے لندن جاتا ہوں تو لندن والوں کی اجازت سے جاتا ہوں کیونکہ وہ ان کا ملک ہے ان کی زمین ہے۔ آپ کے گھر میں کوئی آتا ہے تو آپ کی اجازت سے آتا ہے۔ اس لیے کہ آپ اس گھر کی مالک ہیں۔ اسی طرح میں اس لڑی کی زندگی میں جاؤں گا تو لڑی کی مرضی سے جاؤں گل۔ اس کے بل باپ کی مرضی سے نہیں۔“

وہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگا۔ اس کے پیائے کہل۔ ”برخوردار! اجازت کی بات کر رہے ہو مگر یہ بھول رہے ہو کہ تم خود لندن کے قاعدہ شری نہیں ہو۔“
 وہ جاتے جاتے رک گیا۔ پلٹ کر بولا۔ ”انسان کا مطالبہ سیدھا اور سچا ہو تو اس لے سامنے رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ مجھے روزگار کی تلاش تھی اور میرے لیے لندن میں روزگار موجود تھا۔ مجھے اجازت ملنی چاہیے تھی۔ میں روزی کمانے کا حق رکھتا ہوں۔“

چونکہ باقاعدہ اجازت نہیں ملی اس لیے میں نے بے قاعدگی سے وہاں رہائش اختیار کر لی۔ اسی طرح میں کسی کی زندگی میں داخل ہونا چاہتا ہوں۔ کسی کو اپنانا چاہتا ہوں تو یہ سیدھا اور سچا مطالبہ ہے۔ اس کے لیے باقاعدہ اجازت ملنی چاہیے ورنہ.....“

وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کی می می نے پوچھا۔ ”ورنہ کیا؟“

”ابھی تو کوشش جاری ہے ورنہ کاسوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دیکھا جائے گا۔“

وہ اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ دن گزر گیا۔ شام بھی گزر گئی۔ رات بھی گزرنے لگی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ”ایک دن یونی ضائع ہوا ہے۔ اب تیس دن میں انیس دن رہ جائیں گے۔ اگر مروت خان کے ٹیلیگرام کے مطابق ایک اسٹیرو کیسٹ ریکارڈر لے جاؤں گا تو کم بخت فلیل احمد کے گپ ٹیلیگرام میں چھوڑا ریکارڈر نہیں بڑا ریکارڈر لکھا تھا اور اگر بڑا ریکارڈر لے جاؤں گا تو کسے گا اس کپنی کا نہیں اس کپنی کا لکھا ہوا تھا۔ مجھ سے نہیں آتا“ یہ چکر بنگ چلے گا دیے جب تک چن رہے گا۔ مونا کا دیر اور تو ہوتا رہے۔ اتنی دور گیا۔ اتنے پاؤں نیلے لیکن اس کی من موہنی صورت نظر نہیں آئی۔“

اس رات نہ تو وہ کام کی باتیں سوچ سکا اور نہ ہی اطمینان سے سو سکا۔ زندگی میں پہلی بار پتا چلا کہ آدمی ان حالات میں سوچتے سوچتے سوتا ہے اور سوتے سوتے سوچتا چلا جاتا ہے اور اس طرح صبح ہو جاتی ہے۔

دوسری صبح وہ پھر مونا کے ہاں جانا چاہتا تھا لیکن مجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسٹ ریکارڈر لے جانا چاہیے یا نہیں اتنے میں اس کی آپا نے کلمہ ”صاحب ہمارا پھر سنو نور کر نکال رہے ہیں۔ صبح جائیں گے تو شام کو آئیں جیسے ہم سے کوئی رشتہ ہی نہیں ہے۔“

”یہ بات نہیں دراصل میں ایک رومانٹک چویشن میں الجھا ہوا ہوں۔ اگر میں اس سے لکھتا چاہوں تو نکل نہیں سکتا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اور اگر الجھتا چاہوں تو ساری زندگی الجھتا ہی چلا جاؤں گا۔“

”چویشن کیا ہے۔ مجھے بتاؤ؟“

”بات یوں ہے کہ میں نے ایک لڑکی دیکھی۔ لڑکی کیا ہے طلسم ہو شریا ہے یعنی ہوش اڑا دینے والا جادو ہے میں اس کا نام اور پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ پتہ چلا یہ لندن نہیں

انستان ہے۔ یہاں کسی لڑکی سے اس کا نام اور پتا پوچھا نہیں جاسکتا اس لیے میں نے اس نے ہونی کو شپ کیا۔ وہ ڈیگیں مار رہا تھا کہ اس کے دوست کا بھائی لندن میں رہتا ہے۔ اس کا نام مروت خان ہے بس میں نے کہہ دیا کہ مروت خان میرا دوست ہے۔ میں ان کی طرف سے کچھ تجھے ان کے لیے لایا ہوں۔ یوں مجھے ان کا پتا معلوم ہو گیا۔“

آپا نے بکڑ کر کلمہ ”اب سمجھی۔ وہ سوٹ پیس‘ ساری اور پرفیوم لڑکی والوں کے ہاں لے گئے تھے۔ مفت کا مال تھا۔ انہوں نے قبول کر لیا ہو گا۔ یہاں بڑے بڑے نو سرباز رہتے ہیں۔ لڑکی کی جھلک دکھاتے ہیں اور تمام عمر لڑکوں کو بے وقوف بنا کر ان سے دل بہتاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے اس تجھے کے بعد کچھ اور بھی مطلب کیا ہو گا۔“

”ہی ہاں‘ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟“

”دلیات گھوم آنے سے عقل نہیں آتی۔ خردوار‘ اگر ایک پیسے کا بھی تحفہ لے جا لیا۔ مجھے ان کا پتا بتاؤ۔ میں وہ تجھے وصول کر کے لاتی ہوں۔“

”آپا! میں جھگڑا کرنے کے لیے نہیں۔ ان سے دوستی کرنے کے لیے آپ سے مدد و مانگ رہا ہوں۔“

اسی وقت مکان کے کچھ حصے سے اس کی می کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھیں۔ ”میں جھگڑا نہیں کروں گی تو کیا تم جیسوں کو اپنے سر پر بٹھاؤں گی۔“

ملعب خدا کا جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکا دلیات سے آیا ہے۔ چار پیسے کا لایا ہے تو لابی والے جال بچھانے چلے آتے ہیں۔“

کامران نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ می میرے لیے کس سے لڑائی کر رہی ہیں؟“

وہ تیزی سے چلا ہوا کمرے سے نکلا۔ نیچے ڈرائنگ روم میں فلیل احمد صوفے کے اس لمبے ہوئے تھے۔ سامنے سینئر نیبل پر وہ بڑا سا پیکٹ رکھا ہوا تھا جو کامران تجھے کے طور پر ان کے گھر لے گیا تھا۔ سینئر نیبل کے دوسری طرف کامران کی می اور پلا کھڑے ہوئے تھے۔ فلیل احمد نے کلمہ ”آپ لوگ میری بات کو غلط رنگ دے رہے ہیں۔ کیا اس لیے کہ تم غریب ہیں؟“

کامران کے پلپا نے کلمہ ”غریب ہی ایسی چالیں چلتے ہیں۔ میرے بیٹے کو پھانسنے کے

لے کوئی اور طریقہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا تھا؟
”مگر مجھے چھانسا ہوتا تو یہ تحائف واپس نہ کرت۔“

”میں تو سب سے بڑی خوبی ہے کہ جال بھی بچھالیا اور جال نظر بھی نہ آیا۔ پہلے اتنا ساتھ نمونے کے طور پر منگوا کر بھانپ لیا کہ لڑکالین دین میں کیسا ہے جب پتا چلا کہ فراخ دل ہے اور دوسرے دن وہ تیس کیسٹ ریکارڈر بھی لا کر دے گا تو اپنی شرافت کا ثبوت دینے چلے آئے۔ سوچا کیسٹ ریکارڈر لے کر کیا کرنا ہے۔ لڑکی اگر گھر میں آ جائے گی تو سارا گھر تسمارا ہو گا۔“

کامران اوپری منزل سے دوڑتا ہوا، ”پلیا آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں دیکھئے، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ غلیل صاحب ایسے نہیں ہیں۔ میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔“

اس کی می نے کلمہ ”ہمارے سامنے کا چھو کر ہمیں سمجھائے گا۔ اگر یہ حضرت اتنے سچے ہیں تو جھوٹ کیوں کہہ دیا کہ مروت خان نام کا کوئی شخص وہاں رہتا ہے؟“
غللیل احمد نے کلمہ ”میں نے آپ کے صاحبزادے کے جھوٹ کو پکڑنے کے لیے کہا تھا اور صاحبزادے نے کہہ دیا ہاں، کوئی مروت خان ہے۔ ان کا دوست ہے۔ ان کے ساتھ رہتا ہے۔ اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو گا؟“

کامران کے پللیا نے کلمہ ”جب آپ نے اس کا جھوٹ وہیں پکڑ لیا تھا تو وہیں انکشاف کر دیتے۔ آپ تجھے کا انتظار کیوں کرتے رہے؟“

”اس لیے کہ جو لڑکا میرے منہ پر مجھے یہ توقع بنا رہا تھا وہ پیچھے پیچھے میری لڑکی کو بدنام کر سکتا ہے۔ میں ثبوت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ لڑکا خندے لے آئے گا تو اس تجھے کو تسمارے منہ پر مار دوں گا۔ میں نے اپنی شرافت کا ثبوت دے دیا لیکن شرافت ان کی سمجھ میں آتی ہے جو شریف ہوتے ہیں۔“

وہ پاؤں میچے ہوئے چلے گئے۔ کامران نے ان کے پیچھے چلے ہوئے کلمہ ”قبلہ ذرا رک جائیے۔ دیکھئے میں می اور پللیا کو سمجھاتا ہوں۔ آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ پلیز رک جائیے۔“

غللیل احمد نے دروازے کے پاس پہنچ کر کلمہ ”بس میاں صاحبزادے! میں نے میاں آکر تم لوگوں کی شرافت دیکھ لی۔ اگر واقعی شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہو تو آج سے میری گلی کا راستہ بھول جائو۔ کوئی مجبوری اور ہلے جائے تو تسماری خاندانی شرافت کا واسطہ دے کر کھتا ہوں، نظرس جھکا کر گزرتا۔ ورنہ انھیں نکال لوں گا۔“
یہ کہتے ہی وہ تیزی سے پلٹ کر غصے سے فٹفٹاتا ہوا پللیا کا کمران نے بے بسی سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا پھر پریشان ہو کر کلمہ ”اوہ پللیا! یہ کیا ہو رہا ہے یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔“

”اتنے اچھے کہ یہ بھید نہ کھلتا تو ابھی تم باجی ہزار کا کیسٹ ریکارڈر ان کے ہاں لے جاتے۔ آخر تم نے ان کی لڑکی میں کیا خوبی دیکھی ہے؟“
اس کی می نے کلمہ ”خوبی صرف ایک لڑکی میں نہیں ہوتی۔ ہزاروں خوبیوں والی ہزاروں لڑکیاں اس دنیا میں ہیں۔“

کامران نے ان کی طرف بڑھے ہوئے کلمہ ”اور ہزاروں میں سے دل کسی ایک کو پسند کرتا ہے اور میں نے اسے پسند کر لیا ہے۔“

اس کی آپا نے کلمہ ”پسند آنے کا مطلب ہے تو نہیں ہے کہ پورا گھر اس پر لٹا دو۔ شادی سے پہلے یہ حال ہے تو شادی کے بعد کیا ہو گا؟“

”آپا! شادی کی بات تو پیچھے رہ گئی۔ ابھی تو مسئلہ یہ ہے کہ لڑکی والے شریف اور ایماندار ہیں یا نہیں۔ اس مسئلے میں می اور پللیا کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اسے دور کرنا چاہتا ہوں۔“

ہم تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔ چالوں کے ایک دانے سے پوری ہانڈی کا پتا چل جاتا ہے۔ ہم نے اس ایک بے ایمان سے مل کر اس کے پورے خاندان کو سمجھ لیا ہے۔ تم ان کی دکان نہ کرو۔“

اس نے کچھ کہنے کیلئے منہ کھولا۔ پھر خود ہی منہ کو بند کر لیا۔ ایک طرف اس کے پللیا تھے۔ دوسری طرف می تھیں۔ تیسری طرف آپا اور تین ہی اس کی باتوں کو سمجھنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ غصے سے پلٹ کر تیزی سے چلا ہوا باہر آگیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں

آ رہا تھا کیا کرے؟ کہاں جائے؟ قدم اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ وہ ایک گلی سے نکل کر دوسری گلی میں جا رہا تھا۔ دوسری سے نکل ایک شاہراہ کو پار کر رہا تھا۔ پھر وہ ایک گلی کے پاس پہنچ کر ٹھک گیا۔ دور بہت دور وہ مکان خبر دس نظر آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی خلیل احمد کی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ ”اگر تم میں خاندانی شرافت ہے تو ہماری گلی سے نہ گزرتا۔“

وہ بڑی حسرت سے اس مکان کو دیکھ رہا تھا۔ جیسے وہاں کھڑی ہوئی مونا نظر آ رہی ہو اس نے بڑے دکھ سے سوچا۔

کیا وہ مجھے دور دور سے ہی نظر آنے کے لیے میری زندگی میں آئی ہے؟

کیا وہ ایسا بھول ہے جو ہاتھ نہیں آتا۔ محض دور سے خوشبو کا پیغام پہنچاتا ہے؟

کیا وہ آسمان کا تارا ہے جس میں توڑ کر نہیں لاسکتا؟

نہیں وہ بھی زمین پر ہے، میں بھی زمین پر ہوں۔ دنیا والوں نے محبت کرنے والوں کو زمین اور آسمان بنا دیا ہے۔ اگر ایسا کیا ہے تو میں انسانی کو ہونی کروں گا۔ زمین اور آسمان کو ملا دوں گا۔

دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن اس نے بنوئی کی موٹر سائیکل لی۔ پھر دسویں گلی کی ٹکڑ پر کھڑا ہو گیا۔ صبح سات بجے سے ساڑھے نو بجے تک دل کو تکیاں دیتا رہا۔ وہ آئے گی، نہ کھرے، اکثر نکلتی ہوگی۔ آج بھی نکلتی گی۔

اس کا اندازہ درست نکلا۔ پونے دس بجے وہ گھر سے نکلی ہوئی دکھائی دی۔ پہلے تو شبہ ہوا کہیں جاتی آگے کا پتہ نہ ہو۔ اس نے آنکھیں مل مل کر دیکھیں۔ پھر یقین نہ آیا۔ اس نے تھیلی کی پشت کو منہ کے قریب لا کر اسے دانتوں سے ذرا کاٹ لیا، پھر تھملا کر تھیلی کو جھٹکنے لگا۔ یقین آ گیا کہ وہ بچ چلی آ رہی ہے۔

وہ آئی۔ گلی کی ٹکڑ پر پہنچی۔ نگاہوں کا تصادم ہوا پھر وہ ٹھک گئی۔ دوسرے ہی لمحے ایک دم سے غصے اور نفرت سے دیکھتے ہوئے منہ پھیر کر جانے لگی۔ اس نے مخاطب کیا۔ ”سنو، پلیز میری ایک بات نہ لو۔“

وہ سنی ان سنی کر کے سڑک کو پار کرتے ہوئے بس اسٹینڈ کی طرف جا رہی تھی۔

اس نے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے اسٹارت کیا۔ ذرا انجن گھر گھرایا۔ پھر بند ہو گیا۔ پھر اسٹارت لیا۔ انجن دوبارہ شور مچا کر خاموش ہو گیا۔ اس نے اتر کر موٹر سائیکل کو ایک لات مار دی۔ پھر دوڑتا ہوا سڑک کو پار کرتا ہوا بس اسٹاپ کی طرف جانے لگا۔ مونا وہاں کھڑی تھی۔ اس کے آس پاس دوسری عورتیں اور مرد بھی تھے، سبھی بس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے قریب آ کر رک گیا۔ وہ سہم کر ایک عورت کے پیچھے چلی؟

اس نے دوڑ کے آئے اور رکنے کا انداز ایسا تھا کہ تمام لوگ متوجہ ہو گئے۔ پھر مونا کے سامنے لے انداز نے لوگوں کو کچھ اور متوجہ کیا۔ وہ سب کامران کو گھورنے لگے۔

مونا کے سامنے ڈھال بننے والی عورت نے ناگوار سی سے پوچھا۔ ”اے کیا گھسے چلے آ رہے ہو۔ اور حرجاؤ۔“

”جی میں..... میں اس سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔“

مونا نے اس عورت کے پیچھے اور پیچھے ہوئے کہا۔ ”میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔“

اس عورت نے کامران سے پوچھا۔ ”سن کیا تم نے؟“

”جی ہاں، لیکن مں مونا کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں ان کے بنوئی سے اپنے والدین کے روپے کی مدد مانگنا چاہتا ہوں لیکن مانگ نہیں سکتا۔ انہوں نے مجھے گلی میں آنے سے منع کیا ہے۔“

ایک شخص نے قریب آ کر اس کے گریبان کو پکڑتے ہوئے کہا۔ ”گلی میں آنے سے منع کیا ہے اس لیے لڑکی کو یہاں پھیر رہے ہو؟“

دوسرے شخص نے دوسری طرف سے اس کے کارو پکڑ لیا۔ پھر تیسرے نے پوچھا۔ ”عزت سے جاؤ گے یا گلوں پر بٹھا کر جلوس نکلا جائے؟“

اس دوران بس آگئی۔ مونا دوسری عورتوں کے ساتھ اس میں سوار ہو گئی۔ اسے لانے والوں نے اسے ایک طرف دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ”صورت سے بھلے ہاتھ لگتے ہو اس لیے پھوڑ کر جا رہے ہیں۔ بس میں آؤ گے اس کا پیچھا کرو گے تو اٹھا کر باہر پیسٹک اٹھا کے۔“

بس آگے بڑھ گئی۔ اس نے بھی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ اسے تیز رفتاری سے آگے بڑھاتا ہوا پہلے بس کے پیچھے چلنے لگا پھر بس کے برابر ہو گیا۔ چھوڑنا درجہ تھا اس دروازے کی طرف پہنچ گیا۔ وہ نظر آ رہی تھی اور چار عورتوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ نہیں تھی اس لیے دروازے کے قریب ہی تھی۔ موٹر سائیکل کی آواز سنتی ہی اس نے چونک کر دیکھا۔ پھر کامران کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ یوں گھبرانے لگی۔

”خواہ مخواہ ہونے والی بدنامی کا ڈر ہو۔“

وہ بس دوسرے اسٹاپ پر رک گئی۔ وہ بھی رک گیا۔ کچھ مسافر اترے۔ کچھ مسافر ہار ہوئے۔ بس پھر آگے بڑھ گئی۔ اس نے بھی موٹر سائیکل کی رفتار اس کے برابر کی اور زنانہ درجے کے دروازے کی طرف پہنچ گیا۔ موٹا اسے دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہی تھی۔ اس کی طرف سے منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگی تھی۔ کنڈیکٹر نے دروازے لے پاس آ کر پوچھا۔ ”اے بھائی! کیوں بس کے ساتھ رہیں لگا رہے ہو؟ کیا مرنے کا ارادہ ہے؟“

اس نے موٹر سائیکل کی رفتار کو برقرار رکھتے ہوئے موناک کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے کہہ دیا۔ ”میں جیسا چاہتا ہوں تمہارے ساتھ۔ میں جیسا چاہتا ہوں تمہارے ساتھ۔“

کنڈیکٹر نے چونک کر کہہ دیا۔ ”ارے کیوں مٹھری کرتا ہے۔ ہمارے اندر کیا خوبی ہے کہ ہمارے ساتھ جیسا چاہتے ہو ہمارے ساتھ مرنے چاہتے ہو۔ بھائی! دوسرے جاؤ۔ منی بس کے ساتھ رہیں لگاؤ وہ تمہیں مزہ چکھائے گا۔“

”میں جس کے ساتھ ارادہ کر لیتا ہوں“ اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا ہوں۔ وہ بھانگنا چاہے، دوڑنا چاہے تو میں اس کے ساتھ دوڑنا جانتا ہوں۔“

موناک سن رہی تھی اور اس سے نظریں ملانے سے کھڑا رہی تھی۔ وہ بس پھر ایک اسٹاپ پر رک گئی۔ اس بار کامران نہیں رکا۔ موٹر سائیکل کو تیزی سے دوڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ موناک نے اسے دور جاتے ہوئے دیکھا تو اطمینان کی سانس لی۔ وہ بس پھر آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اسے کنڈیکٹر کی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ارے بھائی! تم پھر آگے؟“

وہ بھی بس میں سوار ہو کر جانے لگے۔ اس نے فریادی نظروں سے زنانہ درجے کی طرف دیکھا۔ موٹا عورتوں کی بیٹیوں میں نظر آ رہی تھی لیکن اس سے نظریں چار رہا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی بس وہاں سے چل پڑی۔ وہ دھیرے دھیرے سے دوڑنے لگا جبکہ بس کی رفتار تیز ہو گئی اور وہ اس سے آگے نکل گئی تو اس نے دوڑتے ہوئے سڑک کو پاؤں کیلہ اپنی موٹر سائیکل کے پاس پہنچ کر اسے اسٹارٹ کرنے لگا۔ ایک بار، تین بار وہ پینڈل پر جھٹکے مارتا رہا۔ اس کا انجین جاکتا تھا۔ پھر سو جاتا تھا۔ وہ بار بار اسٹارٹ کرنے کے دوران دور جاتی ہوئی بس کو دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ بس کا روٹ کیا ہے۔ کس راستے پر جاتی ہے اور وہ روٹھ کر جانے والی کہاں گئی ہے؟

اس نے غصے میں آنر گاڑی کو لات مارنے کے لیے جینز پر ہاتھ رکھ کر غصہ کرنے لگا۔ اس کے بعد ایک گہری سانس لے کر موٹر سائیکل تھپکتے ہوئے پولا۔ ”تم نہیں گھڑی ہو۔ تقدیر گھڑی ہے۔“

تیسرا دن پھر یونیورسٹی گزر گیا۔ کوئی بات نہ بن سکی۔ اس روز اس نے گاڑی کی اچھی طرح مرمت کرائی۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ بالکل رنگ کنڈیشن میں ہے تو چوتھے دن دس بجے سے پہلے ہی بس اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ پچھلے دن کی طرح ٹھیک پونے دس بجے گھر سے نکلی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ صبح وقت پر گھر سے نکلتی ہے اور کسی ضرورت سے کہیں جاتی ہے۔ گلی کے کنارے آتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ نظریں چار ہوئی تھیں۔ اس نے ناگوار سے دیکھا۔ پھر اس طرح اونٹ کہہ کر منہ پھیر لیا جیسے اس سے شدید نفرت ہو، وہ سڑک پار کرنے لگی۔ کامران نے کہہ دیا۔ ”پلیز مجھے صفائی موقع دو۔ میں بے قصور ہوں۔“

ایسا کہنے کے دوران وہ سڑک کے دوسری طرف جا چکی تھی۔ بس بھی آگئی تھی اور اب وہ سوار ہو کر جانے والی تھی۔ وہ اس کی آوازوں میں گم ہو گیا۔ اس کی نفرت میں بھی بالائی دلہنی تھی۔ اونٹ کہہ کر منہ پھیرنے اور دور جانے میں پاس بالانے کی ترغیب تھی۔ ایک پہنچ تھا۔ مناسکے ہو تو کسی طرح منالو۔

”میں آتا رہوں گلہ بیش آتا رہوں گلہ جو خطاوار ہوتے ہیں، وہ منہ چھپاتے ہیں۔ میں نے کوئی خطا نہیں کی ہے۔“

کنڈیکٹر نے بس ذرا تیز کی طرف دیکھتے ہوئے آواز دی۔ ”استاد سائیکل مارو۔ ایک بندہ مرنا چاہتا ہے۔ ویسے بھی کراچی کے ڈرائیور بندے مارنے میں مشہور ہیں۔“ یہ سننے ہی ڈرائیور نے بس کی رفتار تیز کر دی۔ پھر اسے دائیں بائیں گھمانے لگا۔ یقیناً وہ سائیکل مارنا چاہتا تھا۔ موتا نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ موٹر سائیکل کو اسی طرح دائیں بائیں گھماتا آ رہا تھا۔ بس اس کے قریب آنا چاہتی تو وہ ذرا دور ہو جاتا۔ دوسری طرف گھومتی تو وہ اس کے قریب چلا آتا۔ ایک بار یوں لگا جیسے وہ موٹر سائیکل توازن قائم نہ رکھ سکا ہو۔ بس سے ٹکرانے ہی والا ہو۔ موتا نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمحوں تک اس کا دل دھڑکتا رہا۔ یہی سمجھ میں آتا رہا کہ اب تب اس کے حادثے کی خبر سنائی دے گی لیکن اس کا قہقہہ سنائی دیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”واہ صاحب! ادا نہیں ہیں۔ خود تو نفرت سے مارتے ہو۔ ہم مرنا چاہیں تو محبت سے آنکھیں بند کر لیں۔“

بس ایک اسپتال کے اسٹاپ پر رکنے لگی۔ وہ موٹر سائیکل کی رفتار بڑھاتا ہوا وہ لکھا چلا گیا تاکہ وہ آگے بڑھے گی تو پھر اس کے ساتھ رہیں لگائے گلہ ایک منٹ کے، وہ نئی وہ اپنی طرف آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے پھر موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور اسے آٹا بڑھانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بس کے برابر رہیں لگا رہا تھا۔ زنانہ درجے کے دروازہ کے پاس پہنچ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ شاید اسے پیٹھ سے لیے سیٹ مل رہا ہو۔ وہ موٹر سائیکل کی رفتار کبھی گھٹاتے ہوئے، کبھی بڑھاتے ہوئے، بیٹوں کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے باوجود وہ نظر نہیں آتی۔ کچھ منٹیں ایسی تھیں جو ہر سے نظر نہیں ملتا تھیں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کسی سیٹ پر بیٹھی ہو۔

ایک اور اسٹاپ آگیا۔ گاڑی وہاں رکی تو اس نے موٹر سائیکل کو ایک جگہ روک کر زنانہ درجے کے پاس آکر دیکھا۔ کچھ عورتیں اتر رہی تھیں۔ کچھ سوار ہو رہی تھیں۔

وہ دوڑتا ہوا مردانہ جسم میں پچھلا پھر مردانہ سے چڑھ کر زنانہ درجے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ موجود نہیں تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے دیکھتے ہی آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گئی ہو۔

لیکن وہ غائب کیسے ہو سکتی تھی؟ وہ اسے دیکھتا آ رہا تھا۔ یقیناً پچھلے اسٹاپ پر اتر گئی ہوگی۔ بس آگے بڑھنے لگی۔ وہ جلدی سے نیچے اتر گیا۔ مایوسی سے چلتا ہوا موٹر سائیکل کے پاس آیا۔ پھر اسے اسٹارٹ کر کے پچھلے اسٹاپ کی طرف جانے لگا۔ پچھلی منزل میں یہ مہموم کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔ ایک طرف بڑا اسپتال تھا۔ دوسری طرف اسکول اور اسکول کے ساتھ ہی ایک بہت بڑی عمارت تھی اس میں مختلف دفاتر تھے۔ اب وہ ان دفاتر میں کیسے کام کرتی تھی۔ اسکول میں بچوں کو پڑھاتی تھی یا ہسپتال میں ملازمت کرتی تھی۔ وہ کیا کرتی تھی؟ کہاں گئی تھی؟

اس نے باری باری تمام جگہ تلاش کرنا شروع کیا۔ وہ دس بجے اس اسٹاپ پر پہنچا تھا۔ دو بجے دہر تک اسے ڈھونڈتا ہی بارگھر وہ نظر نہیں آئی۔ اسے تھک ہار کر واپس آنا پڑا۔ اس نے فیصلہ کر لیا اگلے روز وہ موٹر سائیکل کو بس کے پیچھے دوڑاتا رہے گلہ آگے نہیں جائے گا اور دیکھتا رہے گا کہ کس اسٹاپ پر اتر کر کہاں جاتی ہے۔

اس طرح پانچواں دن گزرنے لگا۔ پچھلے دن وہ بس اسٹاپ پر کھڑا رہا لیکن وہ اپنے گھر سے نکلتی ہوئی کبھی سے گزرتی ہوئی یا بس میں سوار ہوتی ہوئی نظر نہیں آئی۔ اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ محبت کے جنون میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ پریشان ہو کر سوچتا تھا۔ آخر کہاں گم ہو گئی؟ کیوں نظر نہیں آتی؟

اگر وہ بیمار ہو گئی ہے تو میں اس کے گھر جا کر دوا نہیں کر سکتا۔ دعا کر سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتی، اس کی بیماری ہی مجھے مل جائے تاکہ وہ چلتی پھرتی نظر آئے۔

دن گزرتے جا رہے تھے۔ وقت دھمکی دے رہا تھا کہ جلدی گزر جائے گا اور ہنسیاں ختم ہو جائیں گی۔ وہ صبح لکھا تھا اور تمام دن مارا مارا پھرتا تھا۔ کبھی بس اسٹاپ کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا تھا کبھی اس چوڑیوں کی دکان کے پاس پہنچ کر گھنٹوں اوجھڑا دیکھتا رہتا تھا۔ کیا وہ کبھی چوڑیاں پہننے بھی نہیں آئے گی؟

ایک دن اس کی مٹی نے پوچھا۔ ”تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ کم از کم شیوہ

کی کیا ہے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنے دولہا بھائی کا بازو پکڑ کر ایک طرف
ہوئے کلمہ ”غضب ہو گیا۔“

اس کی آپا اور بیٹنی نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”ایکڈنٹ ہو گیا۔ مجھ فوراً جانا ہے۔ آپ ایک سے سو تک گنتے رہیں۔ میں ابھی
آؤں۔“

اس دوران میں موٹر سائیکل اشارت ہو چکی تھی۔ وہ موٹر سائیکل پر بیٹھ کر اسے
اشارت کرتے ہوئے اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے مکان کے احاطے سے نکلا۔ گلی سے
گورا ہوا دوسری گلیوں کو عبور کرتا ہوا اس سڑک پر پہنچ گیا جس کے بس اسٹاپ پر وہ
اُبلتی تھی۔

ٹھیک پونے دس ہوئے تھے۔ ایک برقی والی گلی نمبر دس سے چلی آ رہی تھی۔ وہ
خود سے دیکھنے لگا۔ سرے پاؤں تک جائزہ لینے لگا۔ کیا یہ وہی ہے؟

وہ سڑک کو پار کر بس اسٹاپ کی طرف گھوم کر چلی گئی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا وہی
لیکن اسے مخاطب کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بس آئی اور وہ سوار ہو کر جانے لگی۔

اس نے موٹر سائیکل اشارت کی اور اس کے تعاقب میں چل پڑا۔

ہر اسٹاپ پر وہ بس کے پیچھے رک جاتا تھا۔ توجہ سے دیکھتا تھا کہ برقی والیاں بس

اترتی ہیں۔ یوں تو برقی ایک جیسے ہوتے ہیں اور زیادہ تر سیاہ رنگ کے ہوتے ہیں

لیکن اسی دن ذرا مختلف ہوتے ہیں۔ اس نے برقی کے ڈیزائن کو اور برقی والی کے

چہل قدمی توجہ سے دیکھا تھا اور اس کی پہچان رکھی تھی۔

آخر وہ ہسپتال کے اسٹاپ پر اتر گئی۔ کامران نے اس کے برقیے اور میٹھل کو

دیکھا۔ ایک طرح سے اور تصدیق ہو گئی۔ وہ بس سے اترنے کے بعد ادھر ادھر دیکھ

رہی تھی۔ کامران پر نظر پڑے ہی فوراً تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہسپتال کے احاطے میں

داخل ہو گئی۔

اس کی اداؤں سے گھبراہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ دربار پلٹ کر اسے دیکھتی تھی۔

اُسی سے چلتے گنتی تھی۔ کامران نے ہسپتال کے احاطے میں پہنچنے ہی ایک طرف گاڑی

لیا کر۔ اچھے کپڑے پہنا کر۔ آج لڑکی والے تمہیں دیکھنے آرہے ہیں۔ بہت بڑا گھرانہ

ہے۔ ان کی اگلی لڑکی ہے۔ ماں باپ کے بعد ساری دولت اور جائیداد اسی کی ہوگی۔“

”مجھے دولت اور جائیداد نہیں۔ صرف شریک حیات چاہیے۔“

”ہاں! ہاں میں خوب سمجھتی ہوں۔ اسی کے پیچھے دیوانہ بنا گھومتا رہتا ہے۔ کیا

حالت بنائی ہے اپنی؟ چندہ دن گزر چکے ہیں۔ چھٹی کے صرف چندہ دن رہ گئے ہیں۔“

اب جانے کا تو پتا نہیں کتنے برسوں کے بعد آئے گھ میں اس بار بھولا کر رہوں گی۔ اب

مجھ سے گھر کی ذمہ داریاں سنبھلی نہیں جاتیں۔“

اسی وقت ایک عورت برقی چن کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کی مٹی نے پوچھا۔

”اے بہن! تم کون ہو؟“

اس نے برقی اُتارتے ہوئے کلمہ ”لو! پہچان لو۔“

وہ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اسے دیکھتے ہی مٹی نے کلمہ ”اے ہے“ یہ تم ہو؟ آج

برقی کیوں پہن لیا؟“

”کیا کروں بہن! میں نے تمہارے بیٹے کا رشتہ لگایا ہے اس محلے میں اور دو چار

لڑکے والے ہیں۔ سب بیکے ہیں ہمیں اسی دولت مند لڑکی کا رشتہ چاہیے۔ اسے کتنے

ہیں ایک انار اور سو پیار۔“

اس کی مٹی نے کلمہ ”سن رہے ہو گا؟! اس لڑکی کے لیے دنیا دیوانی ہے۔ یہ تو

ہماری بوا کی محبت ہے کہ یہ رشتہ ہمارے لیے روک رکھا ہے۔“

بوانے کلمہ ”اسی لیے آج برقی پہن کر آئی ہوں۔ سوچا دھر سے گزروں گی تو

محلے والے مجھے دیکھ کر گھبریں گے مجبور کریں گے منہ کی مروت ہوتی ہے بہن۔ منہ

چھپانے کے لیے آج پہن لیا۔“

کامران نے ایک دم سے چوک کر کلمہ ”برقی؟“ اس نے برقیے کو دیکھا۔ پھر

کھڑکی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اوہ گاڈ! اتنے دنوں سے مجھے اتنی سی عقل نہیں آئی۔

برقی۔“

یہ کہتے ہی وہ دوڑتا ہوا باہر آیا۔ باہر اس کا بیٹنی موٹر سائیکل اشارت کر رہا تھا اور

کھڑی کر دی تھی اور اس کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اس کی جرات نے لڑکی کو اور پریشان کیا۔ وہ ہسپتال کے برآمدے میں آئی۔ ایک بار پلٹ کر دیکھ کر پھر تیزی سے چلتے ہوئے اس طرف جانے لگی جہاں مختلف ڈاکٹروں کے کمرے تھے۔ ان کے بعد آپریشن ٹیمیر تھا۔ ادھر عام آدمیوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ایک کوریڈور میں مڑ گئی۔ آگے جا کر پلٹ کر دیکھا تو وہ نظر نہیں آیا۔ اس نے اطہمیکان کی سانس لی۔ یقیناً ہسپتال کے دربان نے یاد دہرائے نے اسے ادھر آنے سے روک دیا ہو گا۔

وہ ایک بڑے سے کمرے میں آئی۔ وہاں کئی نرسیں لباس بدل رہی تھیں یا میک اپ درست کر رہی تھیں۔ جن کی ڈیوٹی ختم ہو چکی تھی وہ جانے کی تیاری کر رہی تھیں اور جنہیں ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا وہ نرس کا مخصوص لباس زب تن کر رہی تھیں۔

وہ کمرے میں آتے ہی برق اتارنے لگی۔ اس سے پہلے ہی سفید لباس پہن رکھتا تھا نرس بننے کے لیے ہلکی سی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ وہ آئینے کے سامنے آکر سر پر وہ ردع کیپ پہننے لگی جو نرسوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ اس کے قریب کھڑی ہوئی نرس نے پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔ آج بہت دنوں بعد پھر پریشان نظر آ رہی ہو؟“

”اس نے مجھے پہچان لیا ہے۔“

”مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ ہر قسم میں بھی پہچانی جاؤ گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے، جب تم چلتی ہو تو سب سے الگ نظر آتی ہو۔“

”آخر میری چال میں کیا ہے؟“

”یہ پوچھو کیا نہیں ہے۔ جب چلتی ہو تو لگتا ہے تلوار چل رہی ہے۔“

”مذاق نہ کرو۔ میں بہت پریشان ہوں۔ آج تو وہ میرے پیچھے ہی پڑ جائے گا۔“

”اس سے ڈرتی بھی ہو، اس کا ذکر بھی کرتی ہو، خود کو اس سے بچا کر یہاں تک لے آئی ہو لیکن دھیان ادھر ہی اٹھا ہوا ہے۔“

”تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میرا دھیان میری ہی طرف ہے۔“

”ان حالات میں زبان جھوٹ کتنی ہے چہ بچ کہتا ہے۔ یقین نہ ہو تو آئینے کے سامنے ہو خود دیکھ لو۔“

اس نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی منظر بدلنے لگا۔ چوڑیوں کی دکان نظر آ رہی تھی۔ وہ کلائنر کے پاس سے پلٹ رہی تھی۔ ایک بیک اپنے سامنے اجنبی کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ وہ اتنا قریب تھا جیسے سانسوں میں اترنا چاہتا ہو۔

کوئی اتنے قریب کبھی نہ آیا تھا پہلے خواب آتے تھے، دھندلا سا تصور ہوتا تھا۔ اب وہ تصور مجسم ہو کر عین نگاہوں کے سامنے آ گیا تھا۔ چہرے پر شرفی۔ آنکھوں میں اتنی گہری چمک تھی جیسے اپنی طرف کھینچ رہی ہوں۔ محبت سے حکم دے رہی ہوں۔ ”چلی آؤ۔ میری طرف چلی آؤ ورنہ جھپٹ لوں گا۔“

اور وہ یکبارگی سہم کر پیچ پھرتی تھی۔

وہ منظر دھواں دھواں ہو گیا۔ آئینے کے فریم میں جیسے دھواں بھر گیا ہو۔ جب وہ چمنے لگا تو دوسرا منظر دکھائی دیا۔ مونا اپنی آبا اور بھونٹی کے ساتھ ایک کمرے میں تھی۔ اس کا بھونٹی کھڑکی کی طرف سے پلٹ کر کہہ رہا تھا۔ ”وہ آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا بیگ ہے یقیناً ہمیں بیوقوف بنانے کے لیے کسی مروت خان کے نام سے تحفہ لا رہا ہے۔“

اس کی آپانے کہا۔ ”اور آپ وہ تحفہ قبول کرنا چاہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آج سے پہلے آپ نے ایک پیسے کی بے اہمائی نہیں کی۔ پھر یہ کیا حرکت ہے؟“

”بیکرم! میں نے جیسا سمجھایا ہے دیئے ہی کر لیا۔ جیسے ہی آواز دہن، تم کہنا مروت خان کا ٹیلیگرام آیا تھا۔ ہم نے پڑھ کر کہیں رکھ دیا۔ اس کے بعد وہ گم ہو گیا۔“

مونا نے کہا۔ ”دوسرا بھائی یہ تو اور زیادہ بے اہمائی ہو گی۔ آپ اس تحفے کے بعد اس سے اسٹیرو کیٹ ریکارڈر وصول کرنا چاہیں گے۔“

خلیل احمد نے مونا کو گہری سنجیدگی سے دیکھا پھر بڑی نرمی سے کہا۔ ”تم میرے گھر میں جو ان بیٹی کی طرح ہو اور میں ایک باپ کی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہوں۔ تمہیں کوئی بھی پسند کرے گا تو میں اسے ہر طرح سے پرکھنے کا سمجھنے کا حق رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے طور پر پرکھنے دو۔ میں نے تم لوگوں کو یقین دلایا ہے اس سے کیٹ ریکارڈر وصول کرنے

وہ ایک گہری سانس لے کر بولے۔ ”کسی کا راستہ روکنا دانش مندی نہیں ہے۔ وہ موتا کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جوانی کے رویا کی روانی ہوتی ہے، اس کا راستہ روکو تو وہ راستہ بدل کر دوسری طرف بہتی ہے۔ وہ ہمارا پتا پوچھ رہا تھا۔ ہمارے گھر آنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی سیدھے راستے سے آتا چاہے تو اس کے منہ پر دروازہ نہیں بند کرنا چاہیے۔ ورنہ آنے والے دیواروں میں شگاف ڈال کر آ جاتے ہیں البتہ اسے یہاں تک بلانے کا اندازہ لگانا تھا۔ وہ خود کو دانش مند اور مجھ کو احمق سمجھ کر پتا معلوم کر رہا تھا۔ میں نے خود کو دانش مند اور اسے احمق سمجھ کر اس سے یہ ڈراما شروع کیا۔ میری نیت صاف تھی۔ میں اس سے تحائف وصول کرنے کے بعد اس کے والدین کو واپس کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے صحت ہو اور وہ آئندہ زندگی کے معاملات میں سیدھا راستہ اختیار کرے۔ سیدھی طرح دروازے پر آئے اور دستک دے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ تکمیل دیانت داری سے شروع کروں گا اور بے ایمان ٹھہرا یا جاؤں گا۔“

آپ نے کہل ”ایک طرح سے آپ نے اچھا ہی کیا۔ اس طرح ان کی کم عمری کا پتا چل گیا۔ اب ایسے لوگوں پر لعنت بھیجئے۔“

موتا گم گم کھڑی سوچ رہی تھی۔ اچانک منظر بدل گیا۔ وہ گلی کی کھڑ پر تھی اور دوسری طرف کامران موٹر سائیکل کے قریب نظر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی اس نے نفرت کا اظہار کیا اور غصہ دکھاتے ہوئے ”سڑک پار کرتے ہوئے جانے لگی۔“

آجینے کے فریم میں منظر بدلتے جا رہے تھے۔ لوگوں نے کامران کے گریبان کو پکڑ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اچھا تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے صفائی کا موقع دو۔ میری کوئی خطا نہیں ہے۔“

منظر پھر بدل گیا۔ وہ بس کے ساتھ موٹر سائیکل کی ریس لگا رہا تھا اور اسے دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ پریشان تھی۔ سسی ہوئی نظروں سے کبھی اسے دیکھتی تھی۔ کبھی نظریں چرائیتی تھی۔ وہ بلند آواز سے کنڈیکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”جب میں کسی کے ساتھ چلنے کا ارادہ کر لیتا ہوں تو اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلتا ہوں۔ اگر وہ بھاگتا ہے تو میں اسے پکڑ لیتا ہوں۔“

کے بعد تمام چیزیں اس کے والدین کو واپس کر دوں گا۔“

اسی وقت دروازے پر دستک دینے کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہل ”میں جا رہا ہوں۔ اس سے باتیں کرتا ہوں۔ یاد رکھنا اس بار اس سے اسٹیریو کیسٹ ریکارڈز کا مطالبہ کرنا ہے۔“

وہ دروازے کی طرف جانے لگے۔ موتا انہیں ایسے دیکھ رہی تھی جیسے یہ سب کچھ اسے پسند نہ ہو لیکن بے بس ہو۔ بیروں کے درمیان کوئی اس کی سننے والا نہ ہو۔

وہ منظر بھی دھواں دھواں ہو گیا۔ جب دھواں پھٹنے لگا تو ایک خواب گاہ کا منظر دکھائی دیا۔ رات کا وقت تھا۔ خلیل احمد بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ پاس ہی وہ بڑا سا پینٹ رکھا ہوا تھا۔ جو کامران دے گیا تھا۔ اس کی آپا کہہ رہی تھی۔ ”اسے کھول کر تو دیکھیں۔“

آخر کیا ہے؟“

”اس میں جو کچھ بھی ہے، ہمارا نہیں ہے۔ جس کا ہے اس کے پاس واپس جانے والا ہے۔“

موتا نے کمرے میں آکر کہل ”دوسرا بھائی! مجھے یہ بالکل پسند نہیں ہے۔ میں یقین سے کہتی ہوں، کل وہ جانے کتنا قیمتی کیسٹ ریکارڈز خرید کر لے آئیں گے۔ جب سوچتی ہوں، یہ سب میرے لیے ہو رہا ہے تو بڑی شرم آتی ہے۔ پلیز، آپ اسے واپس کر دیں۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ کیا ضروری ہے کہ اسے ریکارڈز خریدنے پر مجبور کریں۔ اتنی آزمائش کافی ہے۔ میں اس کے والد سے کل صبح ہی ملنے جاؤں گا۔“

منظر پھر دھواں دھواں سا ہو گیا۔ جب وہ دھواں پھٹنے لگا تو خلیل احمد کی کمر بھگی ہوئی نظر آئی۔ وہ صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ بڑے ہی دل برداشتہ ہو کر کہہ رہے تھے۔ ”مجھے ان لوگوں سے ایسی توقع نہیں تھی۔ ایک تو ان کا مال واپس کرنے گیا اوپر سے چور کہلایا۔“

آپا نے کہل ”میں اسی دن کے لیے منع کرتی تھی۔ کیا ضرورت تھی اس لڑکے کو لفٹ دینے کی؟“

اور وہ بس کی تیز رفتاری کے ساتھ اپنی تیز رفتاری کا ثبوت دیتا جا رہا تھا۔
منظر بدل گیا۔ وہ گہرائے ہوئے انداز میں ہسپتال کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں
نرسیں اپنا لباس تبدیل کر رہی تھیں۔ اس کی اسی سبیلی نرس نے پوچھا ”کیا بات ہے؟“
”وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ آج اس نے موٹر سائیکل پر پیچھا کیا ہے۔ یہاں بھی
یقیناً آتا ہی ہو گا۔“

”پریشان کیوں ہوتی ہو۔ تم اسی کمرے میں رہو۔ آج میں تمہاری ڈیوٹی سنبھال
لوں گی۔“

مونا نے اطمینان کی سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ منظر پھر بدل گیا۔ اب وہ اپنے
گھر میں تھی اور ایک سیاہ برقع پہنے ہوئے تھی۔ اس کی آبا کپا کر رہی تھی۔ ”یہی مناسب
ہے۔ کسی کے منہ کھٹنے سے بہتر ہے“ اپنے بچاؤ کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے۔ اپنا
عزت اپنے ہی ہاتھ ہوتی ہے۔“

وہ برقع پہن کر گلی کی کھڑ پر پہنچی۔ دیکھا تو کامران موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا اس کے
مکان کی طرف، اس کی گلی کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس برقعے والی کو نہیں پہچان رہا تھا۔
اس کے باوجود وہ گہرا رہی تھی، جیسے پہچان لی جائے گی۔ وہ سڑک پار کر کے بس اسٹاپ کی
طرف چلے گئی۔

منظر پھر بدل گیا۔ وہ برقع پہنے ہوئے چوڑیوں کی دکان میں تھی۔ چوڑیاں پسند کر
رہی تھی۔ اور بار بار سرگھما کر باہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کامران کھڑا ہوا تھا۔ وہ اس
لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو چوڑیوں کی دکان میں داخل ہوتی تھی یا اس دکان سے باہر نکلتی تھی پھر
وہ وہ رہ کر بائیس ہو جاتا تھا۔

☆-----☆

منظر بدل گیا۔ وہ اپنی گلی سے نکل کر سڑک پار کرتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف جا
رہی تھی۔ کامران نظر آ رہا تھا۔ اب اس کا شیوہ بڑھا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔

پہرے سے دھشت برس رہی تھی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اپنا سب کچھ
لٹانے کے بعد کسی محتاج کی طرح سڑک کے کنارے سوائی بن کر کھڑا ہو گیا ہو۔

مونا پہلے برقع پہن کر ہسپتال آئی تھی۔ فاتحانہ انداز میں مسکراتی ہوئی برج اتارتی
تھی۔ جیسے دشمن کو شکست دے کر آ رہی ہو۔ اب وہ عرصہ حال ہی ہو کر ہسپتال کے کمرے
میں داخل ہوتی تھی بہت جلد سے ہوئے انداز میں برقعے کو اتارتی تھی اور سوچتی رہ جاتی تھی
اور یوں سوچنے کے دوران پھر چوڑیوں کی دکان کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اس بار وہ دکان
لے اندر نہیں گئی تھی۔ دور ہی سے دیکھ رہی تھی۔ کامران وہاں کھڑا ہوا۔ دکان میں
آنے جانے والی ہر لڑکی کو دیکھ رہا تھا اور بائیس ہو رہا تھا۔ اس کی نگاہیں اسے تلاش کر
رہی تھیں۔ وہ موجود تھی مگر پردے کے پیچھے تھی۔ وہ برقع ایک بند دروازہ تھا۔ صرف
دروازہ کھلنے کا دیر تھی۔ وہ نظر آتی تو دیوانہ دوڑا چلا آتا لیکن گھر اپنا ہوتا ہے وہ اپنا ہوتا
ہے، مرضی اپنی ہوتی ہے۔ اس کی اپنی مرضی تھی کہ وہ دروازہ کھولے یا بند رکھے۔ اس کا
ہاتھ دروازے تک جاتا تھا۔ وہ ہچکچاتی تھی۔ پھر ہاتھ واپس آ جاتا تھا۔ وہ دروازہ کھولتے
کھولتے رہ جاتی تھی۔

آئینہ صاف ہو گیا۔ تمام متاعِ عدل گئے۔ وہ خود کو آئینے میں نرس کے روپ میں
دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ آئینے کی طرف سے پلٹ کر جانے لگی۔ اس کی سبیلی نے کلمہ ”تم جا
رہی ہو اور تمہارا وہ موٹر سائیکل پر تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچ گیا ہے۔“

☆-----☆

وہ جاتے جاتے دروازے پر رک گئی۔ پھر کچھ کسے بغیر آگے بڑھ گئی۔ جیسے عزم کر
لیا ہو کہ دروازہ کھول دینا چاہیے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ وہ کمرے سے باہر نکلے۔ ایک
کورڈ رے سے ہوتی ہوئی دوسرے کورڈ رے میں آئی پھر ٹھٹک گئی۔ وہ سامنے کھڑا ہوا تھا۔
ہند کھوں تک دونوں ساکت رہے۔ دونوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائیں۔ پھر وہ
نظریں چرا کر اس سے کتراتے ہوئے جانے لگی۔ وہ اس کے برابر چلتے ہوئے بولا۔ ”مجھے

صفائی کا موقع دو۔ میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔ میری نیند اڑ گئی ہے۔ میری بھوک مر رہی ہے۔ میں آہستہ آہستہ مرتا جا رہا ہوں۔“

وہ چلتے چلتے ایک دم سے رک گئی۔ ذرا گھبرا گئی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اٹھ اٹھا۔ وہ حرکتے ہوئے دل پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے تیری بدل کر ذرا سخت لمبے میں پوچھا۔ ”آخر کیا چاہتے ہو؟ کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو؟“

”میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میری کوئی خطا نہیں ہے۔“

”میں نے مان لیا۔ تمہاری کوئی خطا نہیں ہے۔ اب پیچھا چھوڑ دو۔“

”جب بے قصور مان رہی ہو تو پیچھا کیوں چھوڑ رہی ہو۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اُس روز میرے والدین غلط فہمی کی بنا پر غلیل صاحب سے فارو سلوک نہ کرتے تو اب تک ہمارے درمیان کی ساری دیواریں گر چکی ہوتیں اور تمام بڑے دروازے کھل چکے ہوتے۔ آج تم میری شریک حیات ہو تیں۔ مجھ سے پیچھا چھڑانے کا بات نہ کرتیں۔“

اس نے فوراً ہی دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدل رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”میں ڈیوٹی پر ہوں۔ آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔“

”میں بھی ڈیوٹی پر ہوں۔ دل کا معاملہ پیش کرنا دنیا کی سب سے بڑی ڈیوٹی ہے۔ نوجوانی کا سب سے اہم تقاضا ہے۔“

وہ ایک کمرے کے سامنے رک گئی۔ ”پلیز چلے جائیں۔ کیا آپ مجھے بدنام کرنا چاہتے ہیں؟“

”میں تمہیں اپنا نام دینے آیا ہوں۔ بدنام کرنے کے لیے نہیں۔ اگر مجھ سے ڈر لگتا ہے تو میں قریب نہیں آؤں گا لیکن دور ہی دور سے ضرور دیکھنا رہوں گا۔“

وہ کوئی خواب سننے بغیر آگے بڑھ گیا۔ وہ چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی۔ پھر کمرے کے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈیوٹی پر تھی پھر بڑے ڈاکٹر کے ساتھ راولپنڈی پر نکلی تو آٹن کے کامران کو برآمدے میں دیکھا۔ وہ اپنے وعدے کے مطابق دور تھا۔ اسے

مخاطب نہیں کر رہا تھا۔ بس اسے دیکھے جا رہا تھا۔

اس کا دیکھنا ہی قیامت ڈھا رہا تھا۔ موتا سے کوئی کام نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کی ہدایات کو سختی سے منہ کی طرف توجہ دیتی تھی لیکن دھیان اس کی طرف چلا جاتا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی طرف سے منہ پھیرنے کے باوجود دل کیوں نہیں پھرتا۔

عورت اپنی انا سے مجبور ہے۔ وہ زبان سے چاہت کا اظہار نہیں کرتی مگر غیر شعوری طور پر چاہتی ہے کہ اسے کوئی چاہت دیکھتا رہے۔

اور وہ دیکھ رہا تھا۔ اس اعتماد سے دیکھ رہا تھا کہ اس کی فریادی نگاہیں موتا کے دل پر دستک دے رہی ہیں۔

(ہر شخص ماہر نفسیات نہیں ہوتا لیکن محبت ایک دوسرے کی نفسیات سے کھیلنے کا طریقہ سمجھا دیتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ عورت آہستہ سے زیادہ مرد کی آنکھوں میں سنورنا چاہتی ہے اور یہ جانتی ہے کہ مرد ایک بار اس کا ہاتھ تھامنے کی ضد کر لے تو پھر ایک بار نہیں! بار بار جب سے نکلے جانے کی پروا نہیں کرتا۔)

اسسٹنٹ ڈاکٹر نے آکر اطلاع دی۔ ”سر! آپریشن کے تمام انتظامات مکمل ہیں لیکن خون دستیاب نہیں ہو رہا ہے۔“

”کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ کیا کسی بلڈ بینک میں نہیں ہے۔“

”جی نہیں۔ دیے بھی او نیگیٹو بڑی مشکلوں سے دستیاب ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں خون دینے کی روایت بہت کم ہے۔ لوگ اس سلسلے میں تعاون نہیں کرتے۔“

دونوں ڈاکٹر باتیں کرتے ہوئے ہسپتال کے برآمدے سے گزر رہے تھے۔ موتا ان کے ساتھ تھی۔ اچانک کامران نے ان کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر! میرے خون کا گروپ او نیگیٹو ہے۔ میں خون دینے کے لیے تیار ہوں۔“

اس کی پیش کش سننے ہی وہ چلتے چلتے رک گئے۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”کیا تم مریض کے رشتہ دار ہو؟“

”جی نہیں۔“

”جھا تو خون کا عطیہ دے رہے ہو۔“
 ”جی نہیں۔“
 ”معاوضہ چاہتے
 ”جی نہیں۔“

”پھر؟“ سب نے اسے تعجب سے دیکھا۔

اس نے مونہ کو دیکھ کر کہہ ”ڈاکٹر! آپ نے فراہ کے متعلق سنا ہو گا۔ اس نے اپنے سر پر پیشہ مار لیا تھا۔ اس نے ناخن اپنا خون بلایا تھا۔ اگر خون بنانا ہی ہے تو اپنی رگوں سے دوسروں کی رگوں میں بلایا جائے۔ میں آج سے محبت کے نام پر اپنا خون دیتا رہوں گا۔ اس وقت تک دیتا رہوں گا جب تک بلڈ بینک والوں کو میرے خون کی ضرورت پڑتی رہے گی۔“

مونہ گم صم سی ہو کر اس کا منہ تک رہی تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ ہسپتال کے ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا اور اس کا خون لیا جا رہا تھا۔ وہاں مونہ کے علاوہ ایک وارڈ بوائے تھا وہ ڈاکٹر کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ مونہ کی ڈیوٹی رہ گئی۔ وہ خون دے رہا تھا اور اس کی جانب منکرا کر دیکھ رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کے قریب آکر آہستگی سے بولی۔ ”میں جانتی ہوں۔ آپ اس ہسپتال میں رہنے کے لیے خون دے رہے ہیں۔“

”تم کچھ نہیں جانتیں۔ خون دینے کے بعد میری چھٹی ہو جائے گی۔ میں چلا جاؤں گا۔ ہاں کل آؤں گا۔ کل پھر خون دوں گا۔ اس کے بعد پھر آؤں گا اور اس کے بعد آتی رہوں گا۔“

”کسی کے جسم سے خون لینے کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اس کا باقاعدہ طبی معاوضہ ہوتا ہے۔ آپ روز آئیں گے، روز آپ کا خون نہیں لیا جائے گا۔“

”میں دوسرے بلڈ بینک میں جا کر دوں گا لیکن اپنے جسم کا خون قطرہ قطرہ نکالتا رہوں گا۔“

”کیا آپ کا دماغ چل گیا ہے؟“

”نہیں“ محبت میں ٹھاکہ ہو کر خود کشی کرنے کا ایک نیا طریقہ اختیار کر رہا ہوں۔ ٹھاکہ کی کا زہری کر مرنے سے بہتر ہے اپنے خون کا ایک ایک قطرہ دوسروں کو دے کر اس دنیا سے جاؤں۔“

مونہ کی بڑی بڑی سیاہ کنورا جیسی آنکھوں میں تشویش تھی۔ اندیشہ تھا کہ یہ دیوانہ واقعی ایسے ہی جان دے دے گا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے تمام مناظر زخموں زخموں ہو رہے تھے۔ دل کے دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ دھک دھک دھک دھک.....

دروازہ ابھی بند تھا لیکن اس بند دروازے کے پیچھے خمیر کی عدالت قائم تھی۔ جج صاحب میز پر ہاتھ راتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”ادب“ ادب یہ خمیر کی عدالت ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی پر ظلم کیا جائے اور اسے موت مارا جائے“ اس کی حمایت میں آواز اٹھانا خمیر کا اولین فرض ہے۔“

ایک وکیل نے کہا ”اے منصف اعلیٰ! اس مظلوم پر ایک نظر کی جائے۔ یہ بے موت مارا جا رہا ہے۔“

جج صاحب نے کارنام کی طرف دیکھا۔ وہ عدالت کے کمرے میں کھڑا ہوا ایک خنجر کو اپنے سینے میں آہستگی سے پیوست کرتا ہوا اپنے ایک ہاتھ کے چلو میں اپنے دل کا لہو پٹکا رہا تھا۔ وکیل نے کہہ ”یہ مظلوم ہے۔ اپنے دل کا خون کرنے پر مجبور ہے اور اسے مجبور کرنے والی ایک سنگدل لڑکی ہے۔“

منصف اعلیٰ نے حکم دیا۔ ”ظلمہ کو حاضری کیا جائے۔“

زنخیریں بجتے گئیں۔ مونہ گردن سے لے کر پاؤں تک زنخیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ وہ کسی ظلم کی طرح سر تھکائے آہستہ آہستہ آکر دوسرے کمرے میں کھڑی ہو گئی۔ اس سے سوال کیا گیا۔ ”کیا تم نے اس نوجوان کو دیوانہ بتایا ہے؟“

مونہ نے بڑے ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ”آدمی دیوانہ بن جاتا ہے۔ بتایا نہیں جاتا۔“

”کیا یہ تمہارے دل پر دستک دے رہا ہے؟“

”جی ہاں، پہلی ملاقات سے آج تک دستک دیتا چلا آ رہا ہے۔“

”تم دل کا دروازہ کھولنا کیوں نہیں چاہتیں؟“

”میں ڈرتی ہوں۔ دروازہ کھولوں گی تو یہ مجھے جیت کر لے جائے گا۔“

”تمہیں اس کی جیت پر کیا اعتراض ہے؟“

”سب سے پہلا اعتراض تو یہ کہ یہ سات سمندر پار سے آیا ہے، آج آیا ہے کل

چلا جائے گا۔ میں ایک کمزور عورت ہوں۔ ایک بار دل ہارنے کے بعد سات سمندروں کو

عبور کر کے اپنے چاہنے والے تک نہیں پہنچ سکوں گی۔“

کامران نے اپنے چلو میں بھرے ہوئے لو کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”اے منصف

اعلیٰ! میں اپنے بازوؤں کی کشتی ہاؤں گا اور لو کے دریا سے گزر کر اپنی مونا کو اپنے ساتھ

لے جاؤں گا۔“

مونا نے کہا۔ ”اے منصف اعلیٰ! ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک پہنچنے کے

لیے اجازت مانہ چاہیے۔ صرف دل کی بات ہو تو میں اجازت دے سکتی ہوں۔ اس کے

بعد بزرگوں کی اجازت چاہیے لیکن اس دیوانے کے بزرگ مغرور ہیں۔ اپنے سامنے

دوسروں کو کتر سمجھتے ہیں۔ انہوں نے میرے خاندان والوں پر کچھ اچھلا ہے، ہماری

شرافت کو گالیاں دی ہیں جب مجھے اس کے بزرگوں سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ نہیں مل سکتا تو

پھر میں اپنے دل کا دروازہ کیوں کھولوں؟“

کامران نے کہا۔ ”عورت کا کیریکٹر سرٹیفکیٹ اس کا شہر ہوتا ہے۔ میں یقین دلاتا

ہوں کہ میرے رویے سے گھروالوں کا رویہ تبدیل ہو جائے گا۔ میں چاہوں گا تو گھر والے

چاہیں گے ایک باغ کا مال، جتنی لگن سے باغ کو پیچھے گاڑتے ہی خوبصورت پھول کھلتے جائیں

گے اور میں اپنے لو سے پھولوں کی جنت کو پہنچتا رہوں گا۔“

اس نے چلو میں بھرے ہوئے لو کو ایک طرف چمڑک دیا۔ جہاں لو جا کر گر ا،

وہاں پھول کھلنے لگے پھر اس نے اپنے دل کی طرف ہاتھ رکھا۔ وہاں خنجر بیوست تھا اور لو

رس رہا تھا۔ چلو پھر خون سے بھر گیا۔ اس نے دوسری طرف اپنے خون کو چمڑکا وہاں بھی

پھول کھلنے لگے۔ وہ لو سے پیچھا جا رہا تھا۔ پھول کھلتا جا رہا تھا اور کہتا جا رہا تھا۔ ”میں

انکے انداز کی خودکشی کروں گا۔ مجھ میں مر جاؤں گا۔ اپنا خون دیتا جاؤں گا۔ دوسرے

انسانوں کی زندگیوں کو پھولوں کی طرح کھاتا جاؤں گا تاکہ میرے بعد بھی محبت مر نہ سکے۔

دوسروں کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہے۔“

منصف اعلیٰ نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”ادب ادب! بہت ہو چکا۔ اس سے

پہلا کہ کوئی بے موت مر جائے ضمیر کا فیصلہ ہے کہ حسن اپنی شکست تسلیم کر لے۔ درندہ

محبت کا لو صرف پتھروں کو نہیں فولاد کو بھی پھول بنا دیتا ہے۔“

کامران نے ایک پتھر چمڑا لو اپنے دل سے لیا اور اسے مونا کی طرف اچھلا دیا۔ وہ

سرخ فولادی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ لو کے چھینٹے پڑتے ہی وہ پھولوں کی زنجیریں

بن گئیں۔

اس نے یکبارگی چونک کر دیکھا، کوئی منصف اعلیٰ نہیں تھا، وکیل نہیں تھا اور نہ ہی

ضمیر کی عدالت کا کمرہ تھا۔ وہ ہسپتال کے کمرے میں تھی۔ اس کے سامنے کامران بستر پر ڈا

ہوا تھا اور محبت کے نام پر خون کا عطیہ دے رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ بستر کے سرے پر بیٹھ

گئی اپنے سر کو جھکا لیا، جیسے ضمیر کی عدالت کے فیصلے کے آگے جھک گئی ہو۔ پھر اس نے

ٹہراتے ہوئے جھجکتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔

☆-----☆-----☆

محبت کا مسئلہ کبھی آسمانی سے حل نہیں ہوتا۔ ایک قسمی سلجھانے کے بعد دوسری

المنحی جلی جاتی ہے۔ مونا اگرچہ جانی جانی سے اس کی ہو گئی تھی پھر بھی اسے شریک حیات

بنانے کا مسئلہ درپیش تھا۔

کتنے ہیں میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی؟

حالانکہ بے چارہ قاضی ہر حال میں راضی رہتا ہے کیونکہ اس کا کام ہی نکاح پڑھانا

ہے۔ دراصل لڑکے اور لڑکی کے والدین راضی نہیں ہوتے۔ کامران انہیں راضی کرنے

لے۔ لے۔ مٹیں کر رہا تھا۔ ”دیکھنے محی! مجھے یہاں سے جانے کے لیے صرف سات دن رہ

”وہ میرے گھر آئیں گے تو میں انہیں عزت سے بٹھاؤں گا۔ یہ اپنے اپنے عرف کی بات ہوتی ہے۔“

اس بحث میں دو دن اور گزر گئے۔ کامران نے پریشان ہو کر کلمہ ”یہاں! صرف چار دن رہ گئے ہیں۔ آج سے چار دن بعد ٹھیک پانچویں دن میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ صرف اتنی سی بات کے لیے کہ جس شخص کو اپنے گھر سے نکال دیں“ اس کے گھر میں رشتہ نہیں مانگتے جائیں گے“ یہ کہی شدہ ہے؟“

اس کی والدہ نے کلمہ ”ایک دن تم نے کہا تھا کوئی کسی کی مرضی کے بغیر اس کے دل میں نہیں ہا سکتا۔ کوئی کسی ملک کی زمین پر قانونی اجازت کے بغیر قدم نہیں رکھ سکتا اور تم نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ میرا گھر ہے۔ میں یہاں کی مالک ہوں۔ میری اجازت کے بغیر کوئی یہاں نہیں آ سکتا۔ پھر تم میری اجازت کو تسلیم کیوں نہیں کرتے چونکہ میں یہاں کی مالک ہوں۔ میں اپنی مرضی سے“ اپنی ہند سے بولاؤں گی۔“

اس نے بے بسی سے کلمہ ”اس کا دل جیتنے میں اتنے دن گزر گئے۔ اب اس کے گھر کا ویزا حاصل کرنے کے لیے تم نہیں کتنے دن ضائع کرنے ہوں گے۔“

”کیوں ہمارے پیچھے وقت ضائع کرتے ہو۔ آج کل کے جوان چھو کرے تو لڑکی کا ہاتھ پکڑتے ہیں اور کورٹ صریح کر لیتے ہیں۔ جاؤ، تم بھی کر لو۔“ بنوئی نے کلمہ

مجھے ایسا کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر لیتا۔ میں اخلاقی پابندیوں میں رہنا چاہتا ہوں۔ آپ لوگوں کی اجازت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ نے آج شام تک اپنی رضامندی ظاہر نہ کی تو میں آج ہی جا کر کل کا ٹکٹ لوں گا اور یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

اس کی آپائے نے کلمہ ”یہ تم نہیں بول رہے ہو“ اس لڑکی کی زبان بول رہی ہے۔ ابھی شادی نہیں ہوئی تو یہ حال ہے کہ چار دن پہلے ماں باپ کو چھوڑ کر یہاں سے چاہتے ہو۔“

”آپ بات کا بیچھڑو بنائیں۔ اگر اس کی زبان بولتی تو اس سے بھی زیادہ نرم اور محبت بھرے لہجے میں بولتی میں بھی کوئی بغاوت نہیں کر رہا ہوں۔ چار دن پہلے یہاں سے جانے کا ارادہ کر کے آپ لوگوں کی خدمت کے خلاف خاموش احتجاج کر رہا ہوں۔ مجھے اس

گئے ہیں۔ پلیز ان کے ہاں جا کر رشتہ مانگئے۔“

”ہرگز نہیں۔ اس روز ہم نے لڑکی کے بنوئی کو کھری کھری سناٹی تھیں اب وہاں جائیں گے تو وہ بھی سمجھیں گے کہ ہم معافی مانگتے آئے ہیں۔“

”معافی مانگنے کی بات نہیں ہے۔ آپ ان سے صرف اتنا کہہ دیں گی کہ آپ کو ان کے سلسلے میں غلط فہمی ہوئی تھی تو بات ختم ہو جائے گی۔ خلیل احمد صاحب بڑے فراعذل ہیں۔ وہ آپ لوگوں کی بے حد عزت کریں گے۔“

اس کے پیانے نے کلمہ ”ہو ہمارے معیار کے مطابق نہ ہو اور جس سے ایک بار پنج گلائی ہو چکی ہو، ہم اس کے گھر نہیں جا سکتے۔ تیس ایک نہیں ہزار بار سمجھا چکے ہیں۔ وہ لالچی لوگ ہیں۔ انہوں نے تیس مختلف انداز سے چنانے کی کوشش کی ہے اور وہ کامیاب ہو رہے ہیں۔ ہم تمہاری طرح نادان نہیں ہیں۔ ہم ان میں پھنسا نہیں چاہتے۔“

ماں نے کلمہ ”میری ماں لو۔ میں نے ایسی لڑکی دیکھی ہے کہ تو دیکھے گا تو موت کی ضد بھول جائے گا۔ اس شرمیں وہی ایک ہو رہی نہیں ہے۔“

دوسری طرف موت کی آپا ناراض ہو کر سمجھا رہی تھیں۔ ”اس شرمیں لڑکوں کی کمی نہیں ہے۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ اس کامران کا خیال دل سے نکال دے۔ وہ سات سمندر پار سے آیا ہے۔ سات دنوں کے بعد چلا جائے گا۔ بھلا یہ کبھی کوئی بات ہوئی کہ آج شادی کرے گا اور کل چلا جائے گا۔ گویا یہ کھیل ہو کہ کھیل اور سات سمندر پار جا کر بھول گیا اور یقیناً وہ بھول جائے گا تو یہاں بیٹھی اپنے نصیبوں کو روتی رہے گی۔“

خلیل احمد نے موت کی حمایت میں کہا ”اسی کوئی بات نہیں ہے۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ روزگار کی خاطر ملک سے باہر جاتے ہیں۔ یہاں سے شادیان کر کے چلے جاتے ہیں اپنی نو بہیاں دلتوں کو چھوڑ کر جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دلتوں میں اپنے نصیبوں کو روتی رہتی ہے۔ جب وہ اپنا نصیب اپنے شوہر کے ہاتھ میں دے دے تو وہ تو کس بات کا؟“

”آپ ان کی حمایت میں کہہ رہے ہیں۔ کیا اس گھر میں میری بہن کو بھیجتا چاہتا ہیں جس کے یکمیں نے آپ کی بے عزتی کی۔ اپنے گھر سے نکال دیا۔“

لڑکی سے تمام زندگی کے لیے چھڑایا جا رہا ہے۔ میں آپ لوگوں کو صرف چار دن پہلے چھوڑ کر جانا چاہتا ہوں۔ مگر آپ کا بیٹا ہوں۔ واپس ضرور آؤں گا لیکن کل ضرور جاؤں گا لہذا شام تک فیصلہ سنا دیا جائے۔“

اس نے ایک طرح سے وارننگ دی۔ پھر اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ اس کی مٹی نے تشویش بھری نظروں سے اس کے پایا کو دیکھا، انہوں نے کہا۔ ”لڑکے جو ان ہو جائیں۔ خود کمانے لگیں تو اپنے فیصلے آپ کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، میں بیٹے کی پسند کے آگے جھکنایا پڑے گا۔“

”آپ ذرا سی بات پر بہت ہار جاتے ہیں۔ میں ابھی لڑکی والوں کو فون کرتی ہوں، دیکھتی ہوں یہ کیسے راضی نہیں ہو۔ کتنی لاکھوں میں ایک ہے۔ ہمارا بیٹا اسے دیکھے گا تو دیکھائی رہ جائے گا پھر دولت ہے، جائیداد ہے، اکیلی وارث ہے، سب ہمارے کامران کا ہو گا۔ آخر یہ لڑکا سات سمندر پار کیوں گیا ہے؟ کمانے گیا ہے؟ تاکہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرے۔ جب گھر بیٹھے لڑکی سب کچھ لے آئے گی تو اسے سمندر پار جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

ہماری دنیا میں اکثر رکاوٹیں بے بنیاد ہوتی ہیں۔ ایسی رکاوٹوں کے سامنے پہنچ کر انسان سوچتا ہے، کوئی غیر قانونی، ناجائز اور کوئی غیر مندرج طریقہ اختیار کرے اور اپنی بات منوالیا۔ موتا کے گھر کے سامنے ایک خوبصورت سی جیتی کار کھڑی ہوئی تھی۔ اس کار میں آنے والے مہمان ڈرامنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ موتا کے ہسپتال کا ایک ڈاکٹر اپنی والدہ، بھالی اور بہن کے ساتھ آیا ہوا قتلہ موتا کی آپاں کی خاطر ہمدردت میں ان کے آگے چھٹی جا رہی تھیں۔ کہہ رہی تھیں۔ ”شادی ایسی ہو کہ میاں بیوی اپنا گھر آباد کر سکیں۔ یہ کیا ہے کہ شادی ہوتے ہی میاں کمانے کے لیے ملک سے باہر چلا جائے اور بیوی برسوں بیٹھی انتظار کرتی رہے۔ میرے ہاں موتا کے لیے ایسے رشتے آرہے تھے۔ میں نے تو صاف انکار کر دیا۔“

ڈاکٹر کی والدہ نے کہا۔ ”میرے بیٹے نے موتا کی اتنی تعریفیں کی ہیں کہ بس میں دیکھنے چلی آئی، کہاں سے وہ ذرا میں بھی تو دیکھوں۔“

خلیل احمد نے کہا۔ ”ابھی آ رہی ہے۔ جب آپ لوگوں کے آنے کی اطلاع ملی تو بہت خوش ہوئی۔ پکڑے تلنے گئی ہے۔ دراصل مجھے پکڑے بہت پسند ہیں۔“

موتا کی آپا نے اپنے شوہر کو گھور کر دیکھا۔ پھر بات بناتے ہوئے کہا۔ ”دراصل موتا کو بہترین پکوان کا شوق ہے۔ آپ اس کے ہاتھ کی کوئی بھی ڈش چھینیں گی تو انگلیاں چاٹتی رہ جائیں گی۔“

ڈاکٹر کی ماں نے کہا۔ ”میں ایسی ہو نہیں چلاہیے۔ جو چلے ہانڈی میں لگی رہے۔ ہمارے خاندان میں سبھی ڈاکٹر ہیں۔ یہ میری بڑی بیوی بھی لیڈی ڈاکٹر ہے، میرا بڑا بیٹا بھی ڈاکٹر ہے۔ یہ میری بیٹی ہے اس کا دل بڑھائی میں لگتا نہیں ہے اس لیے ہم اسے ڈاکٹر نہیں بنا سکتے۔ میرے بیٹے کی ضد ہے کہ بیٹی کی جگہ ہونے والی ہو کہ وہ ڈاکٹر بنادوں۔“

موتا کی آپا نے کہا۔ ”لیکن وہ تو.....“

ڈاکٹر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے۔ موتا نے ہسپتال میں نرس کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرنے کے دوران بتایا تھا کہ اس نے میڈیکل کے فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا تھا لیکن حالات سازگار نہیں تھے اس لیے تعلیم کھوئی کرنا پڑی۔ اسی لیے اس ہسپتال میں ملازمت کر رہی ہے تاکہ اپنے اخراجات خود برداشت کرے اور آئندہ سال میڈیکل میں داخلہ لے۔ پھر کیوں نہ یہ کام ہمارے ذریعے ہو جائے۔“

ڈاکٹر کی والدہ نے کہا۔ ”ہم میاں سے سو بنا کر لے جائیں گے۔ چھ ماہ بعد ہی داخلے شروع ہونے والے ہیں اور میڈیکل کالج میں داخل کرنا ہمارے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ موتا جانے اور ناشتہ ٹرائل میں لا رہی تھی۔ اس نے مہمانوں کو سلام کیا۔ اس کی آپا نے تعارف کرایا۔ ”یہ میری چھوٹی بہن موتا ہے۔“

ڈاکٹر کی والدہ نے تعریفی انداز میں اسے دیکھا۔ پھر کہا۔ ”ہاشاء اللہ، بیسیا سنا تھا ویسی ہی ہو۔ لیڈی ڈاکٹر بننے کے بعد بہت زیادہ امائرٹ لگو گی۔“

موتا نے ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے مجھ سے کہا تھا، اگلے ماہ امریکہ بار ہے ہیں۔“

”اعلیٰ تعلیم کے لیے جا رہا ہوں۔ ہمارے خاندان میں یہی ہوتا ہے۔ ہم یہاں ہاؤس جاب کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے کسی مغربی ملک میں چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے کسی ایک مرض کے علاج کے اسپیشلسٹ بن کر آتے ہیں تو ہمارا ریٹ بڑھ جاتا ہے۔ صرف ایک مریض کو دیکھنے کی فیس سو اور دو سو روپے ہوتی ہے۔ ورنہ پاکستان میں کیا ہے۔ یہاں عام کلینک کے ڈاکٹر ایک مریض سے پانچ روپے یا دس روپے لیتے ہیں۔ ان سے زیادہ تو فٹ پاتھ کے دوا فروش کما لیتے ہیں۔ ان کا کوئی معیار زندگی نہیں ہوتا ہے۔“

مونا نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”معیار زندگی کی بات نہیں ہے۔ یہ برنس کی بات ہے۔ ڈاکٹر تو بے بن جاتے ہیں۔ برنس میں آپ جیسے لوگ ہی بن سکتے ہیں۔“ اس کی والدہ نے کہا۔ ”اس میں کیا شک ہے۔ ہم بہت سوچ سمجھ کر پلاننگ کرتے ہیں۔ اسی لیے ہمارے خاندان کے بیٹے ہونیس سبھی بڑے ڈاکٹر ہیں۔“

مونا اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر بولی۔ ”میں نے نرس کی ملازمت اختیار کی۔ اب بھی حوصلہ ہے کہ آئندہ میڈیکل میں داخلہ لوں لیکن کاروبار کے لیے نہیں“

یہ کہتے ہوئے وہ اپنی آگے قریب سے گزرنے لگی۔ وہاں رک کر بولی۔ ”آپ! آپ مجھے ایسی جگہ بتانا نہیں چاہئیں جہاں لڑکا دوسرے ملک جا کر رہے اور ہمارے ڈاکٹر صاحب بھی اگلے ماہ جانے والے ہیں۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ تم بڑوں کے بیچ میں نہ بولو۔“ اس کی آبا اٹھ کر کھڑی ہو گئیں پھر اس کے قریب آ کر سرگوشی میں بولیں۔ ”کیا بے شرمی ہے۔ کیا رشتہ مانگتے والوں کے سامنے ہماری لڑکیاں اس طرح بولتی ہیں۔“

”کوئی لڑکیوں کا دور گزر چکا ہے۔ زندگی ہمیں گزارنا ہے۔“

ڈاکٹر کی والدہ نے پوچھا۔ ”بھئی یہ دونوں بہنوں میں کیا سرگوشیاں ہو رہی ہیں؟“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مئی! مونا نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا ہے۔ ویسے میں نے اسے ہسپتال میں بھی سمجھایا تھا اور اب بھی سمجھاتا ہوں۔ آدمی کو اس طرح جینا چاہیے کہ کاروبار بھی ہو اور انسانوں کی خدمت بھی ہو۔ کیا ہم اسپیشلسٹ بن کر انسانوں کی خدمت

نہیں کرتے ہیں؟“

مونا نے اس کی طرف پلٹ کر کہا۔ ”پچھلے خدمت کرتے ہیں۔ اسپیشلسٹ کی فیس ان کی تجویز کی ہوئی دوائیں، انکسرس، خون اور دنیا بھر کی میڈیکل رپورٹیں اتنی مہنگی ہوتی ہیں کہ ایک غریب آدمی اپنا خون بیچ کر بھی ان سے علاج نہیں کر سکتا۔ محف جیے گا، ڈاکٹر! میں نے ایک ایسے شخص کا انتخاب کیا ہے جو دوسروں کا خون نہیں چوڑتا بلکہ دوسروں کو اپنا خون دیتا ہے۔“

وہ کوئی جواب سے بغیر تیزی سے چلی گئی۔ اس کی آبا کبھی پریشان ہو کر اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی اور کبھی ممانوں کا منہ بے بسی سے دیکھتی رہی۔

☆-----☆-----☆

وقت کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ کامران کی بدحواسی بڑھتی جا رہی تھی، بچوں لگ رہا تھا بیٹے وقت اس کا مذاق اڑا رہا ہے، پہلے تو کبھی اتنی تیزی سے نہیں گزرتا تھا جیسے اب اس کا منہ چڑاتا ہو کر رہا تھا۔ چھوڑ کر رہا تھا۔ چھوڑ کر رہا تھا۔ دلوں کو اپنی کامیابی کا یقین ہوتا ہے لیکن جو کچھ دار ہوتے ہیں وہ نکالی کی بھی توقع رکھتے ہیں، ایسے میں کامران سوچ رہا تھا، اگر اسے ناکام داپہں جانا پڑا تو مونا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت تو گزارے تاکہ پردیس میں پہنچ کر جب بھی یادوں کی الم کھولے تو گزرا ہوا خوبصورت وقت نظر آتا رہے۔

وہ دونوں ایک طرف تو اپنے اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ دوسری طرف کہیں نہ کہیں ملاقات کرتے تھے تاکہ اپنی جدوجہد کی رپورٹ ایک دوسرے کو سنا سکیں۔ مونا نے کہا۔ ”آج خاندانی ڈاکٹروں کے ہاں سے ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔“

”ابھی شام کو میرے ہاں لڑکی والے آئیں گے اسی لیے میں چلا آیا ہوں۔ دیر سے کمر جاذب گدہ ہے چارے اپنا سامنے لے کر واپس چلے جائیں گے۔“

”بے چارے نہ کو، بے چاری کو۔ کیا جبر تھا، اسے دیکھ لیتے شاید وہ مجھ سے

خوبصورت ہوتی، مجھ سے اچھی ہوتی۔“

”مورت کسی نہ کسی بہانے اپنی تعریف سننا چاہتی ہے اب تمہارے جواب میں یہی کہوں گا کہ تم سے اچھی اور تم سے خوبصورت کوئی اور نہیں ہے۔ جب چاہئے والا سوچ سمجھ کر دل دے چکا ہے اور چاہتا آ رہا ہے تو کیا پھر بھی تعریف کرنا ضروری ہے؟“

”بہت ضروری ہے۔ صرف ایک ہی شخص کو اپنی تمام کائنات سمجھنے والی عورت ایک ملاؤں گرل کی طرح اشتہار بین کر ساری دنیا سے داد وصول نہیں کرتی۔ صرف اپنے چاہنے والے کی زبان سے اپنی تعریف سنتی ہے اور بس۔“

کامران نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر حلقیہ انداز میں کہل۔ ”میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں۔ اگر تعریف کرتے رہنے سے تم مجھ سے مل سکتی ہو تو آج سے تم پر تعہد ہے لکھنے کے لیے شاعر بن جاؤں گا اس کے لیے لازم ہے کہ تم میری نظریں میرے گھر میں رہو۔ میں تمہیں گھر میں لانے کے لیے پاگل ہو رہا ہوں۔ اگر تم نہ ملیں تو دنیا کو پاگل بنا دوں گا۔“

”مجھ میں نہیں آتا۔ ہم اپنے بزرگوں کو کیسے سمجھا میں۔ ہم اپنے شرعی حقوق حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کرنا چاہتے ہیں تو ان کی نظروں میں باقی ٹھہرائے جاتے ہیں۔“

”صرف باقی نہیں، بلکہ بگڑی ہوئی نسل کھلاتے ہیں۔ وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے جسم بوڑھے ہوتے ہیں تو دماغ بھی بوڑھا ہو جاتا ہے ان کی سوچ بھی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ ان کے فیصلے بھی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔“

”ایسی بات نہیں ہے۔ ہمارے بزرگ برس برس کے تجربوں کی روشنی میں فیصلے کرتے ہیں۔ درست فیصلے کرتے ہیں۔ ہاں بعض فیصلے غلط ہو جاتے ہیں۔“

کامران نے کہل۔ ”میرا خیال ہے۔ یہ ایک نفسیاتی مسئلہ ہے۔ جب انسان بوڑھا ہوتا ہے اور اپنے سامنے ایک نئی نسل کو جو ان ہوتے دیکھتا ہے تو جس جوانی کو وہ کھودتا ہے اسے دوسروں کو حاصل کرتے دیکھ کر رقاہت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔“

مونا نے کہل۔ ”ادھر تم باہر نفسیات بنے رہو گے ادھر تمہارا وقت گزرتا جائے گا۔“

اب تمہارے جانے میں دن کتنے رہ گئے ہیں؟“

”سارا قصور تمہارا ہے۔ تم پہلے ہی دن اپنے دل میں جگہ دے دیتیں تو اتنا وقت کبھی ضائع نہ ہو گا۔“

”جب دل چاہتا ہے تو دل دیا جاتا ہے۔ میں کیا کروں۔ میرے دل نے دیر سے فیصلہ کیا۔“

”کبھی کبھی جھنجھلا کر سوچتا ہوں، تمہیں یہاں سے بھگالے جاؤں۔“

”میں بھاگنے والی لڑکیوں میں سے نہیں ہوں۔ کالی، ہم کبھی ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے جس سے ہمارے بزرگوں کو چین ہو۔ ہمیں اس سراج میں زندہ رہنا ہے، عزت آبرو سے ایک دوسرے کے جیون ساتھی بنیں گے تو سوسائٹی میں ہماری عزت رہے گی۔“

وہ شام کی تاریکی پھیلنے تک سمندر کے کنارے ٹہلتے رہے اور مستقبل کے متعلق منصوبے بناتے رہے، کوئی راستہ بھٹکی نہیں دے رہا تھا۔ آخر وہ سات بجے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ صدر کے علاقے میں پہنچ کر کامران نے کہل۔ ”ہم رات کا کھانا کھا کر چلیں گے۔“

”بہت گھوم چکے۔ ہمارے گھر والے پریشان ہوں گے۔“

”گھر والوں نے بھی ہمیں پریشان کیا ہے۔ میں اتنی جلدی واپس نہیں جانا چاہتا۔ وہ ایک ریستوران میں آئے۔ کامران نے کھانے کا آرڈر دینے کے بعد پوچھل۔

”مونیا یہ تباؤ اس بار میں تمہیں شریک حیات نہ بنانے کا تو ہمارا کیا ہو گا؟“

”ہونا کیا ہے میں تمہارا انتظار کرتی رہوں گی۔“

”میں سال، دو سال بعد آؤں گا۔ تم اپنی آپا اور بہنوئی کے رحم و کرم پر ہو، کیا میرا انتظار کر سکو گی؟“

”میں کسی کے رحم و کرم پر نہیں ہوں۔ اپنی زندگی آپ گزارنا چاہتی ہوں۔ آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گی۔ تمہارے نام پر بیٹھی رہوں گی۔“

”آج تک میں نے کسی شریک حیات کے متعلق سوچا تک نہیں تھا۔ اب تمہارے لیے ایک گھر بنانے کا خواب دیکھتا رہوں گا اور اس خواب کی تعبیر کے لیے تمہارے نام پر

اشارت کیا۔ موناس کے پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ بڑی احتیاط سے بیٹھتی تھی۔ کامران کو دل و جان سے چاہنے کے باوجود سنبھل کر ہٹ کر بیٹھتی۔ بہت مجبور ہو کر اپنا ایک ہاتھ اس کے شانے پر رکھتی تھی۔ موثر سائیکل کی تیز رفتاری سے ڈر لگتا تھا وہ نہ ایک ہاتھ کی بھی دوستی نہ کرتی۔ پچھلے دو چار دنوں میں کامران نے جب بھی کسی ہمارے اس کے ہاتھ کو تھامنا چاہا تو اس نے بڑی خوبصورتی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ کامران نے پوچھا۔

”کیا تم مجھے اپنا نہیں سمجھتی ہو؟“

”سمجھتی ہوں۔“

”پھر شرماتی ہو؟“

”کیا شرمناک بات ہے؟“

”بڑی بات تو نہیں ہے لیکن چاہنے والے کے لیے یہ معصیت بن جاتی ہے۔“

”معصیت ہمیشہ بری لگتی ہے۔“

”تم بھند ہو تو مان لیتا ہوں۔ تمہاری شرم و حیا بری لگ رہی ہے۔“

”کیا خوب‘ مطلب پورا نہ ہو تو اچھی چیز بری لگتی ہے۔“

کامران نے سوچا‘ ذہین اور تعلیم یافتہ لڑکی سے بحث کرنے سے بہتر ہے‘ حالات کے ذریعے اسے مجبور کیا جائے‘ جب وہ پہلی بار موثر سائیکل پر بیٹھی تو تیز رفتاری کے باوجود اس نے صرف ایک ہاتھ کا سہارا لیا۔ کامران شرارتیں کرتا رہا۔ کبھی رفتار بڑھا دیتا تھا اور کبھی بڑے ہی خطرناک موڑ لگاتا تھا اس پر بھی وہ سنبھلنے کی کوشش کرتی تھی۔ بہت زیادہ ہوا تو وہ سراسر ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر اپنا توازن قائم رکھتی تھی۔

ایک مقام پر کامران نے اچانک ہی بریک لگائے اور ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ ظاہر ہے ایسے میں وہ سنبھل نہیں سکتی تھی۔ چیخ مار کر اس پر آڑی‘ اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے اس کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی۔ پھر دوسرے ہی لمحے الگ ہو کر اپنے آپ کو یوں سینٹھ لگی جیسے چھپنے کی جگہ ڈھونڈ رہی ہو۔ کار ہوتی تو شاید وہ کسی گوشے میں سمٹ جاتی۔ موثر سائیکل میں گھماؤ نہیں تھا۔

اس نے کہا۔ ”سوری“ میں مجبور تھا تم دیکھ رہی ہو اگر اچانک گاڑی نہ روکتا تو

محنت کرتا رہوں گا۔“

دیکھ لگتا ہے آیا‘ اس کے جانے کے بعد کامران نے کہا۔ ”بہت زیادہ سنجیدہ ہو گئے ہیں۔ ابھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے چار دن باقی ہیں۔ چلو‘ کھانا شروع کرو۔“

”تم نے گھر والوں کو دھمکی دی ہے کہ ہمارے حق میں فیصلہ نہ ہو گا تو کل سویرے سے ہی چلے جاؤ گے۔“

”انہوں نے میری بات نہیں مانی تو میں گھر سے فون کے ذریعے مختلف ٹریپنگ ایجنٹس سے رابطہ قائم کروں گا۔ کسی نہ کسی فلائیٹ میں اپنے لیے سیٹ ریزرو کرالوں گا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے جانے میں چار دن بھی نہیں رہے۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔“

”خدا نہ کرے۔ یہ آخری ملاقات ہو۔ تم بہت جلد مایوس ہو جاتی ہو۔“

”مایوسی کی بات ہر حال میں ہے۔ چاہے ہماری شادی ہو سکے یا نہ ہو سکے۔“

”میں نہیں سمجھ سکتا۔ فرض کرو ہماری شادی ہو جاتی ہے پھر مایوسی کیسی؟“

اس نے نظریں جھکا لیں۔ پھر آہستگی سے کہا۔ ”صرف چار دن رہ گئے ہیں۔ پتا نہیں کب ہمارے بزرگ مائیں گے‘ کب شادی ہوگی۔ اگر ہوگی تو ہم کتنی دیر ساتھ رہ سکیں گے۔ شاہراہ کی ایک صدی ایک پل میں گزر جاتی ہے اور جدائی کا ایک پل صدیوں میں گزرتا ہے‘ تم مجھے اپنا کر چلے جاؤ گے تو تمہاری دہائی تک مجھ پر کیا کیا قیاسیں گزریں گی۔ یہ ابھی خود نہیں جانتی۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ تم جاؤ اور میں تمہارے انتظار میں بوجھ ہو جاؤں۔“

”کیسی باتیں کرتی ہو‘ شادی ہوتے ہی تم اپنا پاسپورٹ بنوا لیتا‘ میں وہاں پہنچتی ہوں‘ تمہیں ملانے کے سلسلے میں جو بھی قانونی معاملات ہوں گے‘ ان سے جلد سے جلد نمٹنے کی کوشش کروں گا اور تمہیں فوراً اپنے پاس بلاؤں گا۔“

وہ کھانے کے بعد دستور دان سے باہر آئے۔ اس نے موثر سائیکل سنبھالی۔ اسے

حادثہ پیش آسکتا تھا۔

اس نے دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر اسے آگے بڑھا دیا۔ ذرا دور جا کر محسوس کیا 'وہ سسک رہی ہے۔ اس نے عقب نما آئینے کا رخ بدل کر اس کی جانب دیکھا۔ وہ منہ پر آئینل رکھ کر رو رہی تھی۔ اس نے سڑک کے کنارے گاڑی روک کر حیرانی سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

وہ کچھ نہ بولی۔ آئینل سے آنسو پونچھے گی۔ اس نے پھر پوچھا۔ "بھئی، کچھ معلوم تو ہو کیا ہوا؟"

اس نے منہ پھیر کر کہا۔ "کچھ نہیں۔ جان بوجھ کر گاڑی روکی تھی، کوئی حادثہ نہیں ہو رہا تھا۔"

کامران نے ہنسنے ہوئے کہا۔ "وہ خوبصورت حادثہ تو پیش آیا جس سے تم کترا رہی تھیں۔"

اس نے فاتحانہ انداز میں گاڑی گئیر میں ڈالی پھر اسے آگے بڑھا دیا۔ چٹک مرو بیش فاتح ہوتا ہے لیکن جیت لینے میں اور جبر کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

محبت میں عورت جبر کو پسند کرتی ہے لیکن صبر سے پسند کرتی ہے۔ جسے وہ جان سے زیادہ چاہتی ہے اس کے لیے اپنی ذات کو ایک خزانے کی طرح چھپا کر رکھتی ہے اور چاہتی ہے کہ چاہنے والا پہلے تہذیب کا اجازت نامہ حاصل کرے پھر اسے دریافت کرے۔

وہی اس کے آنسوؤں نے کامران کو سمجھا دیا تھا کہ وہ صبر کر سکتا ہے جبر نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد پھر کبھی شرارت نہیں کی۔ بڑی شرافت سے موڑ سائیکل چلا تا رہا۔ اس کے باوجود وہ بڑی قحط ہو کر بیٹھتی رہی۔ گلی نمبر ۱۵ میں پہنچ کر وہ ہچکرنے لگے۔ کامران نے کہا۔ "یہ رات بھی گزر جائے گی مگر غم نہیں آئے گی۔ یہی فکر ستائے گی کہ ہرگز نہ والا کل بڑی تیزی سے آج بن کر گزر رہا ہے۔"

"تم ایک ایک دن گزرتے دیکھ رہے ہو اور میں ایک عمر گزرتے دیکھ رہی ہوں۔ جانے کیا ہونے والا ہے۔"

اس نے بڑے عزم سے کہا۔ "آج تو میں کوئی فیصلہ کر کے ہی رہوں گا۔"

وہ موتا سے رخصت ہو گیا۔ جب گھر پہنچا تو رات کے نوج رہے تھے۔ لڑکی والے ٹام کو آنے والے تھے لیکن دروازے تک پہنچا تو وہاں ایک بہت ہی قیمتی سیر کنڈیشنر کار نظر آئی۔ اندر ہنسنے بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ ماں نے خوش ہو کر کہا۔ "آگیا، میرا بیٹا۔ میں جانتی تھی، وقت پر آئے گا۔"

وہ تیزی سے کامران کے قریب آئیں۔ پھر سرگوشی میں بولیں۔ "انہوں نے شام کو ہی فون کر دیا تھا کہ دیر سے آئیں گے۔ میں نے بھی جھوٹ کہہ دیا کہ تم بھی دیر سے آؤ گے۔ جو ضرورت مند ہوتے ہیں، وہ وقت پر آکر انتظار کرتے ہیں۔ لڑکی والے ضرورت مند ٹھہرے۔ وہ تم سے پہلے آکر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔"

وہ اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچے ہوئے مہمانوں کے درمیان لے گئیں۔ پھر ان سے تعارف کرانے لگیں۔ لڑکی کا نام قرۃ العین تھا۔ یعنی کلماتی تھی۔ وہ حسین بھی تھی، 'اسٹارٹ بھی' ہر اعتبار سے جاذب نظر تھی۔ ایک بات جو پسند نہیں آئی وہ اس کی بے تکلفی تھی۔ متعارف ہونے کے دوران یعنی نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا تھا، اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے اسے متاویذ آ رہی تھی۔ اس کی اصطلاح اور دنیا کی اہمیت کا اندازہ ہو رہا تھا کہ جو چیز آسانی سے ہاتھ آجاتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی۔ یعنی کے علاوہ اس کا ایک کزن اور والدین تھے۔ ان سے بھی باری باری تعارف ہوا۔ پھر یعنی نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مسٹر کامران! آپ کا عاقبانہ تعارف ہو چکا ہے لیکن لائف پارٹنر بننے کے لیے ایک دوسرے کو دیکھنا اور دیکھنے کے بعد سمجھنا نہایت ضروری ہے۔"

یعنی کی والدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھئی جہاں تک سمجھنے کی بات ہے تم کامران کے ساتھ آؤ کھانے کے لیے چلی جاؤ۔ وہ گئی دیکھنے کی بات تو ابھی دیکھ رہی ہو۔ کیا نیال ہے؟"

یعنی نے ایک ادوائے ناز سے صوفے کی پشت سے ٹپک لگاتے ہوئے مسکراتے ہوئے کامران کو دیکھا۔ پھر ایک لمبی "ہوں" کے ساتھ کہا۔ "ٹھیک ہے، صرف دیکھنے کے بعد میں مسٹر کامران کو ہنڈو میں سے فوری مارکس دے سکتی ہوں۔"

کامران نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے گفتگو کے دوران یہ فوری مارکس بھی کم ہو جائیں گے۔ کیا صرف غائبانہ تعارف ہوا ہے یا میرے متعلق معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ میں کن ہوں۔ کیا ہوں۔ کیا کرتا ہوں؟“

اس کی می نے پریشان ہو کر اسے دیکھا پھر کہا ”بیٹے! ہم نے ساری باتیں کر لی ہیں۔ جو بڑوں کی باتیں ہیں وہ بڑے کریں گے۔ تم دونوں اپنی باتیں کر دو۔“

”مجھے معلوم تو ہونا چاہیے کہ جو مجھے لائف پارٹنر بنانے کے لیے مارکس دے رہی ہیں انہیں میرے متعلق کتنی معلومات حاصل ہیں۔ کیا یہ معلوم ہے کہ میں لندن میں یا کسی ڈرائیور ہوں؟“

اس بات پر سب ہی چونک گئے، اس کی می پریشان ہو کر صوفے پر پہلو لے لے ہوئے اپنے شوہر کو دیکھنے لگیں۔ دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے بیٹا ڈوبا ہو اور وہ شوہر سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ شوہر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”بھئی ہمارا بیٹا کامران زندہ دل ہے۔ خواہ مخواہ ہی چونکا دینے والی باتیں کرتا ہے۔ دراصل وہاں اس کا کاروبار ہے۔“

کامران نے کہا۔ ”میں اپنے والد کی بات جھٹلا نہیں سکتا۔ جیک میرا ایک چھوٹا سا چلتا پھرتا کاروبار ہے۔ جس طرح یہاں جمعہ بازار منتقل کیا جاتا ہے اسی طرح وہاں آل گیٹ میں سنڈے بازار لگتا ہے، میرے پاس ایک سیکنڈ ہینڈ پرانی سی کار ہے۔ میں اس میں ضرورت کا سامان رکھ کر آل گیٹ جاتا ہوں، کار کے آگے پیچھے اور اس کی بھت پر ان چیزوں کو دکانداروں کی طرح سجا کر فروخت کرتا ہوں۔ یہ صرف ایک دن کا بلکہ چند گھنٹوں کا کاروبار ہوتا ہے۔ باقی پورا ہفتہ منی کیب کے ایک ادارے سے منسلک رہتا ہوں۔ جب وہ مجھے کال کرتے ہیں تو وہاں جاتا ہوں۔ میرے لائق کوئی کام ہوتا ہے، کسی مسافر کو کہیں پہنچانا ہوتا ہے تو منی کیب ڈرائیور کرتا ہوں۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی بیٹی ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہو گئی۔ ناگوار سی بولی۔ ”اگر یہ بھی چونکا دینے والی باتیں کر رہے ہو یا مذاق کر رہے ہو تو مجھے ایسا مذاق پسند نہیں ہے۔“

کامران نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”جو بات سب سے زیادہ کڑوی لگے

مجھ لو، وہ سچ ہے۔“

بیٹی کے ساتھ ساتھ اس کے والدین اور اس کا کزن بھی کھڑے ہو گئے۔ اس کے والد نے ناگوار سی بولی۔ ”آپ لوگوں کے لیے وقت قیمتی نہیں ہوتا ہمارے لیے ہوتا ہے۔ آپ نے ہمارا بڑا وقت ضائع کیا ہے۔“

انہوں نے بیٹی، بیوی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر وہاں سے جانے لگے۔ کامران کی می ان کے پیچھے چلتے ہوئے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ کامران نے ان کا ہاتھ پکڑ کر روکتے ہوئے کہا۔ ”ممی! رک جائیے۔ آپ اپنے بیٹا بڑا خاندان تلاش کر رہی تھیں۔ وہ بڑا خاندان کیا ہوتا ہے؟ کیا یہی کہ پردیس میں کوئی محنت مزدوری سے روزی حاصل کرے تو وہ چھوٹا ہو جاتا ہے؟“

اس کی می کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”پلیز! آپ میری بات کا جواب نہ دیں۔ کیونکہ ایک کے بعد دوسرے جواب دینے لگتے ہیں اور بحث کا سلسلہ چل پڑتا ہے جب سے یہاں آیا ہوں اس سلسلے میں کافی بحث ہو چکی ہے۔ میں صرف ایک بات کہتا ہوں۔ اسے مان لیں۔ اس کے بعد میں کچھ نہیں کہوں گا۔“

اس کے پیانے پوچھا۔ ”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

اس نے اپنی می کو ایک صوفے کے پاس لا کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہاں نہیں۔“

پھر اس نے اپنے پیانے کو مخاطب کیا۔ ”آپ وہاں اپنی جگہ بیٹھ جائیے پلیز۔“

پھر وہ اپنی آیا اور بیٹنی کا ہاتھ پکڑ کر لے آیا۔ انہیں بھی ایک صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولا۔ ”میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ یہاں بیٹھ جاتا ہوں اور آپ لوگوں سے درخواست کرتا ہوں، صرف پانچ منٹ کے لیے آپ سب خاموش بیٹھیں۔ رہیں۔ اپنا اپنا سر جھکا لیں اور اپنے ضمیر کو آواز دیں۔ اس سے پوچھیں، ہم نے ایک سیدھی سی بات کو اپنی اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے تو اس مسئلے کا حل کیا ہے؟ ہمارے اور آپ کے ضمیر کا جو فیصلہ ہو گا اسے میں بھی تسلیم کر لوں گا آپ بھی تسلیم کر لیں؟“

اس کے پیانے نے کہا۔ ”بیگم! سر جھکا کر بیٹھ جاؤ۔“

”کیا میں مجرم ہوں؟“

”جلیز“ اپنے بیٹے کی بات مان لو۔ یہ درست کہہ رہا ہے اگر ہمارا خمیر مردہ نہیں ہے۔ زندہ ہے تو پھر یقیناً ہم آج کسی صحیح نتیجے تک پہنچ سکیں گے۔“

یہ کہہ کر اس کے پیلا نے اپنے سر کو جھکا لیا۔ اس کی بہن اور بیٹھنی نے انہیں دیکھا تو وہ بھی اپنے اپنے سر جھکانے لگے۔ کارمان کا سر پہلے ہی جھکا ہوا تھا۔ اس کی می نے اس کی طرف محبت سے ’متا سے مگر مجبور سے دیکھا جیسے بیٹے کے سامنے بس نہ چلا ہو۔ پھر انہوں نے آہستگی سے اپنے سر کو جھکا لیا۔

ڈرائنگ روم میں گمری خاموشی چھا گئی تھی۔ وہ سب سر جھکانے اپنی اپنی جگہ بیٹھے ہوئے تھے۔ اپنے خمیر کو آواز دے رہے تھے۔ پھر وہ ماحول ڈھواں ڈھواں سا ہونے لگا۔ جب ڈھواں پھٹنے لگا تو عدالت کا کہر نظر آیا۔ پیچھے جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ”خمیر کی عدالت“ منصف اعلیٰ میز پر ہاتھ مار کر کہہ رہا تھا۔ ”ادب“ ”ادب“ یہ خمیر کی عدالت ہے۔ یہاں کا فیصلہ وہی تسلیم کرتے ہیں جو بیدار مغر اور وسیع القلوب ہوتے ہیں۔“

عدالت کے دو طرفہ کھروں میں ایک طرف مونٹا اور دوسری طرف کارمان لمڑوں کی طرح سر جھکانے کھڑے ہوئے تھے۔ سامنے ایک قطار میں کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ان پر کارمان کے پیلا، اس کی می، اس کی آپا، اس کے بیٹھنی، مونٹا کی آپا اور بیٹھنی وغیرہ سر جھکانے ہوئے بیٹھے تھے۔ منصف اعلیٰ نے کلمہ ”ان لمڑوں سے متعلق اعتراضات پیش کیے جائیں۔“

کارمان کے پیلا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کلمہ۔ ”اے منصف اعلیٰ! اس دنیا میں ہر شخص نیک نام رہ کر زندگی گزارنا چاہتا ہے، ہم اپنے آبائے اجداد کے زمانے سے اپنے خاندان کو ایک معزز اور شریف خاندان کتے آئے ہیں۔ بعض اوقات اپنی عزت کو اپنی شرافت کو برقرار رکھنے کے لیے تھوڑا جھوٹ بھی بولنا پڑتا ہے لیکن آج ہمارے بیٹے کی خد کے باعث ہماری خاندانی ساکھ بگڑ رہی ہے۔“

کارمان نے کلمہ۔ ”اے منصف اعلیٰ! میرے والد صاحب، جھوٹ بول کر ہم سے

بڑے خاندان میں، ایک امیر ترین خاندان میں میری شادی کر کے اپنے خاندان کی برتری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ میں لندن میں رہتا ہوں۔ ہفتے میں ایک دن چند گھنٹوں کے لیے ایک معمولی سا کاروبار کرتا ہوں۔ ورنہ منی کب کا ڈرا نیور ہوں۔ میرے والدین مجھے ایک بہت بڑا بزنس مین ظاہر کرتے ہیں۔ کیا جھوٹ بول کر اپنی برتری قائم رکھنا مناسب ہے؟“

اس کی آپا نے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے کلمہ ”سبھی جھوٹ بولتے ہیں۔ اس دنیا میں سبھی تو تے وقت کم تو لے ہیں۔ بولتے وقت زیادہ بولتے ہیں۔ اپنا چہرہ خوبصورت ہوا نہ ہو، کم پوڈر، اپ اسٹک اور کابلر سے بچے چہرے کو چھپاتے ہیں جو بے وہ نہیں اٹھاتے۔ جو نہیں ہے، اسے بنا سوار کر پیش کرتے ہیں۔ میرے بھائی کارمان کو بنا سوار کر پیش کیا جا رہا تھا۔ کیا یہ اپنے والدین کی عزت نہیں رکھ سکتا تھا؟“

”اگر بیڑوں کی عزت کرنے کے لیے یہ شرط شامل ہے کہ ان کے جھوٹ کا ساتھ دیا جائے تو میں ساتھ نہیں دے سکتا۔“

مونٹا نے کلمہ۔ ”ہمارے بزرگوں نے ہمارے ممبر کو اس حد تک آزمایا ہے جس کے بعد بچے باقی ہو جاتے ہیں مگر ہم نے بغاوت نہیں کی ہے۔“

کارمان نے کلمہ۔ ”ورنہ ہم بچے نہیں بالغ ہیں۔ ہمیں قانوناً نکاح پڑھوانے کا حق حاصل ہے لیکن ہم ان کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے اب بھی ممبر کر رہے ہیں۔ یہ ہماری سعادت مندی ہے۔“

اس کی می نے کلمہ۔ ”سعادت مندی کا ڈھونگ ہے۔“

مونٹا کی آپا نے کلمہ۔ ”اگر یہ سعادت مند ہوتے تو ہماری مرضی سے شادی کر لیتے۔“

کارمان نے احتجاج کیا۔ ”شادی ہم کریں گے۔“

مونٹا نے بھی احتجاج کیا۔ ”زندگی ہم گزاریں گے۔“

کارمان نے کلمہ۔ ”یہ بزرگ اپنی دنیا اپنی مرضی سے آباد کر چکے ہیں۔“

مونٹا نے بڑے عزم سے کلمہ۔ ”ہم اپنی مرضی سے اپنی دنیا آباد کرنا چاہتے ہیں۔“

کارمان نے دونوں ہاتھ اٹھا کر گڑگڑا کر روتے ہوئے فریاد کرنے لگا۔ ”یہ کیسا ظلم ہے“

ظہیر سو جائے گا۔ کل تمہارا بیٹا اپنی تمام حقوق کے ساتھ خالی ہاتھ سمندر پار چلا جائے گا۔ ظہیر تمہیں بے چین کرے گا۔ تم ظہیر کو تھک تھک کر سلاتا چاہو گے مگر خود تمہاری فہمیں اڑ جائیں گی۔ ایسا وقت آنے سے پہلے ہی میرا فیصلہ ہے کہ تمہارے ظہیر ابھی روشن ہو جائیں۔“

اس کے ساتھ ہی ان کے چروں کی تاریکی دور ہونے لگی۔ چہرے روشن ہونے لگے۔ وہ ایسے خوش نظر آ رہے تھے جیسے ایک طویل عرصے تک اندھیروں میں بہکنے کے بعد روشنی کا سراغ ملا ہو۔

دبی باوقار آواز گونج رہی تھی۔ ”اے بیٹیوں کے سر پر ستو! تم بھی سوچو 'غور کرو' اگر تمہاری بیٹی کسی کے نام سے کنواری بیٹی رہ گئی۔ اپنی خد پر قائم رہی تو کل دنیا اس کے ساتھ تمہیں بھی بدنام کرے گی۔ اس سے پہلے کہ بدنامی تمہارے گھر کا راستہ دیکھے اور اس کے بعد تمہیں ظہیر کی آواز سنائی دے اس سے پہلے ہی میں فیصلہ سناتا ہوں کہ تمہارے ظہیر بھی روشن ہو جائیں۔“

اس کے ساتھ ہی مونا کی آپا اور بہنوئی کے چہرے روشن ہونے لگے۔ انہوں نے مسکرا کر مونا کی جانب دیکھ کر مونا نے مسکراتے ہوئے کامران کو دیکھ لیا۔ وہ سب روشنی میں نا رہے تھے۔ رنگ برنگے قلمے گلے پہنچ رہے تھے۔ ڈھولک پر تھاپ پڑ رہی تھی اور شاہک کے گیت گانے والیوں کی رس بھری آواز ابھرتی جا رہی تھی۔

☆-----☆-----☆

رنگ برنگے قلمے روشن تھے۔ گھر کے اندر اور باہر مہمانوں کی چل پھل تھی۔ ذرا رنگ روم میں فون کا ریسیور کان سے لگائے کامران کے پلاٹ چمچ کھج کر کمرہ رہے تھے۔ ”بھئی کیا کروں۔ لڑکے نے اچانک ہی لڑکی پسند کی اور شادی طے پا گئی۔ کامران آج سے تیسرے دن چلا جائے گا۔ یوں سمجھیں کہ یہ عمارتا نہیں حقیقتاً چٹ مٹکی اور پٹ بیاہ کا معاملہ ہے۔ آپ کسی نہ کسی طرح ہماری خوشیوں میں ضرور شریک ہوں۔“

مجھ سے میری محبت کے ستائیں دن بچپن لیے گئے۔ صرف تین دن رہ گئے ہیں۔ کیا میں اپنی مونا کا پیار حاصل کیے بغیر چلا جاؤں؟ اے منصف اعلیٰ! اس سے پہلے کہ مجھ سے یہ تین دن بھی بچپن لیے جائیں میں انہیں ظہیر کی عدالت میں لے آیا ہوں۔ خدارا اپنا فیصلہ سنادے۔ ان کے ظہیر کو روشن کر دے۔“

چند لمحوں کے لیے خاموشی چھا گئی۔ پھر ایک باوقار رعب اور دبے سے بھرپور آواز گونجنے لگی۔ ”یہ ظہیر کی عدالت ہے۔ انسانوں کی پہلی اور آخری عدالت۔ لہذا فیصلہ سننے کے لیے سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جائیں۔“

مونا اور کامران پہلے ہی کنہروں میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اس کے پاپا اس کی ماما کی آپا اور بہنوئی کامران کی آپا اور بہنوئی سب کے سب اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ جیسے ظہیر کی روشنی گل ہو گئی ہو اور وہ اندھیروں میں گم ہو گئے ہوں۔ عدالت کے ماحول میں پھر وہی باوقار آواز گونجنے لگی۔

”اگر انسان ظہیر کی عدالت کے فیصلے تسلیم کرتا رہتا تو آج دنیا میں کسی اور عدالت کی ضرورت پیش نہ آتی۔“

صاحبزادہ تم ابھی عدالت میں کھڑے ہوئے ہو بہار، کسی گواہ کی، کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں انسان کا دل خود ہی جھٹ اور جگ کی گواہی دیتا ہے۔

اے لوگو! تم اپنے دلوں میں جھانک کر دیکھو۔ اگر تم کسی کا حق تسلیم نہیں کر رہے ہو تو تسلیم کر لو۔ اگر تم نے کسی کی محبت کے ستائیں دن اپنی امان کی خاطر چھین لیے ہیں تو اس چھیننے کے عمل کو جائز قرار نہ دو۔

اکثر لوگ اپنی ایک غلطی کو درست ثابت کرنے کے لیے دوسری غلطی کرتے ہیں۔ تم نہ کرو۔ اکثر بزرگ چھوٹوں کے حقوق دینے میں اپنی توہین محسوس کرتے ہیں۔ تم محسوس نہ کرو۔ چھوٹوں کے حقوق ادا کرتے رہنے میں ہی بزرگوں کی عظمت ہے۔“

وہ سر جھکائے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے چروں پر ابھی تک نیم تاریکی تھی۔ وہ واضح طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہی باوقار آواز گونج رہی تھی۔ ”یاد رکھو! آج تمہارا

کامران کی می نے آکر کلمہ ”آپ صبح سے فون کرنے میں مصروف ہیں۔ میرا چاروں بہنوں کو اطلاع دی ہے یا نہیں؟“

انہوں نے ریسپورڈ رکھتے ہوئے کلمہ ”بھئی ایک ایک کو اطلاع دے رہا ہوں۔ کمر کو فیکسنگرام دیا جا رہا ہے۔ کسی سے فون کے ذریعے رابطہ قائم کیا جا رہا ہے۔ جو قریب رہتا والے ہیں انہیں اطلاع دینے کے لیے آدی دوڑائے جا رہے ہیں۔ اتنی جلدی میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ تمہاری بہنوں کو بھی اطلاع دی جائے گی۔“

چند لڑکیاں کامران کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے لا رہی تھیں۔ کامران نے احتجاج کرتے ہوئے کلمہ ”می! یہ کیا مصیبت ہے شادی آج ہو جاتی تو کیا غضب ہو جاتا۔ کیا یہ فضول سی ریسس ضروری ہیں۔“

اس کی می نے ڈانٹ کر کلمہ ”ذیادہ نہ بولو! تمہاری جلد بازی میں ہم باپ دادا کی رسموں کو بھول جاتیں؟ میں پہلے بھی تمہیں سمجھا چکی ہوں۔ آج انہن کی رسم ہے۔ کل مندی پر سون تمہارا نکاح ہو جائے گا۔“ کامران نے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کلمہ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں پر سون تو ایک ہی دن رہ جائے گا۔ دوسرے دن یہاں سے چلا جاؤں گا! دلن کامنہ بھی ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکوں گا۔“

لڑکیاں اسے کھینچ کر لے جانے لگیں۔ ایک نے کلمہ ”دلن کامنہ دیکھنے کے لیے منہ کیوں ہٹا رہے ہو؟“

دوسری نے کلمہ ”بھئی کسی کیا بے صبری ہے! پہلے دلن کو تو آنے دو۔ جب آئے گی تو منہ دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔“

تمام لڑکیاں کھٹکھٹا کر بڑبڑتے ہوئے اسے ایک کمرے میں لے گئیں ”یہاں ڈھولک چر ساگ کے گیت گائے جا رہے تھے۔ اسے ایک چوکی پر انہن کی رسم کے لیے بٹھا دیا گیا۔ عجیب شور برپا تھا۔ چھوٹے بچے ادھر سے ادھر بھاگتے دوڑتے بھڑبھڑتے تھے۔ گود کے بچے رو رہے تھے۔ عورتیں زور زور سے بول رہی تھیں۔ کامران نے ایک لڑکی کی طرف جھک کر آہٹکی سے کلمہ ”تم میری بہت اچھی بہن ہو۔ میرا ایک کام کرو گی؟“

”ضرور کروں گی۔ کیا کام ہے؟“

”میں نمبر تیار رہا ہوں۔ تم فون کرو۔ کتنا کہ ہسپتال سے بول رہی ہو۔ مونا کی نرس ملی ہو۔“

”کیا مونا کے گھر میں فون ہے؟“

”اس کے پردوس میں ہے۔“

”بھائی جان! آپ لندن سے آئے ہیں۔ یہاں کی رسموں کو بھول گئے ہیں۔ بے چاری مونا مائیوں بیٹھی ہے۔ اپنے کمرے سے نہیں نکل سکی۔ پھر گھر سے نکل کر پردوس میں فون اینڈ کرنے کیسے آئے گی۔“

”کیا فضول سی ریسس ہیں۔ بھئی ان رسموں کے نام پر جو بھی ظلم کرتا ہے جلدی کرو۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔“

وہ جلدی کر رہا تھا۔ عورتیں تو قیامت تک ریسس ادا کرتی رہ جاتی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہاں سے نجات حاصل کر کے تیزی سے چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا۔ پھر فون کا ریسپورڈ اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے پوچھا ”کیا آپ مونا لے پردوس ہیں؟“

”جی ہاں فرمائیے۔“

”میں ہسپتال سے ڈاکٹر کامران بول رہا ہوں۔ ابھی ایک ضروری آپریشن ہے۔ مس مونا ایسے موقع پر مجھے اسٹ کرتی ہیں۔ میرا تمام ضروری سامان ان کی کسٹڈی میں رہتا ہے۔ اب مجھے میرے دستانے اور میرے آپریشن کے اوزار نہیں مل رہے ہیں۔ پلیز انہیں فون پر بلا دیجئے۔“

”سوری ڈاکٹر! مس مونا کی شادی ہونے والی ہے۔ وہ مائیوں بیٹھی ہوئی ہیں۔ نہیں آسکیں گی۔“

”جناب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ فضول ریسس ایک انسانی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتیں۔ یہاں آپریشن کے ذریعے ایک انسان کی زندگی بچانا مقصود ہے۔ آپ فوراً ہی مونا کو فون پر بلائیں۔“

”اچھی بات ہے میں کوشش کرتا ہوں۔ آپ انتظار کریں۔“

”میں ٹھیک پانچ منٹ کے بعد فون کروں گا۔“

اس نے پانچ منٹ کے بعد دوبارہ نمبر ڈائل کیے۔ رابطہ ہوتے ہی اس نے پوچھا
”ہیلو! کیس مونا موجود ہیں؟ میں ڈاکٹر کامران بول رہا ہوں۔“

دوسری طرف سے غلیل احمد کی آواز سنائی دی۔ ”میں مونا کا ہسپتال بول رہا ہوں۔
جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اس ہسپتال میں کامران نام کا کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔“

”آپ مونا سے پوچھ لیں۔ وہ تصدیق کریں گی۔ میں ڈاکٹر کامران بول رہا
ہوں۔“

”وہ تو تصدیق کر رہی تھی۔ کامران کا نام سننے ہی آنا چاہتی تھی لیکن رسم و رواج
کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اپنے کمرے سے نہیں نکل سکتی۔“

”کتے افسوس کی بات ہے یہاں ایک انسانی زندگی کو آپریشن کے ذریعے بچانے کا
مسئلہ ہے اور وہاں آپ لوگوں کو رسم و رواج عزیز ہیں۔“

”میاں صاحبزادے! زیادہ اڑنے کی کوشش نہ کرو۔ دو دن صبر کر لو۔ آج اور کل
کی بات ہے۔ پرسوں وہ تمہارے پاس ہوگی۔“

کامران نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”بھائی صاحب! جب آپ نے مجھے پہچان
لیا ہے تو میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آج ابھی ہے۔ کل مندی ہے۔
پرسوں نکاح پڑھایا جائے گا۔ آپ سوچیں ہم بی بھر کے باتیں بھی نہیں کر سکیں گے۔ فون
پر تو باتیں کرنے کا موقع دیا جائے۔“

”مجھے افسوس ہے۔ مشرقی رسم و رواج عورتوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں۔ ایسے
وقت ہماری ایک نہیں چلتی۔ تم فون کرتے کرتے تھک جاؤ گے۔ مونا کو گھر سے نکلنے نہیں
دیا جائے گا۔ اس لیے صبر کرو۔ میں تمہارے لیے دعا کرتا ہوں۔“

ریسیور رکھ دیا گیا۔ اس نے بھی جھجھکا کر ریسیور کو ریڈل پر بیٹھ دیا۔ غصہ دکھانے
سے کیا ہو سکتا تھا۔ ایسے ہی وقت تدبیریں ناکام ہوتی ہیں تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ تقدیر کوئی
جیز ہے جو نصیب میں لکھا ہوتا ہے وہی پیش آتا ہے۔

وہ صبر کر کے بیٹھ گیا۔

اللہ اللہ کر کے رسم و رواج کے دو دن کسی طرح گزر رہی گئے۔ تیسرے دن وہ

بادات کا دولہا بن کر مونا کے دروازے پر پہنچا۔ وہاں بھی دستور کے مطابق صبر کرنا پڑا۔
پلے تو اس نے ضد کی تھی کہ صبح بادات جانے کی تاکہ دوپہر تک اسے بیاہ کر لے آئے گا
لیکن دونوں خاندانوں میں منازع کے بعد نکاح پڑھانے کی روایت چلی آ رہی تھی۔ لہذا

مطلب کے بعد قاضی صاحب کا انتظار ہونے لگا پتا چلا وہ دوسری جگہ نکاح پڑھانے گئے
ہیں۔ جب آئے تو عشاء کا وقت ہو چکا تھا۔ لہذا وہ نماز پڑھنے چلے گئے۔ رات کے دس

بجے نکاح پڑھایا گیا۔ بارہ بجے تک دولہا اور دلہن کی طرف سے آنے والے کھانے پینے
میں مصروف رہے۔ ایک بجے تک دلہن والوں کی طرف سے رکیں ادا ہوتی رہیں۔ ایک

بجے لہ پندرہ منٹ پر رخصتی ہوئی۔ جب وہ مونا کو لے کر گھر پہنچا تو دو بج رہے تھے۔ وہاں
بھی کچھ رکیں باقی تھیں۔ اس نے جھجھکا کر کہا۔ ”اب کوئی رسم ادا نہیں ہوگی۔“

اس کے جھجھکانے سے کیا ہوا تھا۔ اصل رسم تو یہی تھی۔ تمام رشتے داروں کو
پہلے دلہن کا منہ دکھایا جاتا ہے۔ پھر اسے سناگ کی بیج پر پہنچایا جاتا ہے۔ چونکہ رات زیادہ

اونٹنی تھی اس لیے بچوں والی عورتیں اپنے اپنے بچوں کو جہاں جگہ مل رہی تھی وہاں
ملائی جا رہی تھیں۔ مکان کے ہر کمرے میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ بچے جا بے جا سو

رہے تھے۔ چند لڑکیاں دلہن کو اپنے حصار میں لے کر سناگ کے دروازے تک پہنچیں۔
وہاں رہی تھیں، کھلکھلا رہی تھیں۔ کامران ایک طرف کھڑا انتظار میں تھا کہ وہ بیٹیں

کی تو کمرے میں جائے گا۔ اسی وقت آپا کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس کی می می اور
اوسری عورتیں کچھ نہ کچھ بولتی جا رہی تھیں۔ اس نے زینے پر آکر بیٹے ڈرانگ روم کی

طرف جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“
آپا نے اپنے سینے پر دو ہاتھ مارنے ہوئے کہا۔ ”میرا بچہ، جانے میرا بچہ کلں گم ہو

کیا ہے۔ کہیں نظر نہیں آ رہا ہے۔“
”بچے کو آپ کی گود میں ہونا چاہیے۔ اگر اس بیٹے میں اسے کہیں سلا یا ہے تو ذرا

دماغ پر زور ڈالئے۔ سوچئے ابھی یاد آ جائے گا۔“
اس کے پلانے بنی کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”رونے سے بچہ نہیں لے گا۔ اپنے

ہا یا۔ پھر کہہ۔ ”موتا میں تیس چھوکر“ تیس سمیٹ کر یقین کرنا چاہتا ہوں کہ تم میری زندگی میں آگئی ہو۔ میں نے تیس پالیا ہے اور اب دنیا کی کوئی طاقت تیس مجھ سے نہیں چھین سکے گی۔“

یہ کہتے ہوئے وہ ذرا قریب ہوئے لگ۔ اسی وقت باہر سے ایک بچہ نکلی دی۔ اس کی آپا دھازیں مار مار کر رو رہی تھیں اور بچیں مار مار کہہ رہی تھیں۔ ”ہائے میں لٹ گئی۔ ہائے میرا بچہ“ ہائے میں کس سے فریاد کروں۔ سب مجھے جھوٹی تیلیاں دے رہے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، کوئی بچے والی میرے جگر کے کلوے کو بھول کر لے گئی ہے لیکن میں کہتی ہوں، کوئی اسے چرا کر لے گیا ہے۔ کسی نے انوار کر لیا ہے۔ ہائے کتنا خوب صورت تھا۔ میں اسے کہاں ڈھونڈوں۔ کس کے دروازے پر سر پھوڑوں۔“

کامران نے بے بسی سے دروازے کی طرف دیکھ کر پھر سرت سے موتا کو دیکھ لیا۔ وہ اتنے جھکی جھکی نظروں سے زیر لب کہہ۔ ”آپ کو باہر جانا چاہیے۔ اپنی آپا کو تسلی دیتے۔“

”وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جھنجھلا کر بولا۔ ”مجھ میں نہیں آتا“ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ لوگ دشمن بن گئے ہیں یا تقدیر دشمنی پر تل گئی ہے۔“

وہ غصے سے پاؤں پچھتا ہوا دروازے تک آیا۔ پھر ایک جھٹکے سے اسے کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی اس کی آپا نے اپنے سینے پر دو ہتھ پڑاتے ہوئے کہہ۔ ”ہائے یہ کیا زمانہ ہے بھائیوں کا خون بھی سفید ہو گیا ہے۔ یہاں میرا بچہ کم ہو گیا ہے اور یہ دلن کے بازو خزانے اٹھا رہا ہے۔ میں پوچھتی ہوں کیا دلن بھائی جا رہی ہے؟ میرے بچے کو لے کر جانے کون بھاگا جا رہا ہو گا۔ اتنی ہی مروت نہیں ہے کہ باہر جا کر اسے تلاش کر سکے۔“

کامران نے قریب آتے ہوئے کہہ۔ ”آپا! جانے کتنے لوگ اس کی تلاش میں گئے ہیں۔ پھر میرا جانا کی ضروری ہے؟“

آپا نے بڑے زور سے ہائے کہہ کر سینے پر دو ہتھ پڑا دیے۔ پھر کہنے لگی۔ ”تم بھائی ہو یا قہستانی ہو۔ خدا نخواستہ کسی نے میرے بچے کو مار ڈالا تو تمہاری آنکھ سے ایک آنسو میں نہیں ٹپکے گا۔ تم دلن کے ساتھ قہقہے لگاتے رہو گے۔“

دلغ کو پوری طرح پرسکون رکھو۔ ہو سکتا ہے بچہ بدل گیا ہو۔ کوئی دوسری بچہ والا تمہارے بچے کو لے گئی ہو اور اپنا بچہ یہاں چھوڑ دیا ہو۔“

سب آپا کو تیلیاں دے رہے تھے۔ کچھ عورتیں بچے کو تلاش کر رہی تھیں اور کچھ مردان بچے والی عورتوں کے ہاں گئے تھے جو شادی میں شریک ہونے کے بعد تھوڑی دیر پہلے اپنے گھروں کو گئی تھیں۔ خیال تھا ان میں سے کسی کے پاس آپا کا نسخا ہو گا۔

کامران اپنے بیڈ روم کی طرف آیا۔ لڑکیاں دلن کو بچہ پر بھڑا کر باہر آگئی تھیں اور اس کی طرف دیکھ کر کھٹکھٹا رہی تھیں۔ منہ چھپا کر ہنس رہی تھیں۔ وہ جلدی جلدی چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ پھر اس نے دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ ہر آہٹ پر دلن سزا دیتی تھی۔ شرارتی تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا۔ ”تمہارا چلنے والوں کے لیے کلاوت ہے کہ وہ سات سمندر پار جاتے ہیں۔ جب میں پہلی بار وہاں گیا تو مجھے اتنی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اتنے پاز نہیں بنیلے۔ آج پتا چل رہا ہے کہ سات سمندر پار کرنے کے بعد تمہارے پاس آیا ہوں۔“

وہ اس کے قریب بچ پر بیٹھ گیا۔ موتا دیا سے سینے لگی۔ کامران نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیہ نکالی۔ پھر اس میں سے انگوٹھی نکالتے ہوئے کہہ۔ ”ہم جلدی جلدی ساری دھنیں ادا کر گئے۔ میں تیس انگوٹھی پسناتا ہوں۔ تم مجھے گھونٹھٹ اٹھا کر فوراً ہی چھو دیکھنے کی اجازت دو۔ ورنہ کوئی نئی مصیبت نازل ہو جائے گی۔ میں تھک گیا ہوں۔ پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ دلن کو انگوٹھی پسناتے وقت اس کے حسن کی تعریف کس طرح کہنی چاہیے۔“

اس نے جلدی سے انگوٹھی پسنادی۔ پھر اس کے گھونٹھٹ کو اٹھا دیا۔ وہ سر جھٹکے، آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ٹھوڑی کو چھوتے ہوئے چہرے کا اٹھاتے ہوئے کہہ۔ ”اف! کتنی حسین لگ رہی ہو۔ تم تصور میں دلن بن کر آئی تھیں مگر تصور پیچھا پڑ گیا ہے۔ اتنی حسین لگ رہی ہو، اتنی حسین لگ رہی ہو کہ کم بخت کوئی شعر بھی تو یاد نہیں آ رہا ہے۔“

وہ زیر لب مسکرا رہی تھی۔ کامران نے اپنی دونوں ہتھیلیوں میں اس کے چہرے کو

قلم۔ ”کیس پتا نہیں چل رہا ہے۔ خدا جانے میرے بچے کو کون لے گیا ہے۔“
 کامران نے پوچھا ”کیا آپ کو ان تمام بچے والی عورتوں کے نام اور بچے معلوم ہیں؟“

اس کے ہنسنے لے اپنی جیب سے ایک بڑا سا کانڈ نکالتے ہوئے کہل۔ ”میں نے یہ مارے نام اور بچے نوٹ کر لیے ہیں۔ ان میں سے چند عورتوں سے پوچھ بھی چکا ہوں۔ ان کے پاس ہمارا بچہ نہیں ہے۔ باقی عورتیں ابھی اپنے گھر نہیں پہنچی ہیں۔“
 کامران نے اس فہرست کو ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہوئے کہل۔ ”یہ میں عورتوں کے نام اور بچے ہیں۔“

اس کے ہنسنے کہل۔ ”آٹھ عورتوں سے ملاقات کر چکا ہوں۔ میں نے ان کے نام اور بچے کاٹ دیے۔ باقی بارہ عورتوں میں سے کچھ اپنے گھر نہیں پہنچی ہیں۔ کچھ کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ کوئی دوسری شادی انینڈ کرنے گئی ہیں جہاں شادیاں انینڈ کرنے گئی ہیں وہاں کے بچے بھی میں نے کانڈ کے پیچھے لکھ لیے ہیں۔ چونکہ پٹرول ختم ہو گیا تھا۔ میں جلدی میں غلطی جب گیا تھا اس لیے کچھ رقم لینے آیا ہوں۔“

کامران نے اپنے ہنسنے سے چالی لی۔ ”ہم تلاش کریں گے آپ فکر نہ کریں۔ اگر آپ تلاش کرنا چاہیں تو اپنی موٹر سائیکل لے جائیں۔ چلو مونا بیٹیو۔“
 مونا بیٹی نوٹ لی دلسن تھی۔ ایک تو دیے بھی شرمیلی تھی۔ اس وقت شرم سے دہری ہو رہی تھی۔ کار کا دروازہ کھلتے ہی بیٹھ گئی۔ کامران نے دوسری طرف سے آکر انینڈنگ سیٹ سنبھالی۔ اسے اشارت کیا۔ کچھ رشتے داروں نے کہل۔ ”ذرا رک جاؤ۔ ہم بھی چلتے ہیں۔“

اس نے گاڑی کو مکان کے احاطے سے نکالتے ہوئے کہل۔ ”جس کا ساتھ ہوتا چاہیے، وہ میرے ساتھ ہے اور کسی کی ضرورت نہیں ہے جلیز ہماری گاڑی میں کوئی نہ آئے۔“

وہ احاطے کے باہر آیا اور اسے ذرا تیرا کر تا ہوا پٹرول پمپ کی طرف جانے لگا۔ کار کے اندر گرمی خاموشی تھی۔ دلسن چپ تھی۔ وہ بے چاری بھلا کیا کہہ سکتی تھی۔ ساگ

ایک بوڑھی عورت نے کہل۔ ”بیٹے کالی! بسن کی تسلی کے لیے تلاش کرنے چلے جاؤ اور بھی مدت سے لوگ گئے ہیں لیکن تم بچے کے ماموں ہو۔ تم اسے اپنا فرض سمجھ کر تلاش کرو گے۔“

اور عورتیں بھی کچھ نہ کچھ بولنے لگیں۔ وہ کبھی اس کو دیکھ رہا تھا کبھی اس کو دیکھ رہا تھا اور کبھی حسرت سے کمرے کے اندر سچ پر بیٹھی ہوئی دلسن کو دیکھ رہا تھا پھر وہ کچھ سوچ کر تیزی سے چلنا ہوا سونا کے پاس آیا۔ ایک جھٹکے سے اس کی کلائی کو تھام کر بولا۔ ”چلو! آٹھ! میرے ساتھ چلو۔“

مونا نے جیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔ اس نے کہل۔ ”تم میری شریک سیات ہو۔ میرے ہر معاملے میں شریک ہو۔ اگر میں بچے کو تلاش کرنے جا رہا ہوں تو تم بھی میرے ساتھ اسے تلاش کرنے نکلو گی۔ میں تم سے ایک پل کے لیے جدا نہیں ہو سکتا۔ ہماری ازدواجی زندگی کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ لہذا جو بھی لمحہ گزرے گا وہ تمہارے ساتھ گزرے گا۔ چاہے وہ بچے کی تلاش ہی میں گزرے۔“
 یہ کہتا ہوا اسے کھینچتا ہوا وہ کمرے سے باہر آیا۔ عورتیں کہنے لگیں۔ ”ہائے ہائے“
 یہ کیا کر رہے ہو۔ دلسن کو اس وقت کہاں لے جا رہے ہو؟“

اس نے گرج کر کہا ”خبردار! کوئی ہمارے معاملے میں مداخلت نہ کرے۔ جب تک میں اپنے بھائی کو تلاش نہیں کروں گا اس وقت تک دلسن کے ساتھ واپس نہیں آؤں گا۔“

وہ اسی طرح سونا کو کھینچتے ہوئے زینے سے اترنے لگا۔ نیچے ڈرائنگ روم میں اس کی بیوی اور بیٹے کہل۔ ”بیٹے! یہ کیا کر رہے ہو؟ دلسن کو کہاں لے جا رہے ہو؟“
 ”اپنے بھائی کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ اگر میں یہاں رہوں گا تو بسن کے طعنے سنتا رہوں گا۔ گاڑی کی چابی دیجئے۔“
 ”وہ تو تمہارے ہنسنے لے گئے ہیں۔“

اسی وقت باہر گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ سب دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ دلسن بھی اپنے دولہا کے ساتھ تھی۔ اس کا ہنسنی گاڑی میں واپس آیا تھا اور مایوسی سے کہہ رہا

”میری بہن کا بچہ گم ہو گیا ہے۔ سوچا شاید آپ کی وائف بھول سے اٹھا لائی ہو۔“

”ہمارے ہاں آپ کا بچہ نہیں ہے میری بیوی اپنی گود میں اپنا ہی بچہ لے کر آئی ہے۔ تم چاہو تو گھر میں آکر دیکھ سکتے ہو۔“

”آپ پر بھروسہ ہے۔ ہم تو صرف اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ شاید بھول سے بچہ بدل گیا ہو۔ ہر حال زحمت دی“ معافی چاہتا ہوں۔ بہت بہت شکریہ۔“

وہ کار میں آکر بیٹھنے لگا۔ مالک مکان نے دور سے کار کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔

”یہ دلہن کو ساتھ لے کر گھوم رہے ہو؟“

”جی ہاں“ ساگ رات یوں بھی گزارا جاتی ہے۔“

وہ گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے موٹا کی طرف دیکھنے لگا۔ کار کی اندرونی لائٹ روشن تھی۔ اس کا چہرہ صاف طور سے نظر آ رہا تھا۔ وہ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ ایسی

’مونہی‘ ایسی دل نشیں تھی کہ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔ وہ ڈرائیو نہ کر سکا۔

سڑک کے کنارے گاڑی روک کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا ہاتھ تھماتا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہیں تقدیر کو یہ بھی منظور نہ ہو۔ ادھر میں تمہارا ہاتھ اپنے

ہاتھوں میں لوں اور کوئی نئی مصیبت نازل ہو جائے۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر

اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ حائل ہاتھ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اب سے پہلے اس نے نرمی اور گرمی کو ایک عظیم پر محسوس کیا ہو۔ اس کے دل میں اس کے دماغ میں اس کی ایک

ایک رگ میں یہ سوال لہو کی طرح دوڑ رہا تھا۔ چل رہا تھا کہ جب یہ ہاتھ ایسا ہے تو وہ کیسی ہوگی؟

گھونگھٹ کے سائے میں حنا کی طلسماتی منک تھی۔ یو ڈی کلون کی مسکور کن نوشبو تھی۔ گلاب تھا، جنجیل تھی۔ ایک رات کی سہیلی تھی مگر اس سہیلی تک پہنچنے کا کوئی

دروازہ نہیں تھا۔

اس نے موٹا کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی بے قراری سے کہا۔

کی سچ سے زبردستی اٹھا کر لائی گئی تھی۔ کسی کو کال کو فنی سے نکال کر پھانسی کے تختے پر چڑھایا جائے تو وہ جسمانی لذت میں مبتلا ہو جائیگا لیکن سماگ کی سچ سے نئی نوعی دلہن کو اٹھا کر لایا جائے تو وہ ذہنی لذتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کی لذتوں کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا۔

شاید کامران بھی ایسی کچھ سوچ رہا ہو گا۔ اس لیے کم صم تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ نئی دلہن کو کس طرح تسلیاں دے اپنی حسروں کا کس طرح ماتم کرے؟

وہ پڑول پپ پیچ کر رک گیا۔ تنگی فل کرنے کا آڈر دیا۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر بولا۔

”ہماری تقدیر ہمارے ساتھ بہت ہی بھیاکت مذاق کر رہی ہے۔“

اس نے موٹا کو دیکھا۔ اس کا نصف چہرہ گھونگھٹ میں چھپا ہوا تھا۔ ”پلیز مونٹا! گھونگھٹ اٹھاؤ۔ مجھے جی بھر کر دیکھ لینے دو۔ رات کا بیچلا پر ہے اور ہم ہیں۔ پھر میں

کہاں اور تم کہاں؟“

اس کی بات سننے ہی وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ مندی والے خوب صورت ہاتھ آنسوؤں کو چھپا رہے تھے لیکن محبت کی آنکھ سے نکلنے والے آنسو

کامران کے دل میں ٹپک رہے تھے۔ اس نے کار کے باہر دیکھا۔ پھر آہستہ سے کہا۔

”موٹا یہ کیا؟ تم بہت بار جاؤ گی تو کل کیسے جاسکو گا؟ دیکھو وہ لڑکا پڑول کے پیسے لینے آ رہا ہے۔ وہ دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ جلدی سے آنسو پونچھ لو۔“

موٹا نے دوسری طرف منہ گھمایا۔ وہ پڑول کی رقم ادا کرنے لگا پھر اس نے گاڑی

اٹار لی۔ اسے آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگا۔ ”یہ آج کل کی عورتیں مائیں بنتی ہیں لیکن شادی بیاہ کے موقعوں پر میک اپ کرنے، ڈھونگ بجانے، ناچنے گانے کے دوران

اپنے بچوں کو بھول جاتی ہیں۔ کسی بھی کمرے میں ڈال دیتی ہیں کہ بچہ سوتا رہے۔ اس کے بعد بھول جاتی ہیں۔ آپاٹے بھی کیا اور ہم پر بڑا احسان کیا۔“

وہ ایک بچے والی کے مکان کے سامنے رک گیا۔ گاڑی کا پارن بجایا۔ پھر اتر کر دروازے پر دستک دی۔ رات سونے کے لیے ہوتی ہے۔ اتنی رات کو بھی سوتے ہیں۔

ان کی طرح کچھ بد نصیب جانتے ہیں۔ ہر حال مالک مکان نے دروازہ کھولا۔ پھر کامران کو دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اے دو لمبا میاں اتنی رات کو یہاں کیسے؟“

”چلو ہم قبرستان میں چلے ہیں۔“

مونٹا نے ایک دم سے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ ”ہاں مونٹا! وہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں انسان اپنے مردہ ضمیر کے ساتھ ہمیشہ کے لیے سو جاتا ہے۔ اس شرِ خوابیدہ میں کوئی نہیں پریشان نہیں کرے گا۔ کوئی ہم سے سوال نہیں کرے گا کہ دِلن کے گھونکھٹ تک پہنچنے کے لیے مقدّز سے اجازت نامہ لائے ہو یا نہیں؟“

مونٹا کی آنکھیں بھیٹنے لگیں۔ اس کے آنسو گرم تھے۔ اندر کی آگ سے اہل کر آئے تھے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”ہم زندہ انسان اپنے گھروں میں دروازے بناتے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی اندر چلا آتا ہے یا باہر نکل جاتا ہے۔ شرِ خوابیدہ کے کسی گھر کا کوئی دروازہ نہیں ہوتا۔ اس لیے کوئی ہم تک نہیں پہنچ سکے گا۔ چلو ہم اس شرِ بے خبراں و شرِ امن و امان میں چلیں۔“

اس کی بات ختم ہوتے ہی کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔ کوئی کار کی پاؤں کو ٹھوکنے بجاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”اس عورت کو کہاں لیے جا رہے ہو؟“ وہ دونوں جاگتی آنکھوں کے خواب سے چونک گئے کار کی کھڑکی سے ایک حوالدار جھانک رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ ”تم کون ہو؟ اور یہ عورت کون ہے؟ معلوم ہوتا ہے کوئی دِلن ہے۔ پھولوں سے لدی ہوئی ہے۔ اور ہاں، سونے کے زیورات تو بہت زیادہ ہیں۔ اسی لیے بھگا کر لائے ہو۔ ارے بے وقوف بھگوڑے! جب لے کر بھاگنا ہی تھا تو پہلے سوچ لیتے کہ بھاگ کر کہاں جاتا ہے۔ ایسی بھی کیا ہے میری کہ سڑک کے کنارے ہی رک گئے؟“

مونٹا پر کیا گزر رہی تھی اور پولیس والا کیا سمجھ رہا تھا اسے اپنی توہین کا احساس ہوا تو وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ حوالدار نے کہا۔ ”نہ لی نہ! اب رونے اور ڈرنے کی بات نہیں ہے۔ ہم اس بد معاش کو ایسی سزا دیں گے کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔ اے! ہمارے ساتھ تھانے چلو۔“

کار کے دونوں طرف کے دروازے کھل گئے حوالدار کے ساتھ دو سپاہی بھی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ کامران نے بے بسی سے کہا۔ ”حوالدار صاحب! آپ غلط سمجھ رہے

ہیں۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔“

”میں تمیں برس سے حوالدار ہوں۔ تم میری آنکھوں میں دھول بھونکنا چاہتے ہو۔ اس لڑکی کے آنسو جتا رہے ہیں کہ تم اس پر ظلم کر رہے ہو۔ زبردستی لے جا رہے ہو۔“

کامران نے کہا۔ ”مونٹا! پلیز چپ ہو جاؤ۔ آنسو پوچھ لو۔ انہیں بتاؤ کہ ہم پر کیا مکر رہی ہے“

”یہ کیا بتائے گی جو کچھ بتاتا ہے وہ تھانے چل کر بتاؤ۔ دیں بیان دو۔ اس سے پہلے نجات نہیں مل سکتی۔“

کامران نے جھنجھلا کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ پھر ایک ہینکے سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ ”بتاؤ مکدھر جاتا ہے؟“

ایک سپاہی راہنمائی کرنے لگا۔ وہ اس کے بتائے ہوئے راستوں پر گاڑی دوڑاتا ہوا ایک تھانے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ پھر وہ گاڑی سے اترا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر مونٹا کا ہاتھ تھام کر بولا۔ ”آؤ! ہمارے نصیب میں یہ بھی لکھا ہوا تھا۔ جلدی سے بیان دے کر اپنے میاں بیوی ہونے کا ثبوت پیش کریں۔ اس کے بعد یہاں سے چلیں گے۔“

وہ اندر آئے صبح کے چار بج رہے تھے اس اوج اوکھیں محو خواب تھا۔ سب انسپکٹر ڈیوٹی پر تھا۔ اس نے معاملات دریافت کیے۔ پھر کہا۔ ”دونوں ادھر کھڑے ہو جاؤ۔ سچ بچ بتاؤ، کون ہو؟ کہاں بھاگے جا رہے ہو؟“

”جناب! میری بہن کا پچھم ہو گیا ہے۔ ہم اسے تلاش کرنے نکلے ہیں۔“

”لیکن یہ تو جی دِلن لگ رہی ہے۔ بچے کو تلاش کرنے کے لیے کسی کی دِلن کو اٹھا لائے ہو؟“

”جناب! یہ میری دِلن ہے۔ میری شریک حیات ہے۔ آج ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔“

حوالدار نے کہا۔ ”یہ بکواس کرتا ہے۔ میں نے سڑک کے کنارے انہیں ایسی

کامران نے عاجزی سے کلمہ "جناب! میرا قیام لندن میں ہے۔ میں ایک ماہ پہلے آیا تھا۔ کل صبح چلا جاؤں گا۔ میں نے آج تک یہی دیکھا ہے کہ جب تک کسی پر الزام ثابت نہ ہو اسے جینے کا موقع دیا جاتا ہے۔ آپ مجھے نہ کسی کم از کم میری وادف کو تو جینے کا کہہ سکتے ہیں۔"

سب انسپکٹر نے ریسپورڈ کرپٹل پر غصے ہوئے کلمہ "تم لندن کا رعب نہ جتاؤ۔ یہاں یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے اسمگلر اور بروڈ فروش آتے ہیں اور ہمارے سامنے مرفا بنتے ہیں۔ شکر کرو ابھی تمہیں مرفا نہیں بتایا ہے۔ تم اسے لوگ کھڑے منہ کیا تک رہے ہو۔ ان دونوں کو زندہ اور مردانہ حوالات میں بند کرو۔ وہاں آرام سے بیٹھیں گے۔"

حوالدار اور سپاہی دونوں کو حوالات کی طرف لے جانے لگے۔ کامران نے کلمہ "یہ کیسا ظلم ہے۔ نہ ہم لوگوں کی بات کا یقین کیا جا رہا ہے۔ نہ ہمارے رشتہ داروں کو اطلاع دی جا رہی ہے۔ آخر کسی گواہی کے بغیر آپ ہمیں قصوردار کس طرح سمجھیں گے؟"

حوالات کے قریب پہنچ کر حوالدار نے آہستگی سے کلمہ "تم بالکل ہی اناڈی ہو۔ اگر صاحب یہاں سے فون کر کے تمہارے رشتہ داروں کو بلائیں گے تو تمہارے رشتے دار فوراً پہنچ جائیں گے۔ اس طرح تمہاری جیب سے ایک پیسہ خرچ نہیں ہوگا۔ اگر ہمارے ہائی کو آئے جانے کا کرایہ دو گے تو وہ رکشا میں جائے گا اور ٹیکسی میں تمہارے رشتہ داروں کو لے آئے گا۔"

کامران واقعی اناڈی تھا۔ اسے یہاں کے طور طریقوں کا علم نہیں تھا۔ اس نے سو رہا کہ پانٹ نکال کر حوالدار کی طرف بڑھایا۔ اس نے ایک نوٹ لیتے ہوئے کلمہ "یہ تو صرف جانے کا پتہ ہے اور آئے گا؟"

کامران نے جب میں ہاتھ ڈال کر سو کے چار نوٹ نکالے۔ پھر اس کی ہتھیلی پر دیتے ہوئے کلمہ "خدا کے لیے جلدی پیچھا چھڑاؤ۔"

"مجھ کو پیچھا چھوٹ گیا۔ ہم ابھی تمہارے رشتہ داروں کو بلا رہے ہیں۔"

وہ انہیں لے کر سب انسپکٹر کے پاس پہنچا۔ پھر کلمہ "سر! یہ تو بہت ہی شریف

حالت میں دیکھا ہے کہ آنکھیں گنگار ہو جاتی ہیں۔"

سب انسپکٹر نے ڈپٹ کر پوچھا "کیا دیکھا ہے؟"

"یہ اس عورت کا ہاتھ زبردستی پکڑ رہا تھا اور یہ بے چاری رو رہی تھی۔ سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر یہ بیوی ہے تو کیوں رو رہی تھی؟"

"جناب! میں اپنے گھر کا فون نہرتاتا ہوں۔ آپ معلوم کر لیں۔ پتا چل جائے گا کہ ہمارے ہاں ایک بچہ گم ہوا ہے اور میں اس کی تلاش میں اپنی دلہن کے ساتھ نکلا ہوں۔"

"پولیس والے ہم ہیں اور تم ہمیں تفتیش کرنے کا طریقہ سکھا رہے ہو۔ ہو سکتا ہے لڑکی والوں سے کوئی خاندانی دشمنی ہو۔ اس لیے تم اپنے گھر والوں کے ساتھ مل کر اسے اغوا کر رہے ہو۔ ہم کیوں تمہارے گھر فون کر کے معلومات حاصل کریں۔ لڑکی کے گھر فون کر کے کیوں نہ پوچھ لیں۔"

"آپ لڑکی والوں سے بھی پوچھ سکتے ہیں۔"

سب انسپکٹر نے موتا سے پوچھا "تم اپنے گھر کا فون نہرتاؤ۔"

مونانے آنسو پونچھتے ہوئے کلمہ "ہم مجرم نہیں ہیں۔ یہ میرے شوہر ہیں ان کی شریک حیات ہوں۔ آج ہی ہماری شادی ہوئی ہے۔ میں رو رہی ہوں تو اپنی تقدیر پر۔ میں چپ ہوں تو اپنی بے بسی پر۔ آج میرے شوہرانے اور چپ رہنے کی رات تھی۔ یہ کیسا ظلم ہے یہ کیسی بے حیائی ہے کہ میں تمہانے پیچ کر بول رہی ہوں۔"

"ادب! بی! یہ تمہانہ ہے۔ یہاں آنسوؤں کا اور درد بھرے ڈائیگ لا کوئی اثر نہیں۔ سو کہ جو سوال کیا جا رہا ہے اس کا جواب دو۔ تمہارے گھر کا فون نہرتا ہے؟"

"میرے گھر میں فون نہیں ہے۔ پڑوس میں ہے اس کا نمبر نوٹ کیجئے۔"

اس نے نہرتایا۔ سب انسپکٹر ریسپورڈ اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگے۔ پھر ریسپورڈ کلنگ سے لگا کر ننگے لگے۔ چند لمحوں کے بعد اس نے بیڑا ہو کر کلمہ "وہاں فون کی گھنٹی بج رہی ہے لیکن کوئی فون اٹھانے والا نہیں ہے۔"

حوالدار نے کلمہ "پونے پانچ ہو رہے ہیں۔ لوگ اس وقت اذان کی آواز پر نہیں اٹھتے۔ فون کی گھنٹی پر کیا اٹھیں گے۔"

لوگ ہیں۔ پڑول کچھ زیادہ ہی مل گیا ہے۔ آپ ان صاحب کے گھر کا فون نمبر پوچھ لیں۔ کامران نے نمبر بتایا۔ انسپکٹر نے ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیے۔ تھوڑی دیر بعد وہ رابطہ قائم ہو گیا۔ انسپکٹر نے پوچھا۔ ”کیا آپ نوٹا مین‘ فورٹا مین‘ فورٹا مین سے بول رہے ہیں؟“

”جی ہاں‘ فرمائیے؟“

”کیا آپ کے ہاں کوئی بچہ گم ہو گیا ہے؟“

”جی ہاں۔ گم ہو گیا تھا۔ ابھی ابھی مل گیا ہے۔ دراصل ایک خاتون اسے اپنا بیٹا کر لے گئی تھیں اور اپنا بچہ ہمارے ہاں چھوڑ گئی تھیں۔“

انسپکٹر نے کہہ۔ ”ایک منٹ ہولڈ آن کریں۔“

اس نے ہاتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کامران سے کہہ۔ ”تم کہہ رہے ہو‘ بچے کو تلاش کرنے نکلے ہو اور وہاں بچہ مل گیا ہے۔“

کامران نے اطمینان کی گہری سانس لیتے ہوئے مونا کو دیکھ کر پھر کہہ۔ ”خدا کا شکر ہے‘ بچہ مل گیا۔ انسپکٹر پلیز آپ میرے پاپا کو ہمارے متعلق بتائیں۔“

انسپکٹر نے ریسیور پر کہہ۔ ”پلو مسٹر! آپ کے صاحبزادے یہاں موجود ہیں اور ان کے ساتھ ایک نئی دلہن بھی ہے۔“

دوسری طرف سے کامران۔ ”جی ہاں‘ وہ میرا بیٹا اور بہو ہیں۔ آج ہی شادی ہوئی۔ ہے۔ بے چارے بچے کو تلاش کرنے نکلے ہیں لیکن آپ کون ہیں۔ کہاں سے بول رہے ہیں۔“

”میں پولیس انسپکٹر ہوں اور تھانے سے بول رہا ہوں۔ تمہارا بیٹا اور بہو محکوک حالت میں گرفتار ہوئے ہیں۔ جب تک آپ یہاں آکر چند معزز حضرات کی گواہی پیش نہیں کریں گے‘ اس وقت تک یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔“

وہ چپ ہو کر دوسری طرف سے بات سنتے لگا۔ پھر اس نے ریسیور کو کرئیل پر رکھتے ہوئے کہہ۔ ”تمہارے گھر والے آ رہے ہیں۔ یہاں کریسوں پر بیٹھ جاؤ۔“

وہ کریسوں پر بیٹھ گئے۔ مونا نے کھڑکی کے پار دیکھ کر صبح کی ہلکی سی روشنی ہو

رہی تھی۔ تاریکی سے روشنی کی طرف آؤ تو خوشی ہوتی ہے لیکن صبح ہوتے دیکھ کر اچانک اسے رونا آگیا۔ وہ پھر آجکل میں منہ چپا کر ہولے ہولے سسکتے گئی۔ اپنے آنسوؤں کو‘ اپنی آنسو کو‘ اپنی سسکیوں کو ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ ساگ سلامت ہو اس کے باوجود ساگن کے اندر ماتم ہو تو وہ چھپ نہیں سکتا دیکھنے والوں کے حساس دلوں کو متاثر کرتا ہے۔ کامران اسے دیکھ رہا تھا بڑے کرب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ دیران تھیں۔ جیسے تمام آنسو بھج گئے ہوں جتنے کو محض دل رہ گیا ہو۔

☆ ----- ☆ ----- ☆

جب وہ گھر واپس آئے تو صبح کے سات بج رہے تھے۔ کامران کی ردائی میں صرف تین ٹکٹے رہ گئے تھے۔ گھر میں رشتے داروں کی بھیڑ مچی ہوئی تھی۔ سب بیدار ہو گئے تھے۔ کوئی ناشتا کر رہا تھا۔ کوئی بچے کی بازیابی پر اس کی ماں کو مبارک باد دے رہا تھا۔ وہ اہل دلہن ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے اپنے بیڑ روم میں پہنچے۔ جس طرح ڈوبتے لہکنے کا سارا ہوتا ہے‘ اسی طرح چھڑنے والوں کے لیے تین ٹکٹے ہی بہت ہوتے ہیں۔

شرقی آداب اور حیا کچھ اور ہوتے ہیں۔ یہاں اس قدر بے تکلفی یا بے حیائی نہیں ہوتی کہ نئی دلہن اپنے دو لہکا کو لے کر تمام لوگوں کی موجودگی میں ایک کمرے میں جا کر بند ہو جائے۔ مونا بھی شرعی لڑکی یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی کہ دن کے وقت بند کمرے میں قماشیں جانے اور بڑی بوڑھیوں کی تنقید کا نشانہ بنتی رہے۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو کامران دروازہ بند کرنے لگا۔ وہ خشک لبے میں بولی۔ ”رک جاؤ۔ دروازہ بند نہیں ہو گا۔“

کامران نے پلٹ کر پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہو۔ وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔ کچھ دیر تو ہم مل بیٹھیں۔“

”عورت عزت اور آبرو سے پیار چاہتی ہے۔ جب تک یہ دروازہ بند رہے گا‘ میں

شرم سے مرنے لگی۔

”لیکن دروازہ کھولنے ہی عورتیں غی دلن کو دیکھنے چلی آئیں گی۔“

”دیکھنے دو۔ اب تو تماشا بینا ہی رہ گیا ہے۔“

”کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟“

”میں اپنے خدا سے اور اپنے مجازی خدا سے کبھی روٹھ نہیں سکتی۔ پلیز دروازہ کھول دو۔“

اس کے آگے بڑھ کر بے دلی سے دروازہ کو کھول دیا۔

اس نے درست کما قفلہ دروازہ کھلتے ہی بوٹھی عورتیں اور جوان لڑکیاں دلن کو دیکھنے کے لیے اندر آ گئیں۔ کامران کی مٹی اور آپانے کلمہ۔ ”میں اس اتنی بھیڑ کیوں لگا رہی ہے؟ سب باہر جائیں۔ دو لہا کو کچھ تو باتیں کرنے دیں۔“

کامران نے چیخ کر کلمہ۔ ”میں بس کیجئے۔ جب میں نے مونا کو حاصل کرنے کی التجا کی تو آپ اور بیلا اپنی اتا کی دیوار کھڑی کرتے رہے۔ جب بات مانی تو صرف تین دن رہ گئے مگر تین دنوں میں بھی رسم و رواج کی دیواریں کھڑی کی گئیں ایسی دیواریں جن میں مونا تک پہنچنے کے لیے کوئی دروازہ نہیں قفلہ آج میں اسے بیاہ کر لایا تو ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ میری آبانے اپنے آنسوؤں کی دیوار کھڑی کر دی۔ ہم اپنی ساگ رات سڑکوں اور قہانے میں مٹا کر آئے ہیں۔ آپ لوگوں کو تو جشن منانا چاہیے۔“

اس نے مونا کی طرف پلٹ کر کلمہ۔ ”کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ دلن کے روپ میں تماشا بنو۔ جاؤ اور لباس تبدیل کرو ہم ابھی ایئر پورٹ جا رہے ہیں۔“

عورتیں دلن کے کمرے سے باہر جا رہی تھیں۔ دلن اپنا لباس نکال کر ہاتھ روم کی طرف جانے لگی۔ ”میں نے پوچھا۔“ بیٹے! کیا غصہ دکھا کر جاؤ گے؟“

آپانے پوچھا۔ ”کچھ کھائے پئے بغیر کیسے جاؤ گے میں نہیں جانے دوں گی۔“

”آپ لوگوں کی محبت سے بیت بھر گیا ہے۔ رہ گیا غصہ تو میں کس پر دکھا سکتا ہوں؟ کیا پھولوں بھری بیج کو نوج ڈالوں یا اپنا نہ نوج لوں؟“

اس کے پیلے بیڑ روم کے دروازے پر آکر کلمہ۔ ”بیگم! یہ درست کہہ رہا ہے۔“

ہم سب نے مل کر اپنے بیٹے اور بو پر بڑے ظلم کیے ہیں۔ ان کے جانے میں جو بھی وقت رہ گیا ہے اس وقت تک کوئی ان کے درمیان نہ رہے۔ یہ جہاں جاتے ہیں انہیں جانے دیا جائے۔ ہم ہمیں سے انہیں رخصت کریں گے۔“

اس کی مٹی اور آپانے پانے مزید بحث نہیں کی۔ چپ چاپ کمرے سے چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ مونا کے ساتھ کار میں بیٹھا ایئر پورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ دونوں تھا تھے۔ شرجاگ رہا تھا۔ بھری پری شاہراہیں ان کے ساتھ چل رہی تھیں۔ مٹا پاپ اور رشتے داروں نے انہیں تھما دیا موقع دیا تھا کہ ان کے نصیب میں نہیں تھی۔

مونا نے ایک سادہ سی ساڑی پہن لی تھی۔ بدن پر ایک زیور بھی نہیں تھا۔ زلفیں کھلی ہوئی تھیں۔ بالکل اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ حقیقتاً کوئی ساکن کبھی یوں نہ اجڑی ہوگی۔

وہ ونڈا اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولی۔ ”کامی! تم مجھے کتنا چاہتے ہو؟“

”سوال نہ کرو۔ آزاد کر دیکھو لو۔“

”وہ تو میں نے آزاد کیا۔ تم اپنے جسم کا ایک ایک قطرہ خون میرے نام پر بہا سکتے ہو۔ میں سوچتی ہوں‘ جب اتنی قربانیاں دے سکتے ہو تو کیا میری خاطر دس کا کام چھوڑ کر اپنے ہی ملک میں کوئی روزگار حاصل نہیں کر سکتے؟“

”ضرور کر سکتا ہوں لیکن یہ تو سوچو روزگار کی تلاش میں زیادہ سے زیادہ کمانے کے لیے اپنا مستقبل شائدہ بنانے کے لیے لوگ ملک سے باہر جاتے ہیں۔ ملک سے باہر جانے کے کئی مقاصد ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم اپنی صلاحیتوں کا دہل بھرو کر مظاہرہ کریں۔ دوسرا اپنے ملک کے لیے زرمبادلہ کمائیں۔ تیسرے یہ کہ غیر ممالک میں رہ کر غیر سرکاری طور پر اپنے ملک کی نمائندگی کرتے رہیں۔“

وہ آنسو بھرے لہجے میں بولی۔ ”میں تمہارہ جاؤں گی۔“

”کون ایسا سنگدل ہو گا جو دل و جان سے حاصل کی ہوئی محبت کو تھما چھوڑ کر جاسکے گا۔ میں جا رہا ہوں تو میرا سینہ اندر سے خالی ہو رہا ہے۔ یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنی

ذات میں اندر سے کچھ نہیں رہا۔ جو کچھ بھی تھا اسے تمہارے سامنے ہار چکا ہوں اور تانکام جواری کی طرح واپس جا رہا ہوں۔“

”کیا تم وہاں پہنچنے ہی مجھے اپنے پاس بلاو گے؟“

”بھری پہلی کوشش یہی ہوگی۔ تم یہاں اپنا پاسپورٹ وغیرہ تیار رکھنا۔ میں کسی دن بھی تمہارے لیے وہاں سے ٹکٹ اور ویزا وغیرہ روانہ کر سکتا ہوں۔“

وہ ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ وہاں باتیں کر کے وقت گزارتے رہے۔ وقت کیا گزارنا تھا۔ وقت انہیں گزار رہا تھا اور بڑی تیزی سے گزار رہا تھا۔ جب کوئی خواہش پوری نہ ہو تو اسے پورا کرنے کے لیے آدمی میں پھنکانا پنا پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ آج کوئی فلائٹ یہاں سے نہ جائے یا کسی وجہ سے کامران کا ٹکٹ کینسل ہو جائے۔ کوئی ایسی وجہ ہو جائے کہ وہ کم از کم ایک دن کے لیے رک جائے۔

کامران نے کہا۔ ”میرا دل نہیں چاہتا“ تمہیں چھوڑ کر جاؤں مگر میں جو محنت کروں گے مستقبل بناؤں گا اور تمہارے لیے بناؤں گا۔ اپنی ہونے والی اولاد کے لیے بناؤں گا۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ کمانے، زیادہ سے زیادہ مستقبل کو شاندار بنانے کے لیے ہمیں بڑی قربانیاں دینی ہوں گی۔“

”اس سے بڑی قربانی کیا ہو گی کہ ہم نے شادی کی پہلی رات قربان کر دی۔ ہماری آئندہ ملاقات تک جانے کتنی راتیں اور کتنے دن اور قربان ہوتے رہیں گے۔ مستقبل سنوارنے کا سوال ہے اس لیے چپ ہوں۔ صبر کرو رہی ہوں۔“

وہ صبر کا حوصلہ کرتی تھی مگر بولتے بولتے رونے لگتی تھی۔ کامران اسے تسلیاں دیتا جا رہا تھا۔ آخر اس کے رخصت ہونے کا وقت آ ہی گیا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تمام رکھا تھا۔ وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ”تمہارا ہاتھ چھوڑنے کو مجھے نہیں چاہتا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اس ہاتھ کو دوبارہ تمہارے لیے وہاں پہنچنے ہی کوشش کروں گا اور جیسے جلد سے جلد اپنے پاس بلاؤں گا۔“

وہ روتی رہی۔ کامران اس سے ہاتھ چھڑا کر دور دھکے لگا۔ وہ جا رہا تھا اور آنسوؤں میں دھندلا رہا تھا۔ وہ آہٹ سے آنسو پونچھتی تھی تو کچھ صاف دکھائی دینے لگا تھا۔ پھر

آنکھیں بھر جاتی تھیں۔ منظر دھندلا جاتا تھا۔ اس نے دوسری تیسری بار آنسو پونچھتے ہوئے دیکھا۔ وہ طیارے تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں سے پلٹ کر دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اس نے آنسو نہیں پونچھے۔ اب پونچھ کر کیا کرتا تھا؟ کسے دیکھنا تھا۔ منظر دھندلا رہا ہے، دھندلا رہا ہے، اس کی تو اپنی زندگی، اپنے ارمان اور اپنے جذبے دھندلاتے جا رہے تھے۔

پھر وہ وقت آیا کہ طیارہ وہاں سے حرکت کرتا ہوا دن دسے پر دوڑتا ہوا بلندی پر پرواز کرنے لگا۔ دور جانے لگا۔ عجب نگاہ تک وہ اسے یوں دیکھتی رہی جیسے وہ پلٹ کر واپس آئے گا اور کہے گا۔ میں تو تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ ہماری رفاقت اس لیے تو نہیں تھی کہ تمہیں چھوڑ کر پردیس چلا جاؤں۔

اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک آہ نکلی۔ ”آہ!“

بے فیض رفاقت میں شمر کس کے لیے تھا
جب دھوپ تھی قسمت تو شجر کس کے لیے تھا
پردیس میں سونا تھا تو چھت کس کے لیے ڈالی
باہر ہی ٹکنا تھا تو گھر کس کے لیے تھا

☆-----☆-----☆

رہا۔ اس کا روبرو ایک مخصوص ڈگر پر چل رہا ہے اور تم چلا رہے ہو۔ اس میں تمہاری مستقل مزاجی یا غوس منصوبہ بندی کا دخل نہیں ہے۔ اگر تم نے کوئی مستقل ارادہ کیا ہو اور اس پر عمل کیا ہو تو بتاؤ؟“

”مجھے اور کون سا ارادہ کرنا ہے؟“

”اتنی عمر ہو گئی ہے۔ شادی تو کر سکتے ہو۔ شادی کا منصوبہ بنانا ایک اچھی شریک حیات کا انتخاب کرنا اور اس کے ساتھ مستقل زندگی گزارنا ایک غوس منصوبے کی دلیل ہے۔“

”ایسا تو بھی کرتے ہیں۔“

”بھی کامیاب ازدواجی زندگی نہیں گزارتے۔ ازدواجی زندگی کا رویہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتی ہے۔ پہلے بیوی کے مزاج کو سمجھنا اور اپنا مزاج سمجھنا اور کامیابی سے زندگی گزارنا اس کے بعد اولاد کا مستقبل سوارنا یہ باتیں ایسی ہیں کہ اس دوران میاں بیوی مختلف مراحل سے مختلف آزمائشوں سے گزرتے ہیں۔ تم بہت خدی ہو۔ اگر ایک بار شادی کی ضد کر لو تو یقیناً کر کے رہو گے۔“

”تم اچھی طرح جانتے ہو میں عورتوں سے نفرت کرتا ہوں سب کچھ کر سکتا ہوں“ شادی نہیں کر سکتا۔“

ڈاکٹر ہنر نے ہنسنے ہوئے کہہ ”تمہارا وہ دوست کامران بھی تمہارے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ اس نے بھی سوچ رکھا تھا کہ شادی نہیں کرے گا اور اب تمہی کہتے ہو کہ پاکستان پہنچنے ہی اس نے شادی کر لی ہے۔“

”ہاں“ دو گھنٹے بعد میاں بیچ رہا ہے۔ میں اسے لینے ایئر پورٹ جا رہا ہوں۔ کبوتر کو کھری کھری سناؤں گلہ اس نے شادی کر کے میرا نام ڈبو دیا ہے۔“

”اس میں نام ڈبوانے کی کیا بات ہے؟“

اس نے حقارت سے کہہ ”عورت آخر ہوتی کیا ہے؟ چند سکوں میں حاصل جاتی ہے۔“

”اوہ“ نو“و“ رضا مراد! عورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کے آگے سپاہی ہتھیار ڈال

وہ رائل ہسپتال کی سب سے اونچی منزل پر بیٹھا ڈاکٹر سے باتیں بھی کر رہا تھا اور وسیع و عریض کھڑکی کے باہر منظر بھی دیکھ رہا تھا۔ لندن کی فضا کراؤد تھی۔ دودھ دریا نے ٹیمر کمر میں دھندلا رہا تھا۔ ایک طرف البرٹ برج اور دوسری طرف چیلی برج دکھائی دے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہہ ”رضا مراد! تمہارا دماغ اور دوسری طرف چیلی برج دکھائی نہیں کوئی بیماری نہیں ہے۔ دراصل تم تو کئی ماہ اندر ہو یعنی تمہارے دماغ میں دھند چھائی رہتی ہے۔ یہ کمزور دھند آخر کیا چیز ہے؟ اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ جس طرح لندن کے خوب صورت مناظر کو کر چھپا لیتی ہے۔ یہ ضد ہے کہ خوب صورت کو چھپا لے گی۔ اسی طرح تمہارا دماغ بہت سی حقیقتوں کو اپنے اندر چھپا لیتا ہے۔ پھر کراؤد دماغ کے ذریعے جو بات سمجھ میں آتی ہے تم اس پر عمل کرنے لگتے ہو۔“

”ڈاکٹر ہنر! اگر تم نفسیاتی اصطلاحات میں باتیں کرو گے تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ تم محض ڈاکٹر نہیں میرے دوست بھی ہو اس لیے دوستانہ انداز میں سیدھے سارے طریقے سے سمجھاؤ۔ بات کیا ہے؟“

”بات کچھ بھی نہیں ہے۔ بس تم حقیقت سے گریز کرتے ہو کوئی کپا خیال تمہارے دماغ میں آتا ہے، تم اس پر عمل کرتے ہو۔ کسی غوس منصوبے کے تحت کام نہیں کرتے۔“

”وہ ڈاکٹر میں لندن مٹی کیب ایجنسی کے نام سے اتنا بڑا کاروبار چلا رہا ہوں۔ کیا یہ میرا غوس منصوبہ نہیں ہے؟“

”وہ کاروبار تمہارے بڑے بھائی نے شروع کیا تھا۔ بے چارہ اس دنیا میں نہیں

کے۔

”میں بھی کسی وکیل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ تم نے بھی یہی مشورہ دیا ہے۔ ہم اس پر ضرور عمل کریں گے۔ ہائی دی وے، میرے علاج کے متعلق بتاؤ۔ یہ نئی بیماری کیسے شروع ہوگئی؟ پہلے میرے قلع میں جلن نہیں ہوتی تھی۔“

”یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ تمہیں کوئی نہ کوئی نئی بیماری لاحق ہوتی رہتی ہے۔ تم دھند میں گرفتار رہتے ہو۔ اس لیے اپنے آپ پر شبہ کرتے ہو کہ صحت مند نہیں ہو۔ جب خود پر اعتماد نہ رہے تو آدمی نفسیاتی طور پر بیمار ہو جاتا ہے۔ ہر حال میں جو گولیاں لکھ کر دی ہیں، انہیں کھانے کے بعد چلیا کرو۔ بیماری دور ہو جائے گی۔ میں جانتا ہوں مہینے دو مہینے بعد تم کوئی نئی بیماری لے کر آؤ گے۔ اس لیے اب یہاں سے جاؤ۔“

”ہم نے کی ضرورت نہیں ہے۔ فلائیٹ کا وقت ہو رہا ہے میں خود ہی جا رہا ہوں۔ اچھا پھر ملیں گے۔“

اس نے مصافحہ کیلئے پھر اس کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ڈاکٹر نے اپنی اسٹنٹ کو بلایا پھر کہہ ”رضا مراد کی فائل لے آؤ۔“

فائل پیش کی گئی۔ اس نے کھول کر اسے پڑھنا شروع کیا۔ آج سے دو برس پہلے رضا مراد بالکل نارمل تھا۔ یوں تو اب بھی نارمل نظر آتا تھا لیکن ذہنی اختصار میں مبتلا رہتا تھا۔ پچھلے دنوں اس کے ساتھ جو حالات پیش آئے تھے، ان کا نفسیاتی تجزیہ کرنے پر واضح ہوا تھا کہ وہ غیر شعوری طور پر اپنے آپ سے انتقام لیتا ہے۔ جب کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو اپنے آپ کو بیمار بناتا ہے۔ ایسی ہی چھوٹی موٹی خود ساختہ بیماریوں کے دوران اس کی دوستی ڈاکٹر جان جنرے سے ہو گئی تھی۔

قصہ یوں ہے کہ اسے شینہ پسند آگئی تھی۔ اس نے نوٹ کر اس سے محبت کی اور اس کے قریب ہوتا چلا گیا۔ اس دوران شینہ اور اس کے والدین کو معلوم ہوا کہ رضا مراد کا دوا بھائی خیا مراد تمام کاروبار کا مالک ہے۔ اس لیے شینہ ادھر سے ادھر ہو گئی۔ اس سے ملاقاتیں کرنے لگی۔ اس کے والدین کسی نہ کسی بہانے اسے اپنے ہاں مدعو کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بڑے بھائی کے ساتھ شینہ کی شادی ہو گئی۔ اس شادی نے رضا

دیتے ہیں۔ شہنشاہ وقت ان کے قدموں میں تاج رکھ دیتا ہے۔ پھر بھی وہ حاصل نہیں ہوتیں۔ تم نے لندن میں رہ کر صرف وی ڈی ٹیٹ منٹ حاصل کرنے والی لائق عورتوں کو دیکھا ہے۔“

”ڈاکٹر! اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں بھی کامران کی طرح پاکستان کا ایک پتھر کاڑوں۔ وہاں کوئی عورت مجھے اپنی زلفوں کی ذخیرہ میں بکڑے اور میں اسے بیاہ کر لے آؤں۔“

”اگر اپنے ملک، اپنی قوم کی کوئی عورت بیاہ کر لے آؤ تو بہتر ہے۔ اپنے ہاں کی عورت جلد ہی مرد کی ہم مزاج بن جاتی ہے۔“

رضا مراد نے ہنسنے ہوئے کہہ ”معاملہ تو ایمریشن کا ہے۔ شادی کرنے کے بعد یہاں کیسے لائیں میرا مسئلہ آسانی سے حل ہو سکتا ہے بشرطیکہ میں کبھی شادی کروں، جس کی امید نہیں ہے۔ مسئلہ تو کامران کا ہے۔ وہ اپنی وائف کو یہاں کیسے لائے گا؟ اسے ہرگز اجازت نہیں ملے گی کیونکہ وہ یہاں کا باقاعدہ شہری نہیں ہے۔“

”اس کے لیے یہ بڑا پر اہم ہے۔“

”جب سے وہ کسی مونا کے عشق میں گرفتار ہوا ہے تب سے درجنوں خطوط لکھ چکا ہے۔ ہر خط میں ایک ہی بات کہ میں فوراً ہی اس کی وائف کے ایمریشن کے لیے کوشش شروع کر دوں تاکہ وہ شادی کے فوراً بعد اسے یہاں لے آئے۔ اب تمہی بتاؤ، میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟ کیا تم کوئی مدد کر سکتے ہو؟“

”اگر برطانیہ کا قانون کسی کی سفارش سے تبدیل ہو سکتا تو میں بڑی بڑی سفارشات حاصل کر سکتا تھا۔“

”ہمارے دنیا میں کوئی بات ناممکن نہیں ہے۔ وہ کامران کا بچہ یہاں آئے گا تو دن رات میرا دلغ کھاتا رہے گا۔ چلیز، کچھ کر نہیں سکتے تو کوئی اچھا سا مشورہ ہی دو۔“

”میرا مشورہ ہے، کسی وکیل کی خدمات حاصل کرو۔ دنیا کے تمام وکیل جو قانون کا احترام کرتے اور اس کا تحفظ کرتے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو قانون کی کمزوریاں تلاش کرتے ہیں اور کبھی کبھی اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اسے الٹ پلٹ کر اپنے مزاج اور مفاد کے مطابق بدل دیتے ہیں۔ شاید کوئی وکیل تمہارے لیے ایسا کر

مراد کے دلخ کو زبردست دھچکا پہنچایا۔ وہ بظاہر مسکراتا رہا اور دماغی صدمے کو چھپاتا رہا۔ اندر اگر طوفان چل رہا ہو۔ لادایک رہا ہو تو اسے چھپاتا حال ہوتا ہے۔ انسان کی حرکتوں سے اس کی اندرونی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ بات بات پر جھجھکانے لگتا تھا۔ بھائی کے کاروبار میں دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے بھائی کے ساتھ رہنا چھوڑ دیا تھا۔ لندن میں ایسے فلیٹ دستیاب ہو جاتے ہیں جہاں کسی کے ساتھ شیئر میں رہا جا سکتا ہے۔ یعنی دو یا تین افراد مشترکہ طور پر کرایہ دے کر وہاں رہ سکتے ہیں۔ وہ ایسے ہی ایک فلیٹ میں رہنے لگے۔ کامران نے اسے بھڑا سمجھایا۔ ”بھئی حالات سے سمجھو۔ کرو۔ دنیا میں ایک ٹینس ہی حسین عورت نہیں ہے، بہت ہیں۔ تم ایک ڈھونڈو گے ہزار ملیں گی۔“

”اس نے جھجھکا کر کہا۔“ اب میں عورتوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں کبھی کسی پر بددعا نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی عورت کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھوں گا۔“

”تم عورت کو شریک حیات کے روپ میں نہ دیکھو۔ اس سے نفرت کرو، یہ تمہارا اپنا معاملہ ہے لیکن عورت کے کئی روپ ہوتے ہیں۔ ماں، بہن، بیٹی اور بھابی۔ تمہیں ٹینس کو بھابی کی حیثیت سے تسلیم کرنا چاہیے۔“

”میں اسے کسی حیثیت سے تسلیم نہیں کروں گا۔ وہ ایک بلا ہے، اس بلا سے دور رہنا ہی دانش مندی ہے۔“

وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ شادی کے چھ ماہ بعد ہی فیا مراد کا ہارٹ میل ہو گیا۔ اسے اپنے بھائی کی آخری رسومات میں شریک ہونے کے لیے اس کے گھر جانا پڑا۔ جب رسومات ادا کرنے کے بعد واپس آیا تو ٹینس نے اس سے معافی مانگی۔ مگر کڑا کر کہا۔ ”جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ۔ اپنے بھائی کے کاروبار کو پوری ذمہ داریوں سے سنبھال لو۔ میری خاطر نہ سہی، اپنے بھائی کے کاروبار کی خاطر اور اپنے بھائی کے ہونے والے بچے کی خاطر یہ طے آؤ۔“

کامران نے بھی دوستی کا واسطہ دیا۔ اسے سمجھایا۔ اس کا دوست ڈاکٹر جان ہنز بھی اس سے ملنے کے لیے آیا۔ اس نے کہا۔ ”تم شکایت کرتے ہو کہ راتوں کو نیند نہیں آتی۔

”تین تین خواب آور گولیاں کھاتے ہو۔ یہ تمہارے لیے نقصان دہ ہے میں تمہیں صرف ایک گولی کھلاؤں گا اس کے بعد تم آرام سے سو جاؤ گے اور صبح وقت پر بیدار ہو سکے گے، لیکن ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”جیسا میں کہوں ویسا ہی عمل کرو۔ اپنے بستر پر چاروں شانے چت لیٹ جاؤ۔“

اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ جہاں وہ لیٹا ہوا تھا، وہاں سے اس کی نگاہیں مائے آتش دان کی طرف جاتی تھیں۔ ڈاکٹر نے وہاں ایک موم بتی روشن کر دی اور کہا۔ ”اب تک تمہیں نیند نہ آئے اس موم بتی کی روشنی کو سکتے رہو۔ صرف ایک ہی بات سوچنے رہو کہ تمہیں حالات سے سمجھوتہ کرنا ہے اور اپنے بھائی کے کاروبار کو سنبھالنا ہے۔ سوچتے سوچتے تھکنے لگو تو آنکھیں بند کر لیتا۔ خود بخود نیند آ جائے گی۔“

اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیا۔ ایک گولی کھائی۔ اس کے بعد آرام سے لیٹ گیا۔ شمع کی لو کو سکتا رہا۔ سوچتا رہا پھر آنکھیں بند کر کے سو گیا۔ صبح بیدار ہوا تو تازہ دم تھا اور یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ بھائی کے کاروبار کو سنبھالے گا۔ وہ کامران سے گھر کی کوئی بات نہیں چھپاتا تھا۔ جو کچھ ہوتا تھا اس سے کہتا تھا اور اس سے مشورہ طلب کرتا تھا۔ اس نے جانا کہ ٹینس پھر آہستہ آہستہ اسے سمجھا رہی ہے کہ دلچسپی کے بعد اس سے شادی کر لے، اگر نہیں کرے گا، تو کاروبار کا بخوارہ ہو گا۔ بیوی اور بچے کو زیادہ ملے گا اور بھائی کو شاید بچہ نہ ملے۔

کامران نے کہا۔ ”یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ٹینس اور اس کے گھر والے دولت کی طرف جھکتے ہیں۔ ویسے بھی لوگ یہی دیکھتے ہیں کہ کھانے کمانے والا لڑکا ہو۔ اچھا کاروبار ہو تو بڑی اسی کو دی جائے اسی لیے انہوں نے ٹینس کی شادی تمہارے بھائی جان سے کی ہے۔ اب وہ بیوہ ہونے کے بعد دوسری شادی نہ کرے اور تمہارے بھائی کی اولاد پیدا کرے تو وہ اپنے بچے کے ساتھ اس کاروبار کی پوری طرح مالک ہو گی۔ اس میں سے شاید ہی تمہیں کچھ حصہ مل سکے۔ اگر تم کاروباری نقطہ نظر سے اس سے شادی کر لو تو سب کچھ تمہارا ہو گا۔“

”میں ایسے کاروبار پر لعنت بھیجتا ہوں۔ میں شینہ کی صورت بھی دیکھنا گوارا نہ کرتا۔“

جب شینہ کو اس فیصلے کا علم ہوا تو اس نے چنچ کے انداز میں کہا۔ ”سیر دیکھو گی کہ میرے مرحوم شوہر کا کاروبار تم کیسے اپناتا ہو۔ یہاں لندن میں ملازمت کرو گے یا بھوکے مرو گے لیکن بھائی کے کاروبار سے ایک ٹکنا نہیں لینے دوں میرا بیٹا ہو گا اور وہی اس کاروبار کا مالک ہو گا۔“

قصہ مختصر جب وقت آیا تو شینہ کا چنچ پورا نہ ہو سکا۔ بچہ پیدا نئیں سے پہلے ہی گیا تھا۔ میجر آپریشن کی نوبت آئی جس کے نتیجے میں وہ جانبر نہ ہو سکی نہ بچہ رہا نہ رہی۔ رضا مراد اپنے بھائی کے کاروبار کا بلا شرکت غیر مالک بن گیا۔

لیکن وہ نفرت کا جو بوجھ مٹی تھی اس کا پودا رضا مراد کے دماغ میں پھل پھول گیا تھا۔ اب اس کے سر میں کبھی درد رہتا تھا۔ کبھی غیظ نہیں آتی تھی اور کبھی گیس شکایت رہتی تھی۔ باہر نفسیات ڈاکٹر جان ہنر کتا تھا۔ وہ نفرت کی دھند میں چھپا ہوا ہم شینہ مر گئی۔ اس سے انتقام نہیں لے سکتا لہذا اپنے آپ کو بیمار بنانے کے انتقام لے رہے۔ اس کا علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ شادی کر لے۔

نفسیاتی مسئلوں ہے کہ شادی کے بعد بیوی خوش اخلاق اور وفادار ہو گی تو بخود نفرت دھلی جائے گی اور اگر وہ بھی عیوفا اور نافرمان ہو تو رضا مراد اس سے نفرت کرے گا جیسے جواباً شینہ سے نفرت کر رہا ہو اور اس سے انتقام لے رہا ہو۔

نفرت کا دریا بننے کے لیے کوئی راست چاہتا ہے۔ اس کا رخ سوڑ دیا جائے یعنی مراد کی زندگی میں محبت کرنے والی بیوی آجائے تو وہ عورت سے محبت کرنا کچھ جائے خود کو بیمار بنا کر رکھنا بھول جائے گا لیکن اس کی زندگی میں جو عورت آئے وہ خوب سمجھ کر آئے۔ شینہ کی نفرت کو تازہ کرنے والی آئے گی تو وہ انتقام میں جنوں کی حد نہ گزر سکتا ہے۔

دوسری بار اس کی زندگی میں ایک اینگو اٹرین لڑکی لیزا آئی۔ تیسری بار شینہ کی دونوں ہی لڑکیوں کی ضرورت اور خوش اخلاق تھیں۔ کامران اور ڈاکٹر جان ہنر نے اسے

بھلیا۔ لیزا یا شینہ کسی سے بھی شادی کرنے پر ہر طرح سے مجبور کیا مگر اس نے جواباً کہا ”شادی اس سے کی جاتی ہے جس پر دل آتا ہے۔ شینہ پر آیا تھا۔ اب کسی پر نہیں آئے گا۔“

اکثر ایسا ہوتا ہے جب کبھی کسی سے دوستی کرنے کے لیے دل چلتا ہے تو پرانی دوستی کا زخم بھر جاتا ہے۔ نئی دوستی آہستہ آہستہ مزاحم رکھتی جاتی ہے اور پچھلی تئلیوں کو ہلاتی جاتی ہے لیکن رضا مراد کی ضد اور نفرت ظاہر کر رہی تھی کہ شاید وہ کسی عورت پر بھروسہ نہیں کرے گا۔

وہ انٹر پورٹ پہنچا تو اس وقت تک طیارہ آچکا تھا۔ اسے دیر ہو چکی تھی۔ کامران اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہی آگے بڑھ کر گلے لگے۔ کامران نے اسے تھپکتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا اچھے بھول گئے تھے؟“

”میں بھلا تمہیں بھول سکتا ہوں؟ تم بھی یاد ہو اور تمہارا کام بھی۔“

”کیا ہوا۔ امیگریشن کے سلسلے میں کوئی بات بن رہی ہے۔“

”نہیں۔ ڈاکٹر جان ہنر کا مشورہ ہے کہ ہم کسی دیکل کی خدمات حاصل کریں۔“

”تو پھر چلو۔ ابھی کسی دیکل سے وقت مقرر کرتے ہیں۔“

”ابھی آئے ہو۔ جلدی کیا ہے۔ پہلے میرے ہاں چلو۔ آرام سے کھائیں گے، پتیں لے۔ کچھ اپنی کہیں گے کچھ تمہاری سنیں گے۔“

کامران نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ”ہرگز نہیں۔ پہلے کام ہو گا۔ میں پہلی فرصت میں دنا کو اپنے پاس بلانا چاہتا ہوں۔“

”ایسی بھی کیا ہے قراری ہے؟ عورت کو زیادہ سر نہیں چڑھانا چاہیے۔“

”یار ایسی باتیں نہ کرو۔ سر چڑھانا تو دور کی بات ہے، میں تو اس سے ٹھیک سے بات بھی نہ کر سکتا۔“

”کیا مطلب؟“

”آہ شادی ہوئی لیکن ایک رات بھی دلہن کے ساتھ نہ گزار سکا۔ تم میری انتہاں سنو گے تو سارے کام چھوڑ کر امیگریشن کا مسئلہ حل کرو گے اور میری مونا کو

میرے دل کی دھڑکنوں تک پہنچاؤ گے۔"

"میں پہلے ہی سمجھ رہا تھا کہ تم آتے ہی پیچھے پڑ جاؤ گے۔ چلو کوشش کرتے ہیں۔"

وہ پارکنگ ایریا میں آئے۔ رضا مراد اپنی کار لے کر آیا تھا۔ اس نے اسٹیرنگ سنبھال کر کہا۔ "آج ایک جگہ بنگلے ہے جس کا نام بے جا ہو گا۔"

"میرا دل دماغ ٹھکانے نہیں ہے، جہاں دیکھا ہوں، مونا ہی منظر آتی ہے۔ کہ بتاؤں۔ اگر اس کے حسن کی تعریف شروع کروں تو....."

"پلیز شروع نہ کرنا مجھے عورت کے حسن سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میری دلچسپی اتنی ہے کہ تم میرے دوست ہو اور مجھے تمہارے کام آتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

"وہ مجبوریاں تو سنو گے جن کی وجہ سے میں شادی کے بعد بھی دیباہی ہوں جیسا یہاں سے گیا تھا۔"

"ہاں سناؤ۔"

وہ سنانے لگا۔ محبت اور مجبوری کی داستان اتنی دلچسپ تھی کہ رضا مراد سنا رہا۔ سچ میں اپنے دوست سے ہمدردی کا اظہار کرتا رہا جب اس کی داستان ختم ہو گئی تو اس نے ہنسنے ہوئے کہا۔ "تم سے ہمدردی بھی ہوتی ہے اور غمی بھی آتی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم میاں بیوی کا دامن نچوڑا جائے تو فرشتے فضا کریں۔"

کامران نے ایک سرد آہ بھری۔ اس کی نگاہوں میں مونا اور اس کی اداسی دکھائی دے رہی تھی۔ رضا مراد نیند چٹیلی کے علاقے میں رہتا تھا۔ اگرچہ تنہا رہتا تھا لیکن چھوٹے سے فلیٹ کو خوب بنا سنوار کر رکھا تھا۔ وہاں پہنچ کر کامران نے کہا۔ "پہلے کسی اسے دن وکیل سے رابطہ قائم کرو۔ اس سے ملاقات کا وقت ملے گا۔ اس کے بعد میرے کراچی والے گھر کے فون پر رابطہ قائم کرو۔ مونا میرے انتقال میں فون کے پاس بیٹھی ہو گی۔"

"ابھی ہم گھر میں داخل ہوئے ہیں۔ ذرا سانس تو لینے دو۔ تم تو مجھے تھکا مارو گے۔"

وہ جھنجھلا تا ہوا فون کے پاس پہنچا۔ پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ کامران نے مسکرا کر کہا۔ "تمہاری آوازیں اکیسی ہیں کہ اس گھر میں ایک بھالی آجائے تو تم پر قربان ہوتی رہے۔"

"پلیز! اپنی دلی کا ذکر کرو۔ میری دلی نہ کوئی ہے اور نہ کوئی ہو گی۔"

"یار! شاید بہت اچھی ہے۔ لیذا بھی کم نہیں ہے لیکن شانہ ہم مذہب ہے ہم دہم دہم ہے، ہم مزاج بھی ثابت ہو گی۔"

"اگر تم یہ بکواس کرو گے تو فون نہیں کروں گا۔"

کامران نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر اشارے سے کہا کہ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولے گا۔ رضا مراد نے رابطہ قائم ہوتے ہی وکیل کو مخاطب کیا۔ پھر اس سے وقت ملے کرنے کے سلسلے میں باتیں کرنے لگا۔ کامران قریب آکر مراد کے چہرے کو یوں تک رہا تھا جیسے اس کے چہرے کے رد عمل سے وکیل کا جواب معلوم کرنا چاہتا ہو۔ اس نے کہا۔ "آپ کل کا وقت دے رہے ہیں۔ میرا دوست صبح تک مر جائے گا۔"

دوسری طرف سے وکیل نے پوچھا۔ "کیا اسے پھانسی ہونے والی ہے؟"

"جناب! قانون کے پھندے سے زیادہ عورت کا پھندا مضبوط ہوتا ہے۔"

وکیل کی آواز سنائی دی۔ "میں سمجھ گیا۔ ہم جیسے وکیلوں کا اشارہ کافی ہوتا ہے۔"

تمہارا دوست اپنی بیوی سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ پیچھا تو ہم جیسے مرد چھڑا لیتے ہیں۔ ایک بار دھوکا کھاتے ہیں، بیٹھ لے لے کان پکڑ لیتے ہیں لیکن میرے دوست کو اس کی محبت پاکستان سے کان پکڑ کر میاں تک لائی ہے۔ جب تک وہ اپنی بیوی کو میاں نہیں بلائے گا، محبت اس کے کان نہیں بھونے گی، لہذا یہ انگریزوں کا معاملہ ہے۔"

"یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چنگی بھانجے ہی کام ہو جائے گا۔"

"ہم بھی چنگی بھانجے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ میرا دوست یہاں کا باقاعدہ شہری نہیں ہے۔ اس کی بیوی وڈن ویزا پر چنہ مارے کے لیے آ سکتی ہے مگر میرے دوست کے ساتھ مستقل نہیں رہ سکتی اور وہ اسے مستقل اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ اب یہ مسئلہ کیسے حل

”کہہ دیا، کل صبح ملاقات ہوگی۔“

”ذرا اپنی ڈائری پر نظر ڈالیں کریں۔ ہو سکتا ہے آج شام کا وقت نکل آئے۔“

”سوری، تمہاری خاطر میں صبح سات بجے ملاقات کر سکتا ہوں۔ نو بجے کورٹ۔“

”ہے۔ اس کے بعد دوپہر کو ملاقات ہو سکتی ہے۔ جلدی بولو، کون سا وقت مناسب ہے۔“

”جلدی بولنے کی بات ہے تو صبح سات بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ ہم حضر

نہیں گے۔“

اس نے ریسپور رکھ دیا۔ کامران نے مایوس ہو کر کہا۔ ”میں آج کی شام اور آج

رات کیسے گزاراؤں گا؟“

رضا مراد نے ریسپور اٹھا کر غبر ڈال کر کہے ہوئے کہا۔ ”تم تو ایسے کہہ رہے

جیسے وکیل سے ملتے ہی تمہاری مونا یہاں چلی آئے گی۔“

”اے فوراً بلا نہیں سکتا اس کی آواز تو سن سکتا ہوں۔“

”میں وہی کرنے جا رہا ہوں۔ ذرا انتظار کرو۔ ابھی اس کی آواز سنائی دے گی۔“

کامران وہاں سے چلا ہوا صوفوں کے پاس آیا۔ اس نے سوٹ کیس کو اٹھا کر بیٹا

ٹھیل پر رکھ لیا پھر اسے کھولنے کے بعد ایک اہم کو نکال کر دیکھنے لگا۔ اس کا صفحہ اٹھنے

مونا کی مسکراتی ہوئی صورت نظر آئی۔ وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔ اسے یوں لگا جیسے قسم

کے سامنے نہیں مونا کے دربرو پہنچ گیا ہو۔ اس نے آہستگی سے کہا۔ ”ہیلو۔“

تصویر میں جان پڑ گئی۔ مونا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہیلو۔“

”ہیلو مونا! کیسی ہو؟“

مونا نے پھر کہا۔ ”ہیلو۔“

”ہیلو، ہیلو! یہ بار بار ہیلو ہیلو کیوں کہہ رہی ہو؟ کچھ اور بھی تو کہو۔“

رضا مراد نے کہا۔ ”ایسا عشق تو نہیں دیکھ لے ٹیلیفون ادھر ہے اور ادھر ہیلو ہیلو

رہے ہو۔ بھائی فوراً چلے آؤ۔ رابطہ قائم ہو گیا ہے۔“

وہ اہم کو چھوڑ کر دوڑتا ہوا آیا۔ پھر اس نے ریسپور جھپٹ کر کان سے لگاتے

کہنے لگا۔ ”ہیلو مونا! کیا یہ تم ہو؟“

دوسری طرف سے اس کے پلاکی کی آواز سنائی دی۔ ”بیٹے میں ہوں۔ کیا تم خیریت

منہ پہنچ گئے ہو؟“

”نہیں پاپا! میں بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ کو شش کر کے جلدی سے مونا کا

رہنما دینا ہوا دیں۔“

”تم فکر نہ کرو۔ ایک ہفتے کے اندر رپورٹ تیار ہو جائے گا۔“

”پاپا! ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے۔ آپ ذاتی طور پر کو شش کریں گے تو جلد ہی

رپورٹ مل جائے گا۔ آپ مونا کو ریسپور دیکھئے۔“

ایک لمحے کی خاموشی رہی۔ پھر اس نے چیخ کر پوچھا۔ ”مونا! کیا یہ تم ہو؟“

دوسری طرف سے مٹی کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو پاپا! میں صدقے میں داری،

تمہاری آواز سن کر اطمینان ہوا کہ تم وہاں خیریت سے پہنچ گئے ہو۔“

”نہیں! جی! میں خیریت سے پہنچ گیا ہوں۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ ریسپور مونا کو

دیں۔“

پھر ایک لمحے کی خاموشی رہی۔ اس نے پھر چیخ کر پوچھا۔ ”ہیلو مونا! کیا یہ تم ہو؟“

اس بار اس کی آپا کی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو بابی! تم خیریت سے تو ہو؟ میں تمہاری

لہولہ رہی ہوں۔“

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ”میری عمر کے لحاظ سے آپ کی آواز تیس برس پرانی ہو چکی

ہے۔ بلینز آپا! آپ سب نے میرے تمام دروازے بند کر دیے تھے۔ ٹیلیفون کا دروازہ تو

کھلا دیکھئے۔ مجھے اس کی آواز سننے دیجئے۔ مونا کو ریسپور دیجئے۔“

”اے کس مونا کی بات کر رہے ہو؟ بڑا تھنا اس پر..... تمہارے جاتے ہی گھر

بھگ گئی۔“

”کیا کہہ رہی ہیں؟“

”جج کہہ رہی ہوں۔ تم ادھر گئے ادھر وہ یہاں آئی! اپنا تمام سامان اور زیورات

سینے اور سیکے چلی گئی۔

اس کے بعد اس کی می کی آواز سنائی دی۔ ”شبابش بیٹے! ہمارے لیے بڑی ہو پیند کی۔ ہمارا نام خوب روشن کرے گی۔“

”می ریسور پلایا کو دیجئے۔“

دوسرے ہی لمحے اس کے پلایا کی آواز سنائی دی۔ کامران نے پوچھا ”ابھی آپ مجھ سے گفتگو کرتے وقت مونا کا سپورٹ بنوانے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس کے تفصیلات کیوں نہیں بتائیں۔“

”میں بتانے جا رہا تھا لیکن تمہاری می نے ریسور لے لیا۔ بیٹے! وہ خود نہیں اسے جانے پر مجبور کیا گیا ہے۔ میں گھر میں موجود ہوتا تو اسے نہ جانے دیتا۔ تم کو تو وہاں لے آؤں۔ ویسے اس ماحول سے بہتر وہ اپنے گھر میں رہے گی اور تمہارا انتظار کم کی۔“

”ٹھیک ہے پلایا! اسے سیکے میں رہنے دیں۔ میں ابھی اس سے رابطہ قائم کروں آپ کو پھر فون کروں گا“ خدا حافظ۔“

اس نے ریسور رکھ کر رضا مراد کو مونا کے پڑوسی کا نمبر بتایا ”بھرا کمل۔“ پلیر! اس رابطہ قائم کرو۔ یقیناً وہ میرا انتظار کر رہی ہو گی۔“

وہ پھر رابطہ قائم کرنے لگا۔ کامران وہاں سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے اندر دھچکی ہوئی تھی۔ وہ دوسرے سے آدھر ٹھٹکے لگے مونا اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھی وہ سوچ رہا تھا ”چائیں! اس کی می اور آپا بیچوہ نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے کہ وہاں سے جانے پر مجبور ہو گئی۔ اسے غصہ بھی آ رہا تھا اور وہ پریشان بھی ہو رہا تھا۔“ دس منٹ بعد رابطہ قائم ہوا۔ اس نے ریسور اٹھا کر کمل۔ ”ہیلو! کیا آپ مونا کے پڑوسی ہیں؟“

”جی ہاں! میں ان کا پڑوسی ہوں۔ مونا یہاں ٹیٹھی انتظار کر رہی ہے“ بات کریں۔ پھر مونا کی آواز سنائی دی۔ وہی مہترم آواز تھی۔ وہی شیریں لہجہ تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”ہیلو کالی! تم نے کہا تھا پاکستان کے وقت کے مطابق چھ بجے اور وہاں کے وقت

مطابق تقریباً ڈیڑھ بجے پہنچو گے۔ میں ڈیڑھ بجے سے ٹیٹھی انتظار کر رہی ہوں۔“

”اور میں اس وقت سے انتظار کر رہا ہوں جب طیارہ کراچی ایئر پورٹ سے پرواز کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہاں پہنچوں گا کہ تمہاری آواز سنوں گا۔ گھر پر فون کیا تو پتا چلا کہ تم سیکے میں ہو۔ مونا جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔ سیکے میں ہی رہو۔ میں نے یہاں آئی ہے ایک وکیل سے ملاقات کا وقت طے کیا ہے۔ کل صبح سات بجے تمہارے متعلق باتیں ہوں گی۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ تم دعا کرو۔ تمہارے یہاں آنے کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔“

”میری ہر سانس دعا کر رہی ہے۔ مجھے کسی طرح بلاؤ۔ کسی بھی طرح بلاؤ۔“

”مونا! تمہاری بے قراری میری بے قراری ہے۔ تم میرے جذموں کو اس طرح بھجھ سکتی ہو کہ یہاں پہنچتے ہی میں نے کو شیشیں شروع کر دی ہیں۔“

وہ باتیں کر رہا تھا۔ دوسری طرف رضا مراد دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے ناگواری سے منہ بنا رہا تھا۔ اس کے باوجود باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ کامران دوسرے دن مونا سے گفتگو کرنے کے لیے وقت مقرر کر رہا تھا۔ پھر اس نے ریسور رکھتے ہوئے کمل۔ ”کیوں اس طرح کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے بیٹھے ہو۔ کوئی کام نہیں ہے تو میری شادی کا اہم دیکھو۔ میری مونا کو دیکھو گے تو پوچھتے ہی رہ جاؤ گے۔“

وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری مونا اور دنیا کی ساری موناؤں کو دور سے سلام۔ وہ تمہاری بہتی مہکراتی یادوں کا اہم ہے، تمہیں مبارک ہو۔ میرے لئے میرا برنس ایم ہے“ اس لیے خدا حافظ۔ رات کو ملاقات ہو گی۔“

وہ چلا گیا۔ کامران مونا کے خیالوں میں بہتا ہوا سوٹ کیس کے پاس آیا۔ پھر اہم کھول کر اس کی تصویریں دیکھنے لگا۔ وہ دونوں دوسرے دن سات بجے وکیل کے پاس پہنچے۔ اسے ساری روداد سنائی۔ وکیل نے پاپس ہو کر کمل۔ ”مسٹر کامران! تمہارے پاس درک پرمٹ نہیں ہے تم یہاں کوئی کام نہیں کر سکتے“ تو اپنی دانف کو باقاعدہ کیسے بلا سکتے ہو؟ اسے کچھ عرصے کے لیے بلاؤ۔ وہ تمہارے ساتھ چند مہینے رہے گی۔ یہاں کی سیر کرے گی۔ پھر واپس چلی جائے گی۔“

”میں مکی تو نہیں چاہتا۔ وہ میری شریک حیات ہے۔ اس لیے میری حیات کے ساتھ رہے گی۔“

”پھر تو سیدھا سارا سہ ہے جس طرح تم یہاں رہتے ہو، اسی طرح تمہاری بیوی بھی بے قاعدہ شہری بن کر رہ سکتی ہے۔“

کامران نے کلمہ ”میں اس پہلو پر غور کر چکا ہوں۔ ہم جیسے مرد یہاں کے بے قاعدہ شہری بن کر رہ سکتے ہیں لیکن عورت نہیں رہ سکتی۔“

دیکل نے پوچھا۔ ”کیوں؟“

فرض کیجئے، میری بیوی میرے ساتھ ہے۔ چند ماہ بعد یا چند سال بعد اس کے پاؤں بھاری ہو جائیں وہ میرے بچے کی ماں بن جائے تو وہ بچہ کہاں کا شہری کہلائے گا۔ اسے برتھ سرٹیفکیٹ کہاں سے ملے گا؟ برطانیہ سے یا پاکستان سے؟ ہمارا بچہ تو کہیں کا نہیں رہے گا کیوں کہ وہ برطانیہ میں پیدا ہو گا اور یہاں کے قانون کے مطابق پہلے اس بچے کے ماں باپ کو یہاں کی شہریت کا ثبوت دینا ہو گا۔ اسی طرح اس بچے کو پاکستان کی شہریت حاصل نہیں ہو سکے گی کیوں کہ وہ برطانیہ میں پیدا ہو گا۔“

دیکل نے کلمہ ”یہ کر سکتے ہو کہ جب تمہاری دائف ماں بنے والی ہو تو اسے پاکستان بھیج دیتا۔ وہاں بچے کی ولادت ہو گی۔“

”رضا مراد نے کلمہ“ دیکل صاحب! ذرا سوچ کچھ کر مشورہ دیجئے۔ ہم ایٹائی باشندے ہیں۔ ہر سال ہمارے یہاں بچے ہوتے ہیں۔ کیا ہر سال اس کی بیوی پاکستان چلیا کرے گی؟“

دیکل نے کلمہ ”پھر تو بڑی مشکل ہے۔ بھی سیدھی سی بات ہے مسٹر کامران! تم یہاں کا باقاعدہ شہری بننے کے لیے درخواست کیوں نہیں دیتے۔ تم چار برس سے یہاں ہو۔ تمہارا ریکارڈ یقیناً اچھا ہو گا۔“

”اچھا نہیں ہے۔ میں مسٹر مراد کی مٹی کیب اچھنی کا ڈرا نیور ہوں۔ مسافروں کے اصرار کرنے پر دو بار میں نے گاڑی غلط جگہ پارک کی۔ اس کا چالان ہوا۔ تیسری بار ایکسٹنٹ ہو گیلہ میں پولیس کی نظروں میں آگیا۔ آپ کو یاد ہو گا؟ اب سے چند برس پہلے

یہاں کے شرپند نیزی قسم کے انگریز نوجوان نے نسلی فسادات شروع کیے تھے۔ اس مسئلے میں کتنے ہی قتل ہوئے۔ تخریبی کارروائیاں ہوتی رہیں۔ میں ایک امن پسند شہری ہوں۔ اپنا کما کما ہوں، اپنا کما کما ہوں لیکن اس ہنگامے کی پٹیٹ میں آگیا۔ پولیس والوں نے مجھے بھی دھریا۔ ایک ماہ جیل میں گزار کر آیا ہوں۔ مختصر یہ کہ میرا نام پولیس والوں کی لسٹ میں ہے۔ میرے پاس اتنے مری کا ریکارڈ نہیں ہے۔ میں کس منہ سے باقاعدہ شہری ہونے کے لیے درخواست پیش کروں؟“

”یہ معاملہ پیچیدہ ہے۔ مجھے سوچنے کا وقت دو اور ایک ہفتے بعد ملاقات کرو۔“

”ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے۔ آج کل کا وقت دیجئے۔“

رضا مراد نے کلمہ ”کامران! ذرا صبر سے کام لو۔ انہیں اس مسئلے پر اچھی طرح سوچنے دیجئے اور تمہارے لیے کوئی راستہ نکالنے کا وقت دو۔ اس وقت تک تمہاری بیوی کا پاسپورٹ وغیرہ تیار ہوتا رہے گا۔“

مراد سمجھا بھجائے اسے وہاں سے لے آیا۔ ایک ہفتہ گزارنا مشکل قتلہ روز بلیغوں کے ذریعے گفتگو نہیں ہو سکتی تھی۔ اتنے اخراجات بھلا کون برداشت کر سکتا تھا لیکن کبھی کبھی گفتگو ہوتی تھی۔ مراد نے سمجھایا۔ ”تم اپنے آپ کو زیادہ مصروف رکھو۔ آل گیٹ میں دکان لگانے کے لیے صرف اتوار کو چلیا کرو۔ باقی تمام دن میرے ہاں رہ کر مٹی کیب چلیا کرو۔“

وہ خود کو زیادہ سے زیادہ مصروف رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک ہفتہ گزار گیا۔ دیکل صاحب نے مشورہ دیا۔ ”میں نے تمہارے معاملے میں غور کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ قانون راستہ روکے تو غیر قانونی راستے اختیار کیے جاتے ہیں۔ تم کوئی ایسا پاکستانی باشندہ تلاش کرو جو تمہارا نام ہو اور جو یہاں کا باقاعدہ شہری ہو۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“

”اور کیا ہو گا۔ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ تمہارا پورا نام کیا ہے؟“

”کامران مرتضیٰ۔“

”فرض کرو یہاں لندن میں ایک ایسا پاکستانی ہے جس کا نام کامران مرتضیٰ ہے۔ وہ

یہاں کا قاعدہ شری ہے۔ وہ تمہاری وائف کو یہاں بلا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے تمہاری بیوی کو یہاں رہنے کے حقوق حاصل ہو جائیں گے۔“

رضا مراد نے کلمہ ”وکیل صاحب! آپ تو کمائیوں والی باتیں کر رہے ہیں۔ بھلا کامران مرتضیٰ نامی کوئی شخص یہاں کیسے ہو سکتا ہے۔ اگر مل بھی گیا تو کیا ضروری ہے کہ وہ قاعدہ شری ہو اور اگر وہ قاعدہ شری ہو تو کیا ضروری ہے کہ ہمارے کام آئے؟“

”میں نے کمائیوں والا مشورہ نہیں دیا ہے۔ جو بھی غیر قانونی واقعات پیش آتے ہیں وہ کمائیوں کی طرح دلچسپ بن جاتے ہیں۔ لوگ اسے دلچسپ سمجھیں یا کلمائی۔ تمہارا دوسرا سوال یہ ہے، ”کون تمہارے کام آئے گا؟“ یہی تم اس کے دوست ہو۔ تم اس کا ساتھ دے رہے ہو تو یہی اس کے کام آجائے۔“

”جناب! میرا نام رضا مراد ہے۔“

وکیل نے کلمہ ”یہ کسی قانون کی کتب میں لکھا ہوا ہے کہ..... رضا مراد اپنا نام تبدیل نہیں کر سکتا؟ میری خدمات حاصل کرو۔ میں عدالتی کارروائی کرتا ہوں۔ تم اپنی طرف سے بیان دو کہ اپنا نام تبدیل کر رہے ہو۔ رضا مراد کی بجائے کامران مرتضیٰ کا نام اختیار کر رہے ہو۔ آج سے تمہارا کارڈ بار کامران مرتضیٰ کے نام سے جاری رہے گا۔ تم کارڈباری اور سماجی زندگی میں کامران مرتضیٰ کے نام سے جانے پہچانے جاؤ گے۔ جب میرے ذریعے تمہارا نام قانونی طور پر تبدیل ہو جائے گا تو تمہارا شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ از سر نو نئے نام سے تیار ہوں گے۔ تم دونوں اس مسئلے پر مشورہ کر کے مجھے اپنے فیصلے سے آگاہ کرو۔“

رضا مراد نے ایک زور کا قہقہہ لگایا۔ ”میں نام تبدیل کروں۔ واہ! کیا میرا دماغ خراب ہو گیا ہے؟“

کامران نے اسے اتھا آہستہ نظروں سے دیکھا۔ رضا مراد نے پوچھا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا میری دوستی پر شبہ کر رہے ہو؟ کامران! میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔ نام بدلنا کون سی بڑی بات ہے لیکن میں جو نام تبدیل کروں گا وہ تمہارے حوالے سے ایک عورت کے لیے ہو گا اور مجھے عورتوں سے سخت نفرت ہے۔“

وکیل نے کلمہ ”سنو! آپ دونوں یہاں بحث نہ کریں۔ مجھے کام کرنے دیں پلیز۔“ وہ وکیل کے چیمبر سے باہر آگئے۔ ایک پب میں پہنچ کر رضا مراد نے آؤر دیا۔ ”اسکاچ وہ ہاٹ دائرہ۔“

کامران نے کلمہ ”یار! یہ کوئی پینے کا دقت ہے؟“ ”میرے لیے چینی کا بھی دقت نہیں ہے۔ دوستی مجھے آزمائش میں مبتلا کر دی ہے۔“

”یہ کون سی بڑی آزمائش ہے؟ نام تبدیل کرنے میں کون سی قحاحت ہے؟“ ”یہ میرے باپ دادا کا رکھا ہوا نام ہے۔ ہر شخص کو سمجھن ہی سے اپنے نام سے جتنی محبت ہوتی ہے۔ شاید کسی اور نام سے اتنی محبت نہیں ہو سکتی۔ کیا تم اپنے پیدائشی نام سے پیچھا چڑا پند کرو گے؟“

”ہم ایک دوسرے پر جان دینے کا دعویٰ کرتے ہیں پھر نام کیسے تبدیل نہیں کر سکتے۔ میں تمہاری خاطر ایسا کر سکتا ہوں۔“

ان کے سامنے اسکاچ کے دو پیگ آگئے۔ کامران پتا نہیں تھا لیکن دستور یہ تھا کہ جب بھی رضا مراد کامران کے ساتھ کسی پب میں جاتا تھا تو کامران کے نام پر ایک پیگ منگواتا تھا اور اس کے نام پر خود ہی پی جاتا تھا۔

اس نے پہلے اپنے نام کا پیگ جلتی سے اتارنا۔ پھر خالی جام کو رکھنے کے بعد دوسرے جام کو اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ تمہارے نام کا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو؟ میں تمہاری خاطر اپنے باپ دادا کا رکھا ہوا نام چھوڑ نہیں سکتا؟ ضرور چھوڑ سکتا ہوں لیکن تم میرے دوست ہو تو میرے دماغ سے سوچ۔ میری آنکھ سے عورت کو دیکھو تو جیسے بھی نفرت ہو گی۔ میرے دوست! اس عورت سے شادی کر کے آئے ہو تو اسے وہیں رہنے دو۔ اسے سزا دو۔ تم اسے سزا دو گے تو مجھے روحانی خوشی حاصل ہو گی۔ وہاں پاکستان میں ایک ٹینڈر کو تمہارے ہاتھوں سزا ملی رہی ہے۔ تم میرا انتقام لیتے رہو گے۔“

وہ دوسرا پیگ حلق سے اتارنے لگا کامران اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا مجھے پاگل سمجھتے ہو؟“

”پاکل نہیں جھوٹی۔ ایک ٹینہ کی بے وفائی نے تمہیں اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ اگر تمہارا نفسیاتی تجزیہ کروں تو تم ٹینہ سے آج بھی محبت کرتے ہو۔ تمہارے لاشعور میں یہ سوال جھٹکا ہے اور ٹینہ سے پوچھتا ہے۔ اے عورت! تم نے مجھ سے کیوں بے وفائی کی؟ یہ بات تمہارے لاشعور میں اس لیے نقش ہے کہ تم آج بھی اس سے محبت کرتے ہو۔ چونکہ محبت کرتے ہو اس لیے اتنی شدت سے نفرت کا اظہار کرتے ہو۔“

رضا مراد اس بات پر جھنجھلا کر اٹھ گیا۔ دو بیگ کاٹل ادا کر کے وہاں سے باہر آ گیا۔ پھر تیزی سے ادھر جانے لگا جہر انہوں نے مٹی کب کو کھڑا کیا تھا۔ کامران تیزی سے اس کے پیچھے آیا۔ پھر ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ ”ایک انسان ذہنی طور پر بیمار ہوتا ہے تو وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی نقصان پہنچاتا ہے۔“

”میں نے جس کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔“

”پہنچا رہے ہو، اگر نارمل ہوتے، اگر تم ذہانت سے سوچتے تو اس نتیجے پر پہنچ کر دنیا میں صرف ایک ٹینہ نہیں ہے۔ دنیا کی ساری عورتوں نے بے وفائی اور دنیا کے تمام مردوں نے وفا شکاری کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا ہے۔ مرد ہو یا عورت، دونوں ہی بے وفا بھی ہو سکتے ہیں اور وفا دار بھی۔ تم ایک ٹینہ کی بے وفائی کا انتقام میری موت سے لے رہے ہو۔ اگر تم ذہنی طور پر نارمل ہوتے تو دوست کی حیثیت سے میری محبت کو محبت کی نظر سے دیکھتے۔ نفرت سے یوں کھڑانے کی کوشش نہ کرتے۔“

وہ مٹی کب کے پاس آئے۔ رضا مراد دروازہ کھول کر اسٹیرنگ سیٹ پر بیٹھا چاہتا تھا۔ پھر ٹھک گیا۔ دور درخت ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے جیرائی سے بولا۔ ”ٹینہ.....“

اس کے منہ سے ٹینہ کا نام سن کر کامران نے اس سمت دیکھا جہر رضا مراد دیکھ رہا تھا۔ فٹ پاتھ پر دوڑ ایک مشرقی لڑکی نظر آئی۔ وہ جست پا جامہ اور کرتا پہنے ہوئے تھی۔ کامران نے رضا مراد کے قریب آ کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے؟“

رضا مراد نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ دیکھو، ٹینہ آ رہی ہے۔“

”کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ وہ ٹینہ نہیں ہے۔ دوسری لڑکی ہے۔“

اس وقت تک لڑکی قریب آگئی تھی۔ فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی نگاہوں کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ رضا مراد نے یکبارگی اپنے دل کی جگہ سینے کو ایک ہاتھ سے تھام لیا۔ خرقہ کاٹنے لگا۔ اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ پھر بھی وہ بڑی مشکل سے کہہ رہا تھا۔ ٹی..... میں..... میں مرضیں سکھ عورت کی بے وفائی مجھے نہیں مار سکتی۔“

وہ گرتا ہی چاہتا تھا کہ کامران نے سنبھال لیا۔ ذرا ہی سہارا دے کر اسٹیرنگ سیٹ پر بٹھایا۔ پھر کہا۔ ”میں کسی قریبی ڈاکٹر سے کونسل کر رہا ہوں۔ ابھی آتا ہوں۔“ اس نے کامران کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”کسی سے نہیں، صرف ڈاکٹر جان ہنٹر سے کونسل کرو۔ میں ٹیلی فون ہاتھ ہے، ٹیلی فون کرو۔“

کامران دوڑتا ہوا ایک ٹیلی فون ہاتھ میں پہنچا۔ پھر ڈاکٹر ہنٹر سے رابطہ قائم ہوتے ہی اس نے ڈاکٹر ہنٹر کو رضا مراد کے متعلق بتایا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میرے پاس لے آؤ، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے ریسور رکھ لیا۔ پھر ہاتھ سے باہر نکل کر تیزی سے دوڑتے ہوئے مٹی کب کے پاس آیا۔ اسٹیرنگ سیٹ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”ڈاکٹر نے تمہیں بتایا ہے اور کہا ہے کہ پریشان ہونے کی بات نہیں ہے۔ تم فوراً ٹھیک ہو جاؤ گے۔“ اس نے گاڑی اشارت کی پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کر ہوا ڈاکٹر کی طرف جانے لگا۔ رضا مراد سیٹ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ ابھی اس کے سینے پر دل کی جگہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے کرب میں مبتلا ہو۔

آدھ گھنٹے بعد وہ ہسپتال کے ایک بستر پر پڑا ہوا تھا اور ڈاکٹر ہنٹر اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”پھر تم نئی بیماری لے آئے۔ تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح چاروں شانے چٹ لینے رہو اور چھت کو نکتے رہو۔ جیسا میں کہوں، ویسا کرتے رہو۔“

اس نے ہدایت پر عمل کیا۔ اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیے۔ چھت کی طرف نکتے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اب تم سانس روک لو اور دس بار کومہ میں حالات سے سمجھو کہ رہا ہوں۔“

نہیں کروں گا۔“

ڈاکٹر نے ایک ذرا توقف کے بعد کہل۔ ”اسے کوئی بیماری نہیں ہوتی۔ یہ بیماری اپنے اوپر پر مسلط کر لیتا ہے۔ جب ٹینڈ شدت سے یاد آتی ہے تو یہ کئی طرح سے سوچتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر یہ کاروبار کا مالک ہوتا، اپنے بھائی کی جگہ خود ہوتا تو ٹینڈ اس کی ہوتی چونکہ وہ بڑے بھائی کا محتاج تھا لہذا اس کی محتاجی نے اسے ٹینڈ سے دور کر دیا۔ وہ ٹینڈ سے بے انتہا نفرت کرنے کے باوجود اس سے بے انتہا محبت کرتا ہے۔ چونکہ اس کی محبت سے نجات حاصل نہیں کر سکتا اس لیے زیادہ سے زیادہ نفرت کا اظہار کرتا ہے اور انتقام اپنے آپ کو بیمار بنا لیتا ہے۔“

”یہ بات میں سمجھ گیا لیکن یہ فوراً ہی آپ کے علاج سے کس طرح اچھا ہو جاتا ہے؟“

”نفیاتی طریقہ کار کے ذریعے پہلے ہم اپنی شخصیت سے متاثر کرتے ہیں۔ میں نے دو برس کے عرصے میں اسے اپنا گہرا دوست بنا لیا ہے۔ میں جب بھی اسے کوئی دوا کھانے کے لیے دیتا ہوں تو اس سے پہلے دوا کے کھلانے اور اس دوا کے اثر انداز ہونے کے لیے ایک ماحول پیدا کرتا ہوں۔ تم نے دیکھا کہ اسے کئی راتوں سے نیند نہیں آتی تھی۔ خواب آور گولیاں بھی اثر نہیں کرتی تھیں۔ میں نے ایک رات اسے بستر پر سلا یا پھر اس کے آگے ایک شمع روشن کر دی۔ اسے ہدایت دی کہ وہ شمع کی لو کو تکتا رہے اور جو کوسں دہی کھتا رہے۔ وہ میری ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ دراصل یہ کچھ نہیں ہے۔ محض نفیاتی طریقہ کار ہے۔ مریض کے لیے ایک ماحول پیدا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس ماحول کے مطابق میں نے رضا مراد کو ایک نفعی سی خواب آور گولی کھانے کو دی اور اسے نیند آگئی۔ وہ صبح تک آرام سے سوتا رہا۔ تمہیں یہ سن کر تعجب ہو گا کہ وہ خواب آور گولی نہیں تھی۔“

کامران نے حیرانی سے پوچھا۔ ”پھر وہ کیا چیز تھی؟“

”کچھ نہیں، بس ایک عام سی گولی تھی۔ اسے کوئی بھی کھالے تو اچھا براری انکشن نہیں ہوتا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہارے سامنے جو گولی میں نے اسے کھانے کے لیے دی

وہ سانس روک کر دس بار کھنے لگا۔“ میں حالات سے سمجھوتہ کر رہا ہوں۔“

اس کے بعد ڈاکٹر نے کہل۔ ”شمايش‘ اب گہری گہری سانس لو۔ پھر سانس روکنے کے بعد کہو۔ ایک عورت کی بے وفائی مجھے اہمارل نہیں کر سکتی۔“

اس نے چند لمحوں تک گہری گہری سانس لیں۔ پھر سانس روک کر کہنے لگا۔

”ایک عورت کی بے وفائی مجھے اہمارل نہیں کر سکتی۔“

کامران ایک طرف کھڑا ہوا پہلی بار نفیاتی علاج کا ایسا طریقہ دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اپنی اسٹنٹ کو ایک دوا لانے کے لیے کہل۔ وہ ایک چھوٹی سی ڈبیہ لے کر آئی جس میں سرخ رنگ کی گولیاں تھیں۔ ڈاکٹر نے اس میں سے ایک گولی رضا مراد کو کھانے کے لیے دی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر اسے نگل کر پانی پینے لگا۔ ”اب تم آرام سے لیٹ جاؤ۔ ہم تمہیں پانچ منٹ کے لیے تنہا چھوڑتے ہیں۔ تم اس تھالی میں ایک بات اپنے دماغ سے کرتے رہو گے۔ وہ یہ کہ مردشہ زور ہے، شہ زور رہے گا۔ عورت اسے کمزور نہیں بنا سکتی۔“

یہ سمجھانے کے بعد ڈاکٹر نے سرخ رنگ کی گولیوں کی وہ ڈبیہ اسے دی اور کہل۔

”جب بھی ایسی کوئی تکلیف ہو تو اس میں سے ایک کھالیا کر لہ آرام آ جا یا کرے گا۔ ہم پانچ منٹ کے لیے جا رہے ہیں۔ پھر آئیں گے۔“

وہ سب کمرے سے باہر آ گئے۔ کامران نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”مراد کی حالت کب تک یوں ہی رہے گی۔ اچانک کوئی بیماری اسے لاحق ہوتی ہے پھر آپ کے پاس آتے ہی وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

ڈاکٹر نے جتنے ہوئے کہل۔ ”میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ کیا تم اسے اپنے آپ تک محدود رکھو گے؟“

”ہاں ضرور۔ آپ مجھے بتائیے۔ میں اس کے لیے پریشان رہتا ہوں۔“

”تم اسے بہت چاہتے ہو، کیس ایسا نہ ہو، میرے طریقہ علاج کی حقیقت اسے بتا دو۔ پھر میرے ٹریٹ منٹ کا بھی اس پر اثر نہیں ہو گا۔“

”میں اپنے دوست کی بھائی چاہتا ہوں۔ جس میں اس کا نقصان ہو، ایسی کوئی بات

ہے وہ دماغن بی کی گولیاں ہیں جسے عام طور پر کوئی بھی کھا سکتا ہے۔
”عجب ہے وہ ایسی بے گئی دواؤں سے فوراً اچھا ہو جاتا ہے۔“

”دراصل ہم جیسے باہر نفسیات اپنے مریضوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم جو کچھ ہیں جو کرتے ہیں مریض پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ ہم نفسیاتی تجزیے اور نفسیاتی علاج کے ذریعے مریض کو اس مقام پر لے آتے ہیں جہاں معمولی اور بے اثر دوائیں اثر کرنے لگتی ہیں۔ جو بات ہم اس کے دماغ میں بٹھاتے ہیں، وہ اسی کے مطابق ان دواؤں سے اثر لیتا ہے اور خود ساختہ بیماریوں سے نجات حاصل کرنے لگتا ہے۔ تم کئی بار دیکھ چکے ہو اسے نیند نہیں آتی تھی۔ ایک معمولی سی بے نام سی گولی کھا کر نیند آنے لگی۔ اسے گیس کی شکایت تھی۔ وہ شکایت دور ہو گئی۔ آج اس کے دل میں درد اٹھ رہا تھا۔ میں نے دماغن لیکو کی گولی کھانے کو دی اور اب چل کر دیکھ لو۔ وہ بڑ سکون ہو گا۔“

وہ کمرے کے اندر آئے۔ واقعی وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ بڑ سکون نظر آ رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی ہنسنے سے اترتے ہوئے بولا۔ ”ڈاکٹر! سو سو ری۔ میں بار بار تمہیں زحمت دیتا رہتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ دوست ہی کس کام کا جو دوست کی دی ہوئی زحمت کو خندہ پیشانی سے قبول نہ کرے لیکن مراد تم مجھ سے دوستی نہیں بھارہے ہو۔“
”یہ سراسر الزام ہے۔ میں آپ کی ہر بات مانتا ہوں۔“

”مانتے ہو تو پھر شادی کر لو۔ لیرا یا شائندہ دونوں ہی اچھی لڑکیاں ہیں۔ آخر انہیں آزما لینے کیا ہرج ہے؟“

وہ کچھ کھانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔
”چلو ایسا کر شادی نہیں کرتے تو کسی عورت سے دوستی کرو۔ اس کے ساتھ کچھ وقت گزارو۔ یوں تقریباً بھی ہوگی اور اسے آزاتہ بھی رہو گے۔ اگر وہ عورت ضرورت مند ہوئی تو تم انسانی ہمدردی کے تحت اس کے کام بھی آتے رہو گے۔“

کامران نے کہا۔ ”اس کنبہت کو انسان نہ کہو۔ یہ میرے کام نہیں آ رہا ہے۔ میں اپنی ذائقہ کو اس کے ذریعے جھکسانا یا سکھوں لیکن یہ انکار کر رہا ہے۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ اگر کامران کی دانتک تمہارے ذریعے یہاں پہنچ سکتی ہے تو تمہیں ہر طرح تعاون کرنا چاہیے۔“

”آپ مجھے پانچ منٹ کے لیے اس کمرے میں چھوڑ کر گئے تھے۔ میں آپ کی ہدایت کے مطابق کہہ رہا تھا۔ حادثہ زور سے شہ زور رہے گا۔ ایک عورت اسے کمزور نہیں بنا سکتی۔ ایسا کہنے کے دوران مجھے کامران یاد آ رہا تھا۔ اس کی محبت اور اس کی مونا یاد آ رہی تھی۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی خاطر اپنا نام تبدیل کروں گا اور اس کی محبت اس کو واپس دلاؤں گا۔ جب میں نے یہ فیصلہ کیا تو مجھے بڑا سکون محسوس ہوا۔ میں نے چشم قبور سے دیکھا، میں مونا کے کام آ رہا ہوں اور شینہ شرمندہ ہو رہی ہے۔ ندامت سے کہہ رہی ہے۔ مراؤں میں تمہاری قدر نہیں کی۔ تم اتنے اچھے ہو کہ ایک عورت کی بے وفائی کے باوجود دوسری عورت سے بھرپور تعاون کر رہے ہو اور اسے اس کے محبوب تک پہنچا رہے ہو۔“

کامران نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”کیا واقعی تم نے فیصلہ کر لیا ہے؟ تم میری خاطر اپنا نام تبدیل کر دو گے؟ میری مونا کو میرے پاس بلاؤ گے؟“

اس نے کامران کے دونوں شانوں کو مضبوطی سے تھام کر کہا۔ ”میں اپنے ڈاکٹر دوست کی ہدایت کے مطابق خود کو تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ شاید نام تبدیل کرنے سے مجھ میں تبدیلی آ جائے۔ اس طرح تمہارا بھی کام بن جائے۔ ہم ابھی وکیل سے مل کر نام تبدیل کرنے کے سلسلے میں ضروری کارروائیوں کا آغاز کریں گے۔“

آواز ہو گیا۔

ایک طرف رضا مراد وکیل سے رابطہ قائم کرنے لگا۔
دوسری طرف کامران نے مونا کو تفصیل سے خط لکھا۔ اسے سمجھایا کہ ایک دوست ان کی خاطر کس طرح قربانی دے رہا ہے۔ اپنے پاپے دادا کے رکھے ہوئے پیدا کی نام سے دستبردار ہو کر اس کی خاطر کامران مرتضیٰ بن رہا ہے۔ لہذا جب وہ یہاں آئے اور کسی طرح کی انکوائری ہو تو وہ رضا مراد کو کامران مرتضیٰ تسلیم کرے۔

خط کے جواب میں فون کے ذریعے گفتگو ہوئی۔ مونا نے کہا۔ ”میں کبھی کسی شخص

کو کامران تسلیم نہیں کر سکتی۔ اسے کامران کہنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ خدا خواست کسی غیر مرد کو اپنا بھروسہ دے دیں۔ اللہ ایسا کہنے سے پہلے میری زبان جل جائے۔

”دیکھو مونا! ضد نہ کرو۔ بس یہی ایک راستہ ہے۔ میں تمہیں یہ نہیں کہتا کہ رضا مراد کو شوہر تسلیم کرو۔ ایسا کہنے یا کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ پاسپورٹ اور نکاح نامے کی زد سے تم کامران مرتضیٰ کی بیوی ہو۔ میں بھی قانون کے محافظ یہی دیکھیں گے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ تمہارے قریب رضا مراد موجود رہے گا لیکن میں بھی رہوں گا تم رضا مراد کو صرف کامران مرتضیٰ کہہ دیتے۔ شوہر نہ کہتا اور ہم ایسا کہنے کا موقع ہی نہیں دیں گے۔“

تھوڑی دیر بعد مونا کی آپا نے ریسپور لے کر کہا۔ ”کامران! اس لڑکی کا دماغ جل گیا ہے۔ اتنا اچھا موقع ہاتھ سے گنوا چاہتی ہے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں اسے یہاں سے روانہ کر دوں گی۔ یہ تھوڑی دیر کے لیے تمہارے دوست کو کامران مرتضیٰ کہہ دے گی۔ تم وہاں سے لکٹ اور ویرا روانہ کرو۔“

دو ہفتے میں تمام کام مکمل ہو گیا۔ ایک طرف مونا اور اس کی آپا سے معاملات طے ہو گئے۔ دوسری طرف رضا مراد کا نام قانونی طور پر تبدیل ہو گیا۔ اب اس کے کالج کے دروازے پر اور مٹی کیب انجینی کے دفتر میں کامران مرتضیٰ کے نام کی تختی لگ گئی تھی۔ اس نئے نام سے اس کا ذرا ٹونگ لائنس اور پاسپورٹ وغیرہ تیار ہو رہے تھے۔ مونا کے لیے اسی نام کی زوجیت کے اعتبار سے لکٹ اور ویرا روانہ کر دیا گیا تھا۔

وہ میاں بیوی تھے لیکن ایک دوسرے کے ایسے عاشق تھے کہ ایسے میاں بیوی کی مثال مشکل سے ملتی ہے۔ شاید اس لیے کہ میاں کو اب تک بیوی حاصل نہیں ہوئی تھی اور بیوی کو اب تک میاں حاصل نہیں ہوا تھا اور جب تک ایک دوسرے کو حاصل نہ کیا جائے اس وقت تک میاں اور بیوی محبوب اور محبوبہ ہی رہتے ہیں۔

پھر ایک دن ٹیلیفون کے ذریعے پتا چلا، مونا کو لکٹ اور ویرا مل چکا ہے۔ وہ دوسرے دن کی فلائٹ سے آ رہی ہے۔ یہ ایسی خبر تھی کہ کامران نے خوشی سے ایک جھج ماری اور ریسپور سمیت مراد سے لپٹ گیا۔ اس نے کہا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو۔ میں مراد

ہوں۔ مونا اور ریسپور میں ہے۔ باتیں کرو۔“

پھر باتیں ہونے لگیں۔ اور مونا خوشی سے باتیں کر رہی تھی۔ کھلکھلا رہی تھی۔ کامران نے کہا۔ ”ہزاروں میل کی دوری سے تمہاری یہ سنگدلتی ہوئی ہنسی میرے اندر اپجلی پیدا کر رہی ہے۔ آج میں خوشی کے مارے سو نہیں سکوں گا۔“

مونانے کہا۔ ”تمہیں ضرور سونا چاہیے۔“

”سمجھ گیا۔ آج سونا چاہیے۔“ رات جاگتا ہے۔ اود خدا! انتظار کے کتنے عذابوں اور آزاروں کے گزرنے کے بعد کل ملن کی رات آئی گی۔“

رضا مراد نے اپنے کلاں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔

اس رات کامران سونہ سکا۔ اور سر سے سکا۔ اور سر کو نہیں بدلتا رہا۔ کبھی یوں لگتا تھا جیسے نیند میں ہو، کبھی یوں جیسے پینا دیکھ رہا ہو اور کبھی پتا چلتا تھا، نہ سوتا ہو، نہ جاگ رہا ہو، نہ پینا دیکھ رہا ہو۔ بس سوچ کی وادیوں میں گم ہو۔ جیسے وہ رات کی چھاؤں میں نہیں مونا کی سیاہ زلفوں میں چھپا ہوا ہو۔

صبح پانچ بجے اچانک ہی فون کی تھنپی بجنے لگی۔ وہ دوڑتا ہوا رضا مراد کے کمرے میں گیا۔ مراد ریسپور اٹھا کر بات کر رہا تھا۔ اس نے کہا ”یقیناً مونا نے فون کیا ہو گا۔ پانچ بج رہے ہیں۔ پاکستان میں دس بج رہے ہوں گے۔ وہ روانہ ہو رہی ہو گی۔ اس سے پہلے مجھے فون کر رہی ہے۔ مجھے ریسپور دو۔“

رضا مراد نے ہاتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تمہارا فون نہیں ہے۔“

وہ دوسری طرف کی باتیں سننے لگا۔ پھر اس نے کہا۔ ”اچھی بات ہے۔ ملازم آپ انتظار کریں۔ گاڑی آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔“

اس نے ریسپور رکھ کر کہا۔ ”کالی! مونا کی فلائٹ یہاں ایک بجے کے بعد پہنچے گی۔ تم وقت نہیں گزار سکو گے۔ لٹرا خود کو مصروف رکھو۔ ابھی گاڑی لے کر ریسٹ اسٹریٹ چلے جاؤ۔ وہاں ہوٹل سے فیئر کے کمرہ نمبر دو بتائیں میں اٹلی کی ایک فلمی اداکارہ شہری ہوئی ہے۔ اس نے ہماری گاڑی چھ گھنٹے کے لیے انکج کی ہے۔ تم چھ گھنٹے آسانی سے گزار لو گے۔ مناسب آمدنی بھی ہو جائے گی لٹرا فوراً سنا ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کرو۔ آدی بنو

اور گاڑی لے کر یہاں سے نکل جائے۔

ہے۔

فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریمور اٹھایا۔ اس کی مٹی کب ابجی کا ایک ملازم کہہ رہا تھا۔ ”سرا! ہماری گاڑی کا ایکسٹنٹ ہو گیا ہے۔ کامران صاحب ڈنمارک ہل کے کنکس گاڑی ہسپتال میں پڑے ہوئے ہیں۔ آپ فوراً وہاں پہنچیں۔“

”کیا اسے سخت چوٹیں آئی ہیں؟“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ ہسپتال سے ہماری ابجی کے نمبر پر اطلاع دی گئی۔ میں آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔“

اس نے ریمور رکھ کر گھڑی دیکھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کے اندر ایئر پورٹ پہنچنا ضروری تھا۔ اس سے پہلے ہسپتال جانا اور کامران کے حالات معلوم کرنا ضروری تھا۔ اس نے اپنی گاڑی کی چابی لی۔ کامران کے سوٹ کیس کو کھول کر اس اہم کو دیکھنا چاہا جس میں مونا کی تصویریں تھیں لیکن سوٹ کیس مقفل تھا۔ کامران کے دوسرے سامان میں اور اس اتارے ہوئے لباس میں چابی نہیں ملی۔ ایک بار کامران نے اسے اہم دیکھنے کے لیے کہا تھا مگر اس نے اہم کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور اب مونا کی تصویر کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر وہ اپنے دوست کی دلہن کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

وقت ضائع کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے کالج کو لاک کیا۔ اپنی گاڑی میں بیٹھا پھر تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا ہسپتال پہنچا۔ پتا چلا وہ جنرل وارڈز میں زخموں سے بچر ہے۔ ڈریسنگ وغیرہ ہو چکی ہے۔ اب دوا کے اثر سے سو رہا ہے۔ اس وقت اس سے ملنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس نے فون کے ذریعے ڈاکٹر جان ہنر کو کامران کے متعلق بتایا۔ پھر کہا۔ ”تم یہاں کے ڈاکٹروں سے معلوم کرو“ یہ کب تک بیدار ہو گا۔ اگر تھوڑی دیر بعد آنکھ کھلے گی تو یہ زخموں کی پردا کیے بغیر ایئر پورٹ جانا چاہے گا۔ کسی روک ٹوک کو خاطر میں نہیں لائے گا۔ تم ڈاکٹروں کے ذریعے اسے یقین دلا سکتے ہو کہ میں مونا کو لے کر سیدھا ہسپتال آؤں گا۔“

ڈاکٹر ہنر سے بات طے کر کے جب وہ ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوا تو طیارے کی آمد کا وقت ہو چکا تھا۔ شاید وہ آچکا ہو گا۔ مونا پہلی بار آ رہی تھی اس کے استقبال کے

وہ دوست بھی تھا، پاس بھی تھا، کاروباری بھی تھا۔ یہ وقت گزرنے کا مشغلہ بھی تھا۔ دوستانہ مشورہ نہایت ہی معقول تھا۔ اس طرح چھ گھنٹے آسانی سے گزر جاتے اور آمدنی بھی ہو جاتی۔ اس نے پندرہ منٹ کے اندر ہی منہ ہاتھ دھو کر لباس تبدیل کیا۔ پھر جانے لگا۔ گاڑی میں بیٹھے سے پہلے مراد نے کہا۔ ”کاروبار کی طرف بھی دھیان دو۔ جس کے پاس جا رہے ہو وہ ایک فلی اداکارہ ہے۔ مس روزانہ کلاتی ہے۔ اگر وہ چھ گھنٹے کے بعد ساتویں گھنٹے بھی انکج رکھنا چاہے تو انکار نہ کرنا مونا آجھ گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچے گی۔“

مراد ہو تو وہاں سے سیدھے ایئر پورٹ چلے آئے میں وہیں انتظار کروں گا۔ کامران نے ایئر ٹرک سیٹ پر بیٹھے ہوئے کہا۔ ”تم کاروبار کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارے کسی بھی کسٹمر کو ناراض نہیں کروں گا لیکن میری غیر موجودگی میں مونا کا فون آیا

تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ مونا اس وقت طیارے میں سفر کر رہی ہو گی۔ فون کے ذریعے تو نہیں ہاں خیالوں میں جنہیں دیکھ رہی ہو گی۔ تم بھی اسے دیکھتے چلے جاؤ۔“ وہ چلا گیا۔ مضامراد وہیں کھڑا ہوا اسے جانتے دیکھتا ہوا اور سوچتا رہا کیا محبت اسے کہتے ہیں۔ کیا کامران میرے مقابلے میں زیادہ خوش نصیب ہے۔ اسے پار کرنے والی عورت ملی جو اپنے رشتے داروں کو اپنے بچپن کے ماحول کو اپنے ملک کو چھوڑ کر اس کی محبت میں سات سمندر پار چلی آ رہی ہے۔ کیا واقعی عورت محبت کرنا جانتی ہے؟

اس کے دماغ میں الجھن سی ہونے لگی۔ یوں لگا شینہ آدمی بن کر چلی آ رہی ہے۔ اس نے فوراً ہی خود پر قابو پانے کی کوشش کی۔ تیزی سے چلا ہوا کالج کے اندر آیا۔ پھر ہاتھ روم میں پہنچ کر شاور کو کھول کر اس کے نیچے کھڑا ہو گیا۔ غسل کرنے کے بعد اس نے ناشا کیا۔ اس دوران اس کے دماغ کے دروازے پر دھمکیوں ہوتی رہیں۔ شینہ آنا چاہتی تھی وہ دروازہ کھولنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے مونا کی فلاحیت کے وقت تک خود کو کاروباری معاملات میں مصروف رکھنے کی کوشش کی۔ چھ گھنٹے کے بعد اس نے گھڑی دیکھی۔ ساتواں گھنٹہ گزر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کامران ساتویں گھنٹے کے لیے بھی انکج رکھا گیا

لے کوئی اہانہ ہوتا تو پریشان ہو جاتی۔ خاص طور پر اینگریشن والے اسے پریشان کر سکتے تھے۔ بہر حال وہ اینگریٹ پچاننا تو ظاہر دن دے پر اتر رہا تھا۔ اس نے گاڑی کو پارکنگ ایریا میں چھوڑا۔ تیزی سے چلا ہوا عمارت کے اندر آیا۔ وہاں سے گریٹر لابی میں پہنچا۔ پھر ریٹنگ کے ساتھ کھڑا رہ کر آنے والے مسافروں کو دیکھنے لگا۔ ابھی زیادہ مسافر نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا، 'مونا کو کیسے پہچانے گا۔ اس فلائٹ سے پاکستانی مرد، عورتیں اور بچے زیادہ آئے تھے۔ ایسی پاکستانی لڑکیاں نظر آ رہی تھیں جن کے تعلق یہ فیصلہ کر دشوار تھا کہ وہ شادی شدہ ہیں؟ کنواری ہیں؟ یا بیٹی بیچتا ہیں؟'

پھر یکبارگی اس کے ذہن کو جھکا سالگ۔ مسافروں کی بھیڑ میں ٹھینہ نظر آ رہی تھی۔ اس لابی کی طرف چلی آ رہی تھی۔ آتے آتے کبھی کسی مسافر کی آؤں میں چھپ جاتی تھی، کبھی جھلکنے لگتی تھی۔ اس کا وجود سرعام کہہ رہا تھا۔ 'تم نفرت کرتے رہو' میں آنکھ پھولی پھولی رہوں گی، آتی رہوں گی۔"

رضا مراد نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ چلا ٹھینہ نہیں ہے کوئی اور ہی بے انتہا کی حسین لڑکی ہے، جو ٹھینہ کی طرح جھلکتی ہے اور اپنے حسن کا سکہ بھی بھاتی ہے اور وہ حسن کا سکہ بھانے والی مونا تھی۔

مونا اگرچہ ٹھینہ سے مشابہت نہیں رکھتی تھی۔ دونوں کے چہروں اور ناک ننتوں میں واضح فرق تھا۔ اکثر لڑکیاں قد، جسامت اور رنگ روپ میں ایک جیسی ہوتی ہیں لیکن ٹھینہ سے ایک مماثلت تھی۔ مونا اس کی طرح ساری پنپے ہوئے تھی۔ ساری پنپنے کے انداز میں ایسی دلکشی تھی، جیسے وہ موبیں مارتی ہوئی نڈیا ہو۔ اس کی لہریں کرن کرن چمک رہی ہوں اور وہ لہر لہر بہتی چلی آ رہی ہو۔

وہ گریٹر لابی میں آ گئی تھی۔ کبھی آس پاس کبھی دور دور تک تلاشی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ کوئی اپنا نظر نہیں آ رہا تھا۔ رضا مراد کی حالت عجیب سی ہو رہی تھی۔ دماغ کستا تھا، وہ ٹھینہ نہیں ہے۔ دن کستا تھا، ٹھینہ دوسرے روپ میں آ رہی ہے۔ دیے وہ کوئی بھی ہو آخر ٹھینہ کی ذات تو ہے، عورت تو ہے اور عورت وہ بلا ہے۔ جس سے شدید نفرت کرتے رہنے کے باوجود غیر شعوری طور پر محبت کرتے رہنے کا انکشاف ہوتا ہے۔

اس کے دماغ میں آمدنیاں سی چلنے لگیں۔ وہ سوچ رہا تھا، 'مونا کے یہ حسن مجسم ٹھینہ نہیں ہے لیکن میں رضا مراد کب ہوں؟'

اور اگر یہ مونا ہے تو میں کامران مرتضیٰ ہوں۔

مونا بڑی بڑی کنوڑہ سی سیاہ آنکھوں سے ادھر ادھر پریشان ہو کر دیکھ رہی تھی۔ کامران کو تلاش کر رہی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے ایک ہنی جھگل کا راست بھول کر شہروں میں آ پھنسی ہو۔ اب کھلی دعوت ہے، کوئی بھی شکاری آگے بڑھ کر شکار کر لے۔

اس کی صورت، اس کا سراپا، اس کی سنجیدگی، اس کی دل آویز شخصیت اور رعب حسن ایسا تھا کہ نظریں اس پر سے ہٹا نہیں جاسکتی تھیں۔ رضا مراد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ 'ٹھینہ کیا ہے؟ لیرا کیا ہے؟ شائد کیا ہے؟ ان تینوں کے حسن کا کاک ٹیل بنایا جائے تب جا کے مونا کے نام کے جام گھرائے جاسکتے ہیں۔'

وہ غزالی آنکھوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ 'یہ قیامت کی نظر کسے ڈھونڈ رہی ہے؟'

جواب ملا۔ "مجھے ڈھونڈ رہی ہے۔ کیونکہ میں کامران مرتضیٰ ہوں۔"

جو کامران مرتضیٰ ہسپتال میں پڑا ہوا ہے، وہ پاکستان میں مونا کا شوہر تھا۔ وہ شوہر برطانیہ میں غیر قانونی ہے۔

میں قانونی شوہر ہوں۔ کیونکہ یہ میری برطانوی شہریت کے ذریعے آئی ہے۔ میرے لیے آئی ہے، ہاں میرے لیے آئی ہے۔"

اجہاک اس کے دل میں درد ہونے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے دل کی جگہ پیٹنے کو بکڑ لیا۔ وہ قرقر کر رہا تھا۔ دوسرا ہاتھ جیب میں ڈال کر چھوٹی سی ڈیبی نکال رہا تھا۔ پھر اس نے ڈیبی سے سرخ رنگ کی گولی نکالی اور اسے منہ میں رکھ لیا۔

ہوتا ہے، ایسا ہوتا ہے، کوئی ارادہ بدلتا ہے، کوئی فطرت بدلتا ہے، کوئی نظر بدلتا ہے، ابھی وہ تیار تبدیل رہا تھا۔

مونا کی تلاشی نظریں بھٹکتے رہنے کے بعد رضا مراد پر ٹھہر گئیں۔ مراد کا نامراد دل دھک سے رہ گیا۔ ابھی ابھی اس نے دل کو آرام پہنچانے کے لیے ایک گولی

کھلی تھی۔ اس کے بلجود موتی نگاہیں گولی کی طرح دل میں بیوست ہو رہی تھیں۔ بے اختیار اوسر کھنچا جا رہا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر پوچھل۔ ”کیا تم موتا ہو؟“

وہ ایک دم سے خوش ہو کر بولی۔ ”کیا آپ مسز رضا مراد ہیں؟“

”نہیں۔ بے چارہ رضا مراد مرچکا ہے۔ تم سمجھ سکتی ہو اسے تمہاری خاطر مرنا ہے۔“

پہلے تو وہ یہی سن کر حیران تھی کہ اس کے شوہر کا جال غار دوست مرچکا ہے۔ ۱
نے مزید حیرانی سے پوچھل۔ ”آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ رضا مراد کو میری خاطر کیوں مرنا پڑا؟“
”وہ نہ مرنا تو دوسرا کامران مرتضیٰ کیسے پیدا ہوا؟ یہ ناچیز تمہارا کامران مرتضیٰ ہے۔“

موتا کے دماغ میں یہ بات پتھر کی طرح لگی۔ وہ خود کو اس کا کامران کہہ رہا تھا۔ برداشت کرتے ہوئے بولی۔ ”میرے کامران صاحب کہاں ہیں؟“

”وہ ہسپتال میں ہے۔“

”وہ ناگوار سے بولی۔“ مجھے مذاق پسند نہیں ہے۔

”جلی کھو“ وہ ہسپتال.....“

وہ بات کٹ کر بولی۔ ”پلیز“ مسز مرادا آپ نے خود کو مردہ کہل۔ آپ مذاقا خود“
مار کتے ہیں لیکن میں اپنے سالک کے سلسلے میں کوئی مذاق برداشت نہیں کر سکتی۔“

”میں ہسپتال کا فون نمبر بتا رہا ہوں۔ تم خود ہی رابطہ قائم کر کے تصدیق کر لو۔“

”آپ میرے شوہر کے قابل اعتماد دوست ہیں۔ میں آپ پر بھروسہ کر سکتی ہوں لیکن دل نہیں مانتے۔ کھجلی بار جب فون کے ذریعے منگھو ہوئی تو وہ بالکل نمیک ٹھاک تھا پھر اب کیسے.....؟“

وہ بیمار نہیں ہے۔ حادثے کا شکار ہو کر ہسپتال پہنچ گیا ہے۔ یہ حادثہ تقریباً اڑھائی گھنٹے پہلے پیش آیا۔ ہم یہاں سے سیدھے ہسپتال جائیں گے۔ تمہارا سامان کہاں ہے؟“

اس کی بات سنم ہوتے ہی ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ”ہیلو موتا“ تم یہاں ہو۔ یہ

نے تمہارا سامان ٹرائی پر رکھ دیا ہے اسے کلکٹ کر لو۔“

ایک پاکستانی میاں بیوی ان کے قریب آگئے۔ موتا نے رضا مراد سے کہل۔ ”یہ

میرے ہم سفر مسز اخلاق احمد ہیں اور یہ بیگم اخلاق۔“

بیگم اخلاق نے مسکراتے ہوئے رضا مراد کو دیکھل۔ پھر موتا سے کہل۔ ”ان سے بھی

تعارف کراؤ۔ کیا یہی مسز کامران مرتضیٰ ہیں؟ یعنی تمہارے وہ؟“

موتا نے جینپٹ کر مراد کو دیکھل۔ وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ مراد نے فوراً ہی کہل۔

”جی ہاں“ مجھے کامران کہتے ہیں۔“ اس نے اخلاق احمد سے مصافحہ کیل بھراس کی بیگم سے

کہل۔ ”آپ میری دلہن سے میرا نام پوچھ رہی ہیں۔ میں نے سنا ہے، آج بھی مشرق کی

غور تیس شوہر کا نام نہیں لیتیں۔ اسے جی۔ اوئی۔ جی۔ اوئی۔ جی۔ اوئی کہہ کر زندگی گزار دیتی

ہیں۔“

اس کی بات پر سب ہنسنے لگے۔ صرف موتا سنجیدہ اور پریشان تھی۔ وہ اخلاق اور

بیگم اخلاق کے سامنے مراد سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے فوراً کامران کے پاس پہنچایا

جائے۔ پھر بھی اس نے کہل۔ ”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

انھوں نے اپنے اپنے سامان کی ٹرائی سمجھالی۔ دو صفر ایک دوسرے سے رخصت

ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی موتا نے کہل۔ ”مسز مرادا! آئندہ آپ کسی کے سامنے خود کو

کامران کے نام سے متعارف نہ کرائیں۔“

اس نے سامان کو ڈکی میں رکھنے کے بعد اسے بند کیل۔ پھر اپنا کارڈ نکال کر دکھاتے

ہوئے کہل۔ ”یہ کارڈ اور قانونی کاغذات مجھے کامران کہتے ہیں۔ تقدیر نے صرف مجھے

کامران نہیں، جنمیں بھی بیگم کامران بنایا ہے۔ یہاں کے قانون کے سامنے اس حقیقت

سے انکار کرو گی تو ایگریگیشن دالے جنمیں بیس سے پاکستان واپس بھیج دیں گے۔ تم اپنے

شوہر کا منہ بھی نہیں دیکھ سکو گی۔“ وہ پریشان ہو کر اس کا منہ کٹنے لگی۔ اس نے اگلی سیٹ

کا دروازہ کھولتے ہوئے کہل۔ ”او“ بیٹھ جاؤ۔“

”نن نہیں۔“ اس نے بے اختیار انکار کیل۔ پھر کہنے لگی۔ ”میرا مطلب ہے۔ میں

چیچے بیٹھوں گی۔“

”میں آگے بیٹھ کر گاڑی چلاؤں گا اور تم پیچھے بیٹھو گی تاکہ لوگ مجھے تمہارا شو فرما
تمہارا ملازم سمجھیں۔“

”لوگ یہ بھی تو سمجھ سکتے ہیں کہ میں ملازم ہوں، اپنے مالک کی کار میں پیچھے بیٹھ
کر جارہی ہوں۔“

”ہم لوگوں کو یہ کیوں سمجھنے دیں؟ ساتھ بیٹھنے میں ہرج کیا ہے؟“

وہ یکتخت اداس ہو گئی۔ بڑے دکھ سے بولی۔ ”جس کے ساتھ مجھے بیٹھنا چاہیے،
تقدیر جانتے کیوں اس سے دور کرتی جارہی ہے ہماری شادی ہوئی تب بھی ہم ساتھ نہیں
رہ سکے۔ میں اتنی دور چلی آئی، اب بھی ان سے دوری ہے۔“

”مونا! میں تمہارے دکھ کو سمجھتا ہوں۔ یہ تقدیر اور تقدیر کی جنگ ہے۔ تم دونوں
مل بیٹھنے کی تدبیر کرتے ہو۔ تقدیر اپنی ستم طرینی سے باز نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ تو
نہیں ہے کہ تم کسی اور کے ساتھ نہ بیٹھو۔“

وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی۔ رضا مراد نے ہاتھ اٹھا کر کہہ۔ ”ایک بات اچھی طرح یاد
رکھو۔ یہاں صرف تمہارا کامران ہی تمہارے لیے سب کچھ نہیں ہے۔ میں کامران کا بہت
گہرا بہت پیارا دوست ہوں۔ اس رشتے سے تم بھی مجھے پیاری ہو۔“

مونا نے چونک کر سر اٹھاتے ہوئے اسے دیکھ۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”میرا مطلب
ہے مجھے بہت عزیز ہو۔ یہ مانا کہ تمہاری نظروں میں کامران سب کچھ ہے لیکن یہاں زندگی
گزارنے کے لیے میرے سارے کی بیوش ضرورت پڑے گی۔ اگر تم مجھ سے تعاون نہیں
کرو گی تو خواہ مخواہ پریشانیوں کا سامنا کرنی روگی اور میں تمہیں پریشان نہیں دیکھنا چاہتا۔
پلیز بیٹھ جاؤ۔“

وہ بیٹھ گئی۔ اس نے دروازے کو بند کیا۔ پھر دوسری طرف سے گھوم کر اینٹریک
سیٹ سمیٹال لی۔ گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھانے لگا۔ مونا سوچ رہی تھی۔ رضا مراد
دوست کہہ رہا ہے۔ اتنی بڑی دنیا میں صرف شوہر پر مجبور نہ نہیں کیا جاتا ہے دوسرے
رشتے داروں اور شوہر کے دوست احباب پر بھی مجبور نہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر یہ پایا دلس
ہے۔ یہاں مراد کے حوالے سے آئی ہوں۔ لہذا اس پر کسی نہ کسی حد تک اعتماد کرنا ہی ہو

گا۔

مراد نے کہہ۔ ”معلوم ہوتا ہے میرے دوست نے میرے متعلق کچھ زیادہ نہیں
بتایا ہے۔ اگر وہ مکمل تعارف کرا دیتا تو تم یہاں آتے ہی آنکھیں بند کر کے مجھ پر اعتماد
کرنے لگتیں۔“

”میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی، جس سے بے اعتمادی ظاہر ہو، اگر ساتھ بیٹھنے
سے انکار کیا ہے تو یہ بے اعتمادی نہیں بلکہ عورت کا مزاج ہے۔ خصوصاً مشرقی عورتوں کا
مزاج ہے جو قاصر رکھنے کی عادی ہوتی ہیں۔“

وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا۔ عورت ہے۔ دیکھا ہوں تو پھول ہے، سمجھتا ہوں تو
پتھر ہے۔ اصل میں عورت کو بڑی سہولت سے موم کرنا پڑتا ہے۔ میں مونا کو دیکھتے ہی کچھ
زیادہ جلد باز ہو گیا ہوں۔ مجھے بڑے قفل سے کام لینا چاہیے۔ اگر میں اس کے مزاج کو
اور اس کی اہم ضروریات کو سمجھ لوں تو اسے اپنی طرف مائل کرنا آسان ہو جائے گا اور
ضروریات کو سمجھنا ہی کیا ہے۔ یہ پردیس میں آکر صرف کامران پر اعتماد کر رہی ہے۔ اگر
کامران نہ ہو تو کس پر اعتماد کرے گی؟ اگر کامران مجبور ہو جائے، محتاج ہو جائے اور اسے
سارا دینے کے قابل نہ رہے تو یہ کس کا سارا ڈھونڈے گی۔ کیوں کہ میرے ہی حوالے
سے یہ یہاں آئی ہے۔ میرے بغیر پردیس میں یہ ایک قدم نہیں چل سکے گی۔ میری مرضی
کے بغیر کسی کی انگلی بھی نہیں تھام سکے گی۔

وہ ہسپتال پہنچ گئے۔ کامران خواب آور دوا کے زیر اثر نہیں تھلا۔ وہ جاگ رہا تھا۔
ڈاکٹر جان ہنر، اس کے پاس بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”اگر میں نہ آتا تو تم ایک سپاہی کی طرح
اتنے سارے زخم جتانے بیوی سے ملنے چلے جاتے۔“

”ڈاکٹر! پلیز مجھے جانے دیجئے۔ مونا آنکھی ہو گی۔“

”میں کہہ چکا ہوں، مراد اسے لینے گیا ہے، آتا ہی ہو گا۔ تمہاری دیوانگی دیکھ کر
سوچ رہا ہوں، کش مراد میں بھی ایسی دیوانگی کسی کے لیے پیدا ہو جاتی تو وہ ذہنی مریض نہ
رہتا۔ بالکل نارمل ہو جاتا۔“

کامران بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بار نظر اٹھاتے ہی اس کے

”تم ایسا بات کہہ رہے ہو جو دوستوں کے احمق کو نہیں پہنچاتی ہے۔“
”میں اپنے دوست کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت فراخ دل ہے۔ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ مونا میری دوا ہے تو ہو سکتا ہے وہ اس سے دستبردار ہو جائے۔“
”اگر تمہیں یہ اعتماد ہے تو جاؤ اور کامران سے بات کر لو۔“

”حوصلہ نہیں ہو رہا ہے۔ تم ڈاکٹر ہو۔ ایک ڈاکٹر کی زبان سے اسے سمجھا سکتے ہو کہ مونا میری زندگی کے لیے کتنی اہم ہے۔ اگر وہ مونا کو چھوڑ دے گا تو اس کا کچھ نہیں بچے گا۔ میں اس کا بڑے سے بڑا مطالبہ پورا کروں گا۔ دو دن ایسے ہی وقت انتظار لیتی رہے۔ میں اس کے کام آؤں گا۔ ہر طرح کام آؤں گا۔ وہ میرے کام آجائے۔“
”مسٹر مراد! مونا کو تم نے ابھی دیکھا ہے۔“

اس نے کہہ ”قطع کلائی کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ میرا نام مراد نہیں کامران مرقفی ہے۔“

ڈاکٹر نے اسے تشویش بھری نظروں سے دیکھ کر کہہ ”تم ہمارے لیے مراد ہو۔ تم نے ایک دوست کی خاطر اپنا نام تبدیل کیا ہے۔“
”جب میں دوست کی خاطر ب کچھ کر سکتا ہوں تو کیا وہ میری خاطر یہ نہیں کر سکتا؟“

”تم مجرد عقل سے کام لو۔ میں یہ کہنے جا رہا تھا کہ ابھی مونا آئی ہے۔ پہلی بار تم نے دیکھا ہے۔ پہلے اپنے آپ کو پرکھنے کی کوشش کرو۔ یہ عقل جذباتی معاملہ تو نہیں ہے۔ جذباتی نہ ہو مگر لگاؤ ہو جائے تب بھی مشورہ دوں گا کہ اسے ذہن سے نکلنے کی کوشش کرتے رہو۔ یہ ابھی بات نہیں ہے کل مجھ سے ملاقات کرو۔ میں تمہیں.....“

اس نے پھر بات کاٹ کر کہہ ”ڈاکٹر! کل بہت دور ہے۔ میں آج کا دن کیسے گزاروں گا۔ رات مجھے نیند نہیں آئے گی۔ مجھے وہ خواب آ رہا ہے کہ میں کھار سوکوں۔“

”میں ابھی اسی ہسپتال سے ایک گولی لا کر دے دوں گا۔“
”ایک سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے کم از کم تین چار گولیاں چاہئیں۔“

”کیا خودکشی کا ارادہ ہے؟“
”کم از کم دو کھانوں کا تاکہ کمری نیند آ سکے۔“
”میں ایک ہی گولی دیتا ہوں اور تم نے بار بار آزمایا ہے، ایک سے ہی تمہیں کمری نیند آ جاتی ہے۔“
”آج نہیں آئے گی۔ آج جاگتا رہوں گا۔ تب بھی وہ نگاہوں کے سامنے ہو گی۔ سو تارہوں کا تب بھی خواب میں آئے گی۔“

ڈاکٹر نے ایک کمری سانس لے کر کہہ ”تمہارا کس پھر بگڑ رہا ہے۔ میں سمجھ رہا تھا“ نارمل ہو رہے ہو۔ کسی لڑکی کو پسند کرنے کی وجہ سے اس کے بعد تمہیں میرے علاج کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بہر حال انتظار کرو۔ میں تمہارے لیے دوا لے کر آتا ہوں۔“
وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ رضا مراد چند لمحوں تک سوچتا رہا۔ پھر وہ بیٹھا نہ رہ سکا۔ ڈیننگ روم سے نکل کر اس جزل وارڈ کے دروازے پر پہنچا جہاں ایک بستر پر کامران پڑا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک مونا کے ہاتھوں میں تھا۔ میاں پوری کا انداز بڑا ہی محبوبانہ تھا۔ مراد کا دل سینے میں اچھل اچھل کر پوچھ رہا تھا۔ ”کیا یہ انداز میرے لیے نہیں ہو سکتا؟“

پہلے کامران کا ہاتھ مونا کے ہاتھوں میں تھا۔ پھر کامران نے بڑی محبت سے مونا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا۔ وہ سر جھکا کر شرمائے گی۔ زیر لب مسکرائے گی۔ پتا نہیں صرف ایک ہاتھ اپنے محبوب کے ہاتھوں میں آئے ہی کیا ہو گیا تھا حالانکہ کس پہلے بھی جاری تھا مگر اب کچھ اور بات تھی۔ وہ دنیا سے سرخی مائل ہو رہی تھی۔ چہرے پر ہلاکی رونق آگئی تھی جیسے کامران کے ہاتھ نہ ہوں‘ الاؤ ہوں۔ جو اسے سہا رہے ہوں۔ اسے روشن کر رہے ہوں۔

ایک جذبہ جو کسی کے لیے محبت کا سبب بنتا ہے، وہ کسی کے لیے نفرت کا باعث بن جاتا ہے۔ وہ دانت پر دانت جھانے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ دیکھتا نہیں چاہتا تھا مگر دیکھ رہا تھا۔ آدمی آگ سے بچتا چاہتا ہے مگر آگ تپتا بھی چاہتا ہے۔ وہ کشش میں تھا۔ پھر اس سے برداشت نہ ہو سکا۔ وہاں سے جانے لگا۔ اسی وقت کامران کی نظر اس پر پڑی۔ اس

نے آواز دی۔ ”مراد“

وہ رک گیا۔ راستہ گم کرنے والا یہی چاہتا ہے، کوئی پیچھے سے آواز دے۔ اس کا ہاتھ پکڑے۔ اسے بتائے۔ راستہ ادھر نہیں ادھر ہے ہماری طرف آؤ۔
وہ ڈک گیا تھا مگر پلٹ کر دیکھ نہیں رہا تھا کہ کارمن نے آہستگی سے کہلا ”مونا اسے بلاؤ۔ شاید تمہاری وجہ سے الجھ رہا ہے۔“

اس نے سربراہ اٹھ رکھتے ہوئے آواز دی۔ ”مراد صاحب!“ وہ خوش ہو گیا۔ جذبہ خلق سلامت تھا۔ وہ پکار رہی تھی جیسے بچتا رہی ہو۔ کہ رہی ہو۔ ”صاحب! آپ تو تاقی ناراض ہو کر جا رہے ہیں۔ لیجئے آپ کے پاس آگئی۔“

وہ اس کے قریب آگئی تھی۔ وہ بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ مونا نے پوچھا۔ ”تمہیں یقین نہیں آتا؟ لا میرا ہاتھ تھم لو۔ یہ کارمن کے لیے نہیں، تمہارے لیے ہے۔“

اس نے آہستگی سے ہاتھ بڑھایا۔ اس کی تھیلی پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں کانڈ کا ایک ننھا سا بیگ آگیا۔ ڈاکٹر بزنز نے کہلا ”یہ خواب آور گولیاں ہیں۔ انہیں رکھ لو۔“

وہ خیالات سے چونک گیا۔ مونا دور اپنے کارمن کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ڈاکٹر کھڑا ہوا تھا۔ کارمن اپنے بستر سے آواز دے رہا تھا۔ ”بھئی تم دونوں وہاں کھڑے ہو! یہاں آ جاؤ۔“

ڈاکٹر نے کہلا ”میں اپنے مریضوں کے پاس جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر بعد آؤں گا۔“
وہ چلا گیا۔ مونا نے کہلا ”مراد صاحب! آئیے بی۔“

وہ کھنچا ہوا چلا آیا۔ کارمن نے پوچھا۔ ”تم ہم سے دور کیوں ہو؟ کچھ پریشان نظر آ رہے ہو۔ کیا بات ہے؟“

”میں سوچ رہا ہوں۔ تمہاری موت کے آنے سے بڑی پریشانوں میں اور مصیبتوں میں پھنس جاؤں گا۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“

”درست کہہ رہا ہوں۔ یہ اب تک کئی بار مجھے مراد کے نام سے خطاب کر چکی ہیں جبکہ میں مراد نہیں رہا۔“

کارمن نے کہلا۔ ”مونا! یہ بات واقعی غلط ہے۔“

مراد نے کہلا ”انتہائی غلط ہے۔ فرض کرو میں کسی کے ساتھ بیٹھا کارمن مرتضیٰ کی ہیئت سے برنس ذیل کر رہا ہوں! آپسے میں مونا مجھے مراد کے نام سے خطاب کرے تو مجھ سے ڈیٹک کرنے والا میں بن جاتا ہوں گا۔“
”میں ایسی غلطی نہیں کروں گی۔“

”تم ایسا جان بوجھ کر نہیں کرو گی۔ مجھے کارمن نہیں سمجھو گی، مراد سمجھو گی تو ہے! اختیار کسی محفل میں میرا نام لے سکتی ہو۔ میں دوستوں میں، اپنی محفل میں، اپنے کاروبار میں، اپنی سوسائٹی میں لوگوں سے کیا کہوں؟ میرا کیا نام ہے؟ جو نام تھا وہ ایک دوست نے ہمیں لیا اور جو نام مجھے ملا ہے، اسے دوست کی بیوی تسلیم نہیں کرتی۔“

”مراد صاحب! آپ مجھے ایک بار آزما کر دیکھ لیں۔ میں اچھی یادداشت رکھتی ہوں۔ کبھی کسی کے سامنے آپ کو خطاب نہیں کروں گی۔ آپ کو مخاطب کرنے کا موقع آنے ہی نہیں دوں گی۔“

”مونا! ایسا کرو، تم میرے دوست کو کارمن نہیں کہہ سکتی تو مراد بھی نہ کہو۔ کسی اور طرح سے خطاب کر لو۔“
”اور طرح سے؟“

”ہاں، میں تمہارا کارمن مرتضیٰ ہوں تو مراد کو کالی کہہ کر خطاب کرو۔“
”یہ بھی تمہارے نام کا حصہ ہے۔ میرا بس چلے تو میں دنیا کے کسی بھی شخص کو یہ نام نہ رکھنے دوں۔“

مراد نے طنز سے لہجے میں کہلا ”یہ بات تمہارے بس میں تھی۔ اس کے باوجود تم نے پاکستان میں رہ کر میرا نام کارمن مرتضیٰ تسلیم نہ کرتیں تو یہاں نہ پہنچیں۔“
”آپ کا نام میں نے نہیں بدلا۔ یہ آپ دوستوں کی ملی بھگت سے ہوا ہے۔“

کارمن نے کہلا۔ ”بھئی تم دونوں کی اور بحث میں الجھ گئے ہو۔ مسئلہ یہ ہے کہ مونا تمہیں کس طرح خطاب کرے۔“

”میں کہہ چکی ہوں۔ انھیں خطاب کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔“

مراد نے پوچھا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم اشاروں سے گونگوں کی طرح مجھے مخاطب کیا کرو گی؟“

وہ پریشان ہو گئی۔ کسی اور طرح سے کیسے مخاطب کر سکتی ہے اکثر عورتیں اپنے شوہروں کے نام لیتی ہیں۔ بعض نہیں لیتیں۔ اگرچہ ممانعت نہیں ہے۔ وہ اپنے جیون ساتھی کو دل دے دیتی ہیں۔ اپنے وجود کی تمام کائنات سونپ دیتی ہیں۔ اس پر کائنات کے تمام بحیدر کھول دیتی ہیں۔ اس کے بلجود شرماتی ہیں۔

وہ اپنے اوپر شرم طاری نہیں کرتیں۔ یہ عورت کا بے اختیاری جذبہ ہوتا ہے۔ اس کی ذات شرم و حیا کی سدا ببار کھیتی ہے۔ کوئی حیا کی فصل کاٹتا ہے لیکن کھیتی خالی نہیں ہوتی۔ کسی دوسرے پہلو سے حیا کی نئی فصل پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ وہ پھر فصل کاٹتا ہے۔ پھر کسی نئے پہلو سے فصل تیار ہو جاتی ہے۔ مرد آج تک جسے کاٹ نہ سکا وہ عورت کی حیا ہے۔

وہ حیا کی مادی اپنے کامران کو بھی بعض اوقات کامران یا کامی کہتے ہوئے شرماتی تھی۔ ایسے ہی وقت عورت اپنے شوہر کو کسی اور طرح سے مخاطب کرتی ہے۔ مثلاً کچھ کہنا ہو تو کہتی ہے۔ سنئے۔ کچھ دکھانا ہو تو کہتی ہے دیکھیے۔ اگر رازداری سے مخاطب کرنا ہو تو ہولے سے کھٹکار دیتی ہیں۔ کبھی خاموش نظروں سے یوں پکارتی ہیں جیسے کوہِ نرہ سے جلادا آ رہا ہو۔ اکثر زبان سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کبھی ادائیں زبان بن جاتی ہیں اور کبھی وہ آنکھوں کو حرکت دے کر متوجہ کر لیتی ہیں۔

اور طرح سے مخاطب کرنے کے کئی انداز ہیں۔ کتنی ہی ادائیں ہیں۔ کتنی ہی زبانیں ہیں۔ کتنے ہی اشارے اور کرائے ہیں لیکن یہ سب کے سب اپنے شوہر کے لیے ہوتے ہیں۔ شوہر کے دوست کے لیے نہیں ہوتے۔ اس لیے وہ مراد کو مرادی کہہ سکتی تھی۔ کسی اور طرح مخاطب نہیں کر سکتی تھی۔ اور طرح کا حق دار صرف کامران تھا۔ کامران نے پوچھا۔ ”تم کیا سوچتے لگیں؟“

”سوچ رہی ہوں“ انسانی تہذیب نے ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے لیے مقدس رشتوں کو بچان دی ہے۔ میں کسی کو باپ اور کسی کو بھائی کہہ سکتی ہوں لیکن جب

میں مذہب اصولوں کے خلاف کوئی قدم اٹھایا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بالآخر بچھٹنا پڑتا ہے۔ ابھی آثار مار رہے ہیں کہ آئندہ چل کر ہمیں بت بچھٹنا ہو گا۔ کامران مرتضیٰ میرے مجازی خدا کا نام ہے مگر میں ایک ایسے کامران مرتضیٰ کے حوالے سے آنی ہوں جس سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں اس کامران مرتضیٰ کو جیون ساتھی نہیں کہہ سکتی۔ اس سے پہلے مر جانا پسند کروں گی اور میں اس کامران مرتضیٰ کو بھائی نہیں کہہ سکتی۔ اس لیے کہ بیوی بن کر آئی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ روئے لگی۔ آنکھوں میں منہ چمپا کر اپنے آنسوؤں کو چھپانے لگی۔ چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر کامران نے کلمہ۔ ”پلیز“ مونا آنسو پوچھ لو۔ چپ ہو جاؤ۔ جو ہو گیا ہے اسے نبھانا ہو گا۔“

مراد نے کلمہ۔ ”مونا! تم نے رانی کا بہت بتا لیا ہے۔ یہ ایسی بات نہیں ہے کہ اس کا حل تلاش نہ کیا جاسکے۔ تم کسی طرح بھی مجھے مخاطب نہیں کرو گی“ چلو کی سی۔ رونے یا بچھٹانے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ آنسو پوچھ لو۔ یہ ہسپتال کا جنرل وارڈ ہے۔ آنے جانے والے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے اور اب تو ملاقات کا وقت بھی ختم ہو رہا ہے۔“

کامران نے کلمہ۔ ”تم یہاں آتے ہی رونے لگو گی تو مجھے اپنی بے بسی پر افسوس بھی ہو گا۔ میں تمہیں صرف رلاتا ہوں۔ اپنا ہانا کہ اپنے سے دور رکھتا ہوں۔ یہ کیسی مجبوری ہے کہ میں ہسپتال میں پڑا ہوں اور تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔“

مونا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کلمہ۔ ”میں یہ نہیں چاہتی کہ آپ خود کو بے بس لگا لیا اور مجبور سمجھیں۔ میں آپ کی ساتھی ہوں۔ ہر حال میں آپ کا ساتھ دوں گی۔ جو آپ کہیں گے وہ کروں گی۔“

”تو پھر تم مراد کے ساتھ جاؤ۔ یہ میرا سب سے قائل اعتماد دوست ہے۔ یہ ایک طرح سے اندھا ہے کیونکہ عورتوں کو دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔ یہ بہرہ ہے۔ کسی عورت کی آواز سننا پسند نہیں کرتا۔ یہ گونگا ہے۔ اپنی زبان پر عورت کا نام تک لانا نہیں چاہتا۔ تمہیں ایسے آدمی کی قدر کرنی چاہیے۔ اس پر اعتماد کرنا چاہیے۔ جاؤ کل یہاں آ جاؤ۔“

”تمہیں یہاں سے کب تک جھٹی لے گی؟“

”ڈاکٹر کہہ رہا تھا، دو دن تو لگ ہی جائیں گے۔ ایک تو دواؤں کا اثر ہے۔ دوسرا تمہاری آمد سے بڑی توانائی محسوس کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کل ہی اٹھ کر چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں۔“

وہ اسے تسلیاں دیتا رہا، پھر ملاقات کا وقت ختم ہونے پر مونا کو اس سے چھوڑا۔ اب تو یہی لگ رہا تھا، زمین پر، آسمان پر، سمندر کے پانی پر لگہ دیا گیا ہے کہ ملتے رہو اور لہن کی ریت نہا بنے سے پہلے پھجڑ چلایا کرو۔

وہ اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مراد کا ڈرائیو کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک ان کے درمیان خاموشی رہی۔ پھر مراد نے کلمہ ”تم میں بہت ساری خوبیاں ہیں لیکن ایک خامی ہے۔“

وہ جواباً کچھ نہ بولی۔ خاموش رہی۔ اس نے کلمہ ”اگر تم حالات سے سمجھو نہ کرنا سکھ لو تو تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔ کیا تم سمجھتی ہو، تمہارے خاموش رہنے سے یا موجودہ حالات سے سمجھو نہ کرنے سے حالات کو یا لگدڑ کو تم پر ترس آنے کا اور کامران ابھی ہسپتال سے اٹھ کر دوڑتا ہوا تمہارے پاس چلا آئے گا؟“

”میں کب ایسا کہتی ہوں؟“

”نہیں کہتی ہو لیکن سمجھتی ہیں کہ تمہارے افسوس کرنے سے ”ماجی انداز میں خاموش رہنے سے کامران صحت یاب ہو جائے گا؟ میں تم دونوں کا ہمدرد ہوں۔ غم گسار ہوں۔ کیا میں بہت خوش رہوں گا؟ کتنا اچھا موڈ بنا رکھا ہے تم نے۔“

”آپ تسلیاں دینے کی بجائے طعنے دے رہے ہیں۔“

”میں تسلیاں بھی دے رہا ہوں۔ سمجھا بھی رہا ہوں مگر تم سمجھنا نہیں چاہتیں۔ اگر میرے مشورے پر عمل کرنا چاہتی ہو۔ اگر کامران کو بھی خوش دیکھنا چاہتی ہو تو ہنسی بولتی رہو۔ ہنسنے بولنے سے مریض بھی جلد صحت مند ہو جاتا ہے۔ دوسرے بھی خوش رہتے ہیں۔“

”آپ درست کہتے ہیں۔ میری بایوسی میرے مسائل کا حل نہیں ہو سکتی۔ میں

آپ کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔“

”کروں گی نہیں، بس فوراً شروع ہو جاؤ۔ ہنسا شروع کر دو۔ دیکھو، اس طرح باہا

ہ۔“

وہ بے ڈھنگے پن سے ہنسنے لگا۔ اس پر مونا کو ہنسی آگئی اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے کن اکھیں سے اسے دیکھ کر پھر کمری سانس لے کر بولا۔ ”تھمکس اے لاٹ۔ کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے مونا اس طرح تم خوش ہو کر ہنسنے سکراتے ہوئے، دنیا والوں کو بھی ہنسنے سکراتے کا موقع دو گی۔ سوسائٹی میں یہ نہار اشت کردار ہو لگا ہم چھوٹی چھوٹی نیکیاں کر کے ہی ایک دوسرے کے دل میں گھر کر سکتے ہیں۔ مثلاً میں نے تمہارے لیے نیکی کی۔ اپنا نام بدل لیا۔ اسی طرح تم میرے لیے نیکی کر سکتی ہو۔ میرے لیے بھی سکرا سکتی ہو۔“

”میں کوشش کرتی رہوں گی۔ دراصل یہاں پہنچنے ہی کامران کو اتنے پورٹ پر نہ دیکھ کر، پھر اس کے ہسپتال پہنچنے کی خبر سن کر بری طرح پریشان ہو گئی تھی۔ اس لیے آپ کو شکایت کا موقع ملا۔ مجھے اس کا افسوس ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آتا ہے لیکن تم تو چند گھنٹوں میں داہیں آ

گئی ہو۔“

وہ پھر ہنسنے لگی۔ مراد نے دیری گلد کہتے ہوئے ایک جگہ گاڑی روک دی۔ مونا نے

پوچھا۔ ”یہاں کیا ہے؟“

”یہاں ایک ٹیلی فون بوتھ ہے۔ ابھی ہم اس بوتھ کے اندر جائیں گے۔ تم رہیو

اٹھاؤ گی۔ میں ہسپتال کے نمبر ڈائل کروں گا۔ تم اسے کہو گی کہ کامران مرقضی کو فون دیا

جائے۔ تم اسے بتاؤ گی کہ سکرا رہی ہو۔ فون دیا ہو۔ حالات سے سمجھو نہ کر رہی ہو اور

تم ایک دلیر عورت ہو۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”آپ کہتے اچھے ہیں۔ مجھے اس اجنبی اور نئے ماحول میں جینے

کا حوصلہ دے رہے ہیں۔“

وہ ٹیلی فون بوتھ کے اندر گئی۔ انہوں نے ہسپتال کی انکوائری سے رابطہ قائم کیا۔ مونا رہیو رہا تھا کہ فون ہوئی تھی۔ جیسے ہی رابطہ قائم ہوا، اس نے جزل وارڈ کا نمبر اور

کامران کا بیڑ نہ ہرتا تے ہوئے کلمہ ”میں مسٹر کامران سے بات کرنا چاہتی ہوں۔ کیا ان سے گفتگو کرنا جاسکتی ہے؟“

فون اینڈ کرنے والی کسی طاقت نے کلمہ ”آپ کا مریض اس قاتل نہیں ہے کہ کاؤنٹر تک آئے اور نہ ہی ریم ریسیور دہلی تک پہنچا سکتے ہیں۔“

مونہ نے ہاتھ نہیں پر ہاتھ رکھ کر مراد سے کلمہ ”ان سے بات نہیں ہو سکے گی۔“

اس نے ریسیور لے کر اپنے طور پر بات کی اسے بھی مایوسی ہوئی۔ اس نے کلمہ ”میں مسٹر کامران تک ہمارا پیغام پہنچا سکتی ہوں۔“

”ہاں یہ کر سکتی ہوں۔“

”تو پیغام ہے“ ایک دل کی گمراہیوں سے نکلا ہوا قہقہہ جو تیار کو صحت مند بنا دیتا ہے اور مراد کی جھولی مرادوں سے بھر دیتا ہے۔ کامران سے کہتا ”تمہاری مونہ بہت خوش ہے۔“

”نہیں رہی ہے اور تمہاری صحت یابی کے لیے دعا کر رہی ہے۔“ یقین نہ ہو تو سنو۔ مونہ

نہیں رہی ہے۔“

اس نے ریسیور بڑھا کر ہاتھ کے اشارے سے کلمہ ”خوش ہو۔“

مونہ بچہ اختیار ہونے لگی کیوں کہ وہ اپنے کامران کے لیے نہں رہی تھی۔ حترم نہی

کا پیغام ایک تیار تک پہنچا رہی تھی اور اپنی نہی کو مٹا دینا کر پیش کر رہی تھی۔

وہ نہں رہی تھی۔ بھول کی طرح کل رہی تھی اور مراد کے اندر ایک زخم کی

طرح کل رہی تھی۔

وہ ہاتھ سے باہر آئے مراد نے اس کے لیے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کلمہ ”تم

نے لندن کی ایک بھگت دن میں دیکھی ہے۔ اب تاریکی پھیل رہی ہے۔ اسے رات کی

بجگاتی ہوئی روشنیوں میں دیکھو۔ میں تمہیں بیر کراؤں گا اس کے بعد کسی فرسٹ کلاس

رستوران میں کھانا کھائیں گے۔ تمہارا وقت اس طرح گزرتا جائے گا کہ سوچنے اور

پریشان ہونے کا موقع ہی نہ ملے گا پھر رات کس طرح گزر جائے گی۔ صبح کیسے آئے گی

اور کبھی طرح تم اپنے کامران تک پہنچ جاؤ گی، جس پر ہمتی نہیں چلے گی۔“

وہ بہت خوش تھی کیونکہ مراد، کامران کے حوالے سے باتیں کر رہا تھا۔ مونہ کا

مذاج بھی تھا۔ اسے اس کی محبت کا حوالہ مل رہا تھا۔ وہ خوش ہو رہی تھی۔ اسی لیے مراد بڑی حد تک قابل برداشت اور قابل اعتماد ہو چلا تھا۔

رات ساڑھے نو بجے وہ دونوں مکان میں پہنچ گئے۔ مونہ نے کلمہ ”آپ کے ساتھ کیسے اتنا وقت گزر گیا کچھ“

اسی نہ چلا۔ ویسے میں تھک گئی ہوں۔“

”تمہیں کامرین علاج ہے ایک کپ کافی۔“

”نہیں! اب میں سونا چاہتی ہوں۔“

”میں نے کب روکا ہے۔ پہلے ایک ایک کپ کافی ہو جائے اس کے بعد تم اپنے

بیڈ روم میں چلی جاؤ۔ اسے اندر سے لاک کر دینا اور آرام سے صبح تک سوتی رہنا۔“

اس نے ایک چابی اس کی طرف بڑھائی۔ ”یہ ہے اس بیڈ روم کی چابی اور وہ بیڈ

روم تمہارے لیے ہے۔“

مونہ نے اس سے چابی لیتے ہوئے کلمہ ”تھینک یو۔ میں ابھی کافی بنا کر لاتی

ہوں۔“

وہ کچن کی طرف گئی۔ چھوٹا سا مکان تھا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ کچن

کس طرف ہے۔ اس کے جانے کے بعد اس نے جیب سے دوسری چابی نکالی۔ اسے دکھا

اور پھر مونہ کے لیے مخصوص بیڈ روم کی طرف دیکھ کر مسکرائے لگا۔

وہ جلد ہی ایک درے میں کافی کی دو پائیاں لے کر آگئی۔ اسے میز پر رکھ کر

ایک پیالی اس کی طرف بڑھا دی۔ دوسری پیالی خود اپنے پاس رکھ کر پینے لگی۔ مراد نے

اپنی پیالی اٹھائی۔ ایک چمکی لی۔ پھر اس کے ڈالنے کو محسوس کرنے کے بعد کلمہ ”چینی کم

ہے۔ اگر مائڈ نہ کرو تو شوگر پاٹ لے آؤ۔“

وہ پھر کچن کی طرف چلی گئی۔ جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوئی، مراد نے جیب میں

ہاتھ ڈال کر وہ ننھا سا پیکٹ نکالنا چاہا۔ اس میں خواب اور گولیاں تھیں۔ لیکن اس جیب میں

پیکٹ نہیں تھا۔ اس نے جلدی سے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہ دیکھ کر حیرت میں بیٹھی

پیکٹ نہیں تھا۔ وہ پریشان ہو کر کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالنے لگا۔ کبھی اس جیب میں

کبھی اس جیب میں۔ وہ غلت اور پریشانی میں کچن کی طرف نہ دیکھتا جا رہا تھا کہ کہیں وہ پہنچ

تھا۔ وہ لے کر آ رہی تھی لیکن دروازے پر ٹھک گئی تھی۔ اس نے دیکھا 'مراد کوئی چیز اس کی پیالی میں ڈال رہا تھا۔ پھر پیچھے سے بلا رہا تھا۔ چپ چاپ بلانے کے دوران اس نے کچن کے دروازے کی جانب دیکھا تو وہ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ اسے نظر نہیں آئی تھی۔ چپ چاپ کھڑی سوچ رہی تھی 'ایسی حالت میں کیا کرنا چاہیے؟ کیا غصہ دکھانا چاہیے؟ لیکن غصہ دکھانے سے اس کا کیا بگڑے گا۔ بلکہ وہ انتقام اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔ وہ اکیلے ہے۔ پر دس میں ہے۔ برائے گھر میں ہے۔ اسے خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔

چند لمحوں تک سوچنے کے بعد وہ واپس گئی۔ وہاں شوگر پاٹ کو برتنوں کے پیچھے چھپا دیا۔ پھر واپس آکر مراد کو اس کے لیے کچن میں جانے پر مجبور کر دیا۔ پیالیاں بدلنے کے بعد اس کی پیالی سامنے رکھی ہوئی تھی۔ وہ کسی کا جھوٹا پینا گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے آدھی پیالی کو ہاتھ میں لے لی یوں بیٹھی رہی جیسے آہستہ آہستہ چسکی لیتی جا رہی ہو۔ اتنے میں وہ اگلیا۔ کسنے لگا۔ 'تو نہیں شوگر پاٹ کہاں رکھ دیا ہے۔ میں یونی پی لوں گا۔ کچھ زیادہ بھینکی نہیں ہے۔'

وہ اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے پیالی اٹھا کر ایک گھونٹ لیتے ہوئے پوچھ ل۔
"تم نہیں پی رہی ہو؟"

اس نے اپنے ہاتھ کی پیالی ذرا آگے بڑھا کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "آدھی پی چکی ہوں۔"

وہ مطمئن ہو گیا۔ ٹھہر ٹھہر کر پینے لگا۔ مونا اسے باتوں میں لگا رہی تھی۔ کبھی اپنی پیالی ہونٹوں تک لے جاتی تھی۔ جیسے کافی پی رہی ہو۔ پھر اسے رکھ دیتی تھی۔ مراد بازی پلٹنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے اطمینان سے ایک ایک گھونٹ پیتے ہوئے اس نے پیالی ختم کر دی۔

مونا نے پوچھ ل۔ "کیا خالی ہو گئی؟"

"ہاں۔ تم نے ابھی تک خالی نہیں کی؟"

"میں کسی کا جھوٹا نہیں جیتی۔"

"میں سمجھا نہیں۔"

نہ جانے۔ آخر وہ تنہا سا پکٹ ل ہی گیا۔ اس نے پکٹ میں سے دو خواب آور گولیاں نکالیں۔ پھر جلدی سے انھیں مونا کی پیالی میں ڈال کر پیچھے سے پلانے لگا۔

وہ گولیاں کافی میں یوں حل ہو رہی تھیں جیسے وہ پیالی نہ ہو 'مونا کا دل ہو اور وہ خود گولیوں کی طرح اس کے دل میں حل ہوتا جا رہا ہو۔

وہ اس کے ساتھ ہسپتال سے مکان آنے تک کتنی ہی تفریح گاہوں میں گھومتا رہا۔ اس کے ساتھ ایک مضحکہ ریز ستوران میں بیٹھ کر کھانا بھی کھایا۔ اس نے طرح طرح سے اس کا دل بسلانے کی کوشش کی۔ اس کے دل میں اترنے کے کتنے ہی راستے تلاش کرتا رہا لیکن مونا اس کے ساتھ ہنسے بولنے کے باوجود ایک فاصلہ رکھتی تھی۔ اپنے آپ کو اتنا ریزور رکھا کہ وہ کسی بھانے سے بھی اس کا ہاتھ نہ تھام سکا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے ہسپتال کا منظر تھا جہاں کا این بستر پر لیٹا ہوا تھا اور مونا نے پہلے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ اس کے بعد کامران نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا تھا لیکن وہی ہاتھ مراد کے ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا مونا کی بیداری اسے دور کرتی تھی۔ اگر وہ خوابیدہ ہو تو؟

وہ فوراً ہی جاگ بیٹھ گیا۔ کیوں کہ قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ مونا کچن سے آ رہی تھی۔ وہ آتے ہی بولی۔ "میں کچھ زیادہ ہی پریشان ہو گئی ہوں۔ حلال کہ آپ نے میرا دل بسلانے کی بے انتہا کوشش کی۔ یہی دیکھیے 'ابھی کچن میں شوگر پاٹ رکھ کر آئی تھی۔ وہاں جا کر دیکھتی ہوں تو نظر نہیں آ رہا ہے۔ جانے کہاں رکھ دیا ہے۔ میری یادداشت کمزور ہو گئی ہے۔"

"کوئی بات نہیں 'میں پھینکی کافی پی لوں گا۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے۔ دو قدم چل کر کچن میں جائیے اور خود تلاش کر لیجیے 'ورنہ

آپ کو پھینکی کافی پلانے کا مجھے افسوس ہو گا۔"

وہ ہنسنے ہوئے اٹھ کر بولا۔ "میں ابھی آیا۔"

وہ کچن کی طرف گیا۔ جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوا 'مونا نے اپنی پیالی اٹھا کر اس کی جگہ رکھی اور اس کی پیالی اپنے پاس رکھ لی۔ دراصل شوگر پاٹ اسے کچن میں مل گیا

”میں سمجھاتی ہوں۔ یہ پیالی جو میرے سامنے ہے، اس کی آدمی کافی میں نے اس گل دان میں اتریل دی۔ آدمی جوں کی توں رکھی ہوئی ہے۔“

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ مراد نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھاتے ہوئے پیلو کلمہ پھر اپنے فون کا نمبر دہراتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ کس سے باتیں کرنا چاہتے ہیں؟“

ڈاکٹر جان بنٹر کی آواز سنائی دی۔ ”میں نے ٹھیک نو بجے اس نمبر پر فون کیا تھا لیکن تم نہیں تھے۔“

”ہم سوا نو بجے یہاں پہنچے ہیں۔“

”کیا مونا تمہارے ساتھ اچھا وقت گزار رہی ہے؟“

”بے شک۔“

”میں اس سے دو باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

مراد نے ریسیور مونا کی طرف بڑھاتے ہوئے کلمہ ”ڈاکٹر جان بنٹر ماہر نفسیات ہیں۔ میرا معلق کرتے ہیں۔ تم ہسپتال میں ان سے مل چکی ہو۔ وہ بات کرنا چاہتے ہیں۔“ مونا نے ریسیور اٹھا کر کلمہ ”پیلو ڈاکٹر! میں مونا بول رہی ہوں۔ کیا آپ کامران کے پاس ہیں؟“

تھوڑی دیر پہلے وہیں تھا۔ وہ عجیب ہے۔ اگر دواؤں نے خاطر خواہ اثر دکھایا تو کل تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا۔“

”کیا آپ ایک ایسی عورت کی کسی طرح مدد کر سکتے ہیں؟ جو آپ کے ملک میں آئی ہو۔ تنہا ہو۔ بے یار و مددگار ہو؟“

”یقیناً“ میں اس کے کام آسکتا ہوں لیکن یہ بات تم اپنے متعلق کہہ رہی ہو، لیکن میں کچھ اور کتا چاہتا ہوں۔ مراد ایک نفسیاتی مریض ہے۔ وہ کسی کے لیے خطرناک نہیں ہے۔ اس سے کوئی ایسا ویسی حرکت سرزد ہو یا وہ ایسی بات کہہ دے جو تمہارے مزاج پر گراں گزرے تو اسے اپنے شوہر کی خاطر برداشت کر لیں۔“

”اچھا ہوا ڈاکٹر آپ نے یہ بات پھیر دی۔ میں آپ سے پوچھنا چاہتی ہوں، ایک

اپنی مریض چائے میں یا کافی میں ایسی کن سی دوا ملا کر دے سکتا ہے جس کے بعد اس کی طرف سے خطرہ محسوس نہیں ہوتا چاہیے۔“

”وہ تمہیں کبھی ذہن نہیں دے سکتا۔ تم اس کی مسمان ہو۔ دوست کی بیوی ہو۔ وہ اس حد تک کبھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اگر اس نے کوئی چیز ملائی ہے تو اس کے پاس خواب آور گولیاں ہیں۔“

”میرا بھی اندازہ یہی تھا۔ میں نے تمہارے ذہنی مریض کی چال واپس کر دی ہے۔ اپنی پیالی اس کی جگہ رکھ دی تھی اور اس کی پیالی اپنے پاس۔ یوں اس نے خواب آور کافی حلق میں اتار لی ہے۔“

ادھر مونا کہہ رہی تھی، ادھر مراد حیرانی سے سن رہا تھا۔ پھر اس نے اپنے حلق پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کلمہ ”یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیا تم نے واقعی پیالیاں بدل دی تھیں؟“ مونا نے ریسیور کے مائیک پر ہاتھ رکھ کر کلمہ ”جی ہاں، اب آپ رات بھر آرام سے سوتے رہیں۔“

دوسری طرف ڈاکٹر نے کلمہ ”مسز کامران! تم مراد کو احساس دلاؤ کہ اس نے خواب آور گولیاں استعمال کی ہیں۔ اب وہ گمراہ نیند سو جائے گا۔“ ”ڈاکٹر، ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ گولیاں کھانے کے بعد مریض جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو اور سونے کے بجائے اٹھ کر ٹھنڈا شروع کر دے یا دوڑنا شروع کر دے تو اس کا اثر زائل ہو جائے۔“

”ایسا ہوتا ہے لیکن مراد کچھ اور طرح کا مریض ہے۔ میں جو دوا جس مقصد کے لیے دیتا ہوں، وہ استعمال کرتے ہی اس کے زیر اثر آ جاتا ہے۔ یقیناً ابھی ان گولیوں کے اثر سے سو جائے گا۔“

مراد ان کی باتیں نہیں سن رہا تھا لیکن پریشان ہو رہا تھا۔ بڑبڑا رہا تھا۔ ”نہیں نہیں، میں سونا نہیں چاہتا۔ میں ابھی چاہتا ہوں۔“

اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ مونا نے ریسیور اس کی طرف بٹخ دیا۔ اس سے دور ہو گئی۔ وہ بولا۔ ”ڈاکٹر! میں مونا کا دشمن نہیں ہوں۔ میں چاہتا

تھا، یہ پریشان ہے، کامران کے متعلق بہت زیادہ سوچ رہی ہے۔ لہذا اسے آرام سے سلا دوں۔“

”میں سمجھتا ہوں، تم بہت اچھے ہو۔ اپنے دوست کی بیوی کے آرام کا پوری طرح خیال رکھو گے۔“

”مونا نے پیچھے ہٹ کر کچن کے دروازے پر پہنچ کر کلمہ ”تم بھوت بولتے ہو۔ تمہیں میرے آرام کا خیال نہیں ہے۔ تم ایک مریض ہو ذہنی مریض ہو۔ پاگل ہو۔“
مراد نے سختی سے ہونٹوں کو سمیٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھاگتی ہوئی کچن کے اندر چلی گئی۔ اس نے کلمہ ”ڈاکٹر! مونا مجھ پر شک کر رہی ہے۔ مجھ سے دور بھاگ رہی ہے۔“

”غصہ“ میں ابھی آتا ہوں۔“

اس نے رسیور رکھ دیا۔ کچن کی طرف جاتا ہی چاہتا تھا کہ وہ دروازے پر نظر آئی۔ اس بار اس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ وہ دانت چینے کے بعد بولی۔ ”میں جان پر کھینچا جاتی ہوں اور جان لینا بھی جاتی ہوں۔ میرے قریب آؤ گے تو اچھا نہیں ہو گا۔“
”مونا! پلیز مجھ پر شک نہ کرو۔ میں تمہاری بھلائی چاہتا ہوں میں تمہارے شوہر کا دوست ہوں۔“

یہ ایک قدم آگے بڑھا، وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”میں کبھی ہوں“ آگے نہ بڑھتا۔ کچن کی یہ چھری تمہاری جان نہیں لے سکے گی لیکن جتنے بھی زخم لگیں گے، وہ ساری زندگی کے لیے یادگار بن جائیں گے اس کے ساتھ ہی پھر میں جینا شروع کر دوں گی۔“

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ ہم تمہارا بن جائیں تم یقین کرو۔“

”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری کوئی بات سنوں گی، نہ کسی بات کا یقین کروں گی۔ ایک سوال کرتی ہوں۔ اگر میں بیڈ روم میں جا کر خواب آور گولیوں کے ذریعہ سو جاتی تو تم کسے میں کیسے آتے جبکہ ایک چالی میرے پاس ہے۔ کیا

دوسری چالی تمہارے پاس نہیں ہے؟“

وہ جواب نہ دے سکا۔ ہچکچاتی لگ۔ مونا نے کہا۔ ”میں نے اس وقت دھیان نہیں دیا تھا۔ ایک چالی لے کر رکھ لی تھی لیکن تمہاری اس خواب آور گولیوں والی حرکت نے چونکا کر دیا اور عقل آگئی کہ مکان کے ہر کمرے کی دو چالیاں ہوتی ہیں۔ برسرِ حال دوسری چالی بھی مجھے دے دو۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ جیب میں ہاتھ ڈال کے اسے نکالتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ ڈپٹ کر بولی۔ ”رک جاؤ۔ چالی کو میز پر رکھ کر پیچھے ہٹ جاؤ۔“
”تم بہت محتاط ہو۔ میں چاہوں تو چھری کی پروانہ کرتے ہوئے تم سے چھین لوں لیکن میں تمہارا بننا نہیں چاہتا۔ پلیز مجھ پر اعتماد کرو۔“

”جو“ نہ رہی ہوں۔ وہ کرو۔“

اس نے چالی میز پر رکھ دی۔ پھر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ آگے بڑھ کر چالی اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”میں یہاں سے ہسپتال جاسکتی ہوں۔ یہ نہ سمجھتا کہ اجنبی ہوں، بنگ جلاؤں گی۔ میرے پاس لندن شہر کا پورا نقشہ موجود ہے۔ ایسی گاڑی بک ہے جو مجھے میرے کامران تک پہنچا دے گی لیکن میں اتنی رات کو وہاں جا کر اس کے لیے پریشانی کا سبب نہیں بننا چاہتی۔ وہ مجھ پر اور بے بس ہے اور ایک دوست کی بددیانتی کے جواب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اسے بے بسی اور بے چارگی کے احساس میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی۔ میں چاہتی ہوں وہ آرام سے وہاں رہے۔ صحت مند ہو جائے۔ میں اپنی حفاظت کرنا چاہتی ہوں۔“

یہ کہتے ہوئے وہ اپنے بیڈ روم کے پاس گئی۔ دروازے کو کھولتے ہوئے کلمہ ”میں صبح تک اپنے کمرے میں سوئی رہوں گی اور تمہیں تو خواب آور گولیاں سلا دیں گی۔ تم جاگنے کی انتہائی کوشش کرتے رہو گے لیکن بیدار نہیں ہو سکو گے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے وہ گولیاں ضرور اثر کریں گی کیوں کہ اس قسم کی ہر دوں تم پر اثر کرتی ہے۔“

اس نے دروازے کو کھل کر لاک کر دیا۔ اس پر بھی اطمینان نہ ہوا تو دروازے کے پاس رگھے ہوئے ایک چھوٹے سے ٹیبل کو سمیٹ کر دروازے سے لگا دیا۔ اس کے بعد وہ کرسیاں بھی وہاں لگا دیں تاکہ وہ تلا توڑ کر بھی آتا چاہے تو دروازہ آسانی سے کھل نہ

آدمے گئے بند ڈاکٹر جان ہنر نے کالج کے سامنے آکر دیکھل دروازہ بند تھا لیکن
خود روشنی تھی۔ دونوں ہی بیڈ روم روشن نظر آ رہے تھے۔ اس نے کال بیل کاٹن دلیلا
لیکن جواب نہیں ملا۔ کوئی دروازہ کھولنے نہیں آیا۔ اس نے دوبارہ بٹن کو دبایا۔ تھوڑی
دیر انتظار کرنے کے بعد دستک دی۔ آواز بھی دی۔ ”مسٹر مراد! دروازہ کھولو۔ میں تمہارا
گھنٹہ گزروں۔ پلیز دروازہ کھولو۔“

جواب نہیں ملا۔ اس نے پھر آواز دی۔ ”مسز کامران! اگر تم جاگ رہی ہو تو مجھے
گھڑا سے بچاؤ۔ میں ڈاکٹر جان ہنر ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تم سے فون پر بات کر چکا
ہوں۔ اگر مراد سو رہا ہے تو سونے دو۔ میں اپنے اس مریض کے سلسلے میں تم نے بہت
خردوری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

اندر گہری خاموشی تھی۔ وہ ادھر سے گھوم کر ایک روشن کھڑکی کی طرف آیا۔
گھڑکی کے شیشوں کے پیچھے پردہ تھا۔ پردے کے باوجود روشنی جھلک رہی تھی لیکن کمرے
کا اندرونی منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ کس کا بیڈ روم ہے؟ اسے نہیں معلوم تھا۔
اس نے کھڑکی کے شیشے پر دستک دی۔ ”مراد دروازہ کھولو۔ یا کھڑکی کھول کر ہی
خاموش کرو۔ کیا واقعی سو گئے ہو؟“

چند لمحوں تک خاموشی رہی۔ پھر وہ ذرا سا سرک گیا مونا نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر
نے اس کا یہ انداز نہیں دیکھا تھا۔ وہ بچن کی چھری ہاتھ میں لیے کھڑی تھی اور ڈاکٹر کو غرا
اگر دیکھ رہی تھی۔ وہ پریشان ہو کر بولا۔ ”مسز کامران! یہ کیا؟ پلیز دروازہ کھولو۔ میں
خردوری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

مونانے کھڑکی کو کھولنے ہوئے کمال۔ ”میں شریف آدمیوں سے نہیں ڈرتی کیوں کہ
خود اپنی عزت سے ڈرتے ہیں۔ اتنی جرات نہیں کر سکتے کہ کسی کی مرضی کے خلاف
کمرے میں قدم بھی رکھ سکیں۔ اس کے باوجود میں تم پر عبور نہیں کر سکتی۔ میں نے
کامران کے ایک دوست کو آڑایا ہے۔ دوسرے کو آڑنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔
پلیز آپ چلے جائیں۔“

”انتانتا دو‘ مراد کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے؟“

نکے یا اتنی آواز ہو کہ وہ بیدار ہو جائے۔
وہ بند دروازے کے سامنے کھڑا مٹھیاں سمیٹ رہا تھا۔ جب تک مونا لگا ہوں کے
سامنے تھی، وہ اسے خوش مزاجی سے متاثر کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ دروازہ اس
کے سامنے یوں بند ہوا جیسے تم پر طمانچہ پڑا ہو۔ وہ غصے سے جھنجھلا رہا تھا۔ پھر وہاں سے
پاؤں پٹختا ہوا اپنے بیڈ روم میں گلیڈ یہ تو جانتا ہی تھا کہ پاکستان میں شراب پر مکمل طور پر
پابندی ہے۔ وہاں کی عورتیں بھی شراب پینے والوں کو پسند نہیں کرتیں۔ لہذا اس نے مونا
کو اپنی شراب نوشی کے حقائق کچھ نہیں بتایا تھا۔ اب غصے میں شراب پینا چاہتا تھا۔ اس
نے کمرے میں آکر الماری کھولی۔ اس میں سے ایک بوتل نکالی۔ پھر بچن سے ایک گلاس لا
کر شراب اٹھ لئے لگے۔

اسی وقت یاد آیا کہ خواب آور گولیاں کھانے کے بعد شراب نوشی کی جائے تو یہ
ہلاکت کا باعث بنتی ہے۔ وہ شراب اٹھ لئے کے دوران رک گلیڈ۔ وہ عورتوں سے جنسی
نفرت کرتا تھا، زندگی سے اتنی ہی محبت کرتا تھا۔ جب سے مونا کو دیکھا تھا، زندگی اور حسین
نظر آنے لگی تھی۔ ابھی وہ مونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بوتل واپس رکھ دی۔ وہاں سے
پلٹ کر دروازے کے پاس آیا۔ پھر دوسرے بیڈ روم کے بند دروازے کو دیکھنے لگے۔ اسے
دیکھتے ہی جھنجھلاہٹ طاری ہو گئی۔ وہ ادھر سے ادھر ٹھٹھٹے لگے۔ پھر بسزے کمرے پر چند
گلیڈ اس کے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔ ”اے سو جانا چاہیے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ ڈاکٹر
جان ہنر نے کوئی دوا دی ہو اور اس کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا ہو۔ اس کا بھی اثر ہو گا اور وہ
سو جائے گا لہذا اسے بستر پر آرام سے لیٹ جانا چاہیے۔“

وہ نہ چاہتے ہوئے لیٹ گلیڈ سوتا نہیں چاہتا تھا، لیکن وہ کیا کر سکتا تھا۔ بند
دروازے کو توڑ نہیں سکتا تھا۔ کسی کے دل میں اس کی اجازت کے بغیر داخل نہیں ہو سکتا
تھا۔

فلکست کا احساس شدت اختیار کر لے تو نیند اڑ جاتی ہے اور یہی فلکست کا احساس
بے حال کر دے، تھا مارے تو آری کزور پڑ جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ نیند آنے لگتی ہے اور
پھر نیند کیوں نہ آتی جبکہ اس پر دواؤں کا اثر ہو رہا تھا۔

”وہ جنم میں گیلیہ میں نہیں جاتی“ وہ کہاں ہے۔ کیا کر رہا ہے۔ میں نے اس سے بیڑہ دم کی دونوں چابیوں لے لی ہیں۔ دروازے کو اندر سے لاک کر کے میز اور کرسیاں لگا دی ہیں۔ اب وہ کمرے میں نہیں آسکے گا۔ آئے گا تو یہاں سے اس کی لاش نکلے گی۔“

”اوہ گاؤ“ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نوبت یہاں تک پہنچے گی۔ مسز مونکا کامران! میں تسلیم کرتا ہوں، یہاں آتے ہی تم پر کچھ زیادتیاں ہوئی ہیں لیکن جوش میں رہ کر خون خرابے کی بات کرو گی یا مراد کو نقصان پہنچاؤ گی تو اپنے کامران کے ساتھ جیل میں جاؤ گی۔ کوئی تمہیں بچانے والا، کوئی تمہاری مدد کرنے والا نہیں ہو گا۔ تم میاں پیوی پھر ایک دوسرے سے نہیں مل سکو گے۔“

”مجھے کچھ سمجھانے سے پہلے تم ایک بات سمجھ لو۔ کوئی بھی شریف آدمی رات کے وقت کسی جوان عورت کو مشورے دینے نہیں آتا۔ لہذا دن کی روشنی میں بات ہو گی۔ گڈ بائ۔“

اس نے کھڑکی ایک جھٹکے سے بند کر دی۔ پردے برابر کر دیے اب وہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایک مصروف رہنے والے ڈاکٹر کو کیا پڑی تھی کہ ان کے معاملات میں اس حد تک دلچسپی لیتا اور اپنا وقت بھی برباد کرتا رہتا۔ دراصل رضا مراد اسے معقول معاوضہ ادا کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ ڈاکٹر کوئی کیس اپنے ہاتھ میں لے کر اسے بہ احسن و خوبی کامیابی کے ساتھ انجام دیتا چاہتا تھا۔ اس کے پاس آنے والے کتنے ہی دماغی مریض نارمل زندگی گزار رہے تھے۔ اس طرح اس کی شہرت میں اضافہ ہوتا تھا۔ لوگ چہرے کرتے تھے۔ پورے وقتوں سے کہتے تھے کہ ڈاکٹر جان ہنزا اپنے مریض کے دل کی اور دماغ کی گھبراہٹوں تک پہنچتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی گھل مل کر رہتا ہے، جیسے اسی کے خاندان کا فرد ہو۔ اس طرح وہ اس کی ذاتی زندگی اور خاندانی حالات کی بہت سی پیچیدگیوں سے واقف ہو جاتا ہے۔ ایسے طریقہ کار سے علاج میں بڑی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی رات کو مراد کے سلسلے میں وہاں چلا آیا تھا۔ بہر حال اسے یقین ہو گیا کہ مونکا صبح تک اپنے بیڑہ دم میں بند رہے گی اور محفوظ رہے گی۔ دوسری طرف اس کا مریض رضا مراد گہری نیند سو رہا تھا۔ اس کی دی ہوئی گولیاں خواب آور نہیں تھیں۔ ڈاکٹر جان

ہنزا اپنے مریضوں پر نفسیاتی اثر ڈالنا خوب جانتا تھا۔ دوسری صبح مراد کی آنکھ کھلی۔ وہ چند لمحوں تک بستہ پر چپ چاپ پڑا رہا۔ پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے یاد آ گیا کہ پچھلی رات دوا کے زیر اثر سو گیا تھا اور مونکا نے اپنے بیڑہ دم کے دروازے کو اندر سے لاک کر دیا تھا۔ وہ فوراً ہی بستہ سے اتر کر تیزی سے چلتا ہوا کمرے کے باہر آیا۔ دوسرا بیڑہ دم ابھی تک بند تھا پتا نہیں وہ باہر نکلی بھی ہے یا نہیں۔ اس نے پہلے کچن میں جا کر دیکھ لیا۔ پچھلی رات وہ چیزیں جہاں رکھی ہوئی تھیں وہیں موجود تھیں۔ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مونکا ابھی تک بیڑہ دم میں ہے۔

اس نے آکر دروازے پر دستک دی۔ ”مونکا دروازہ کھولو۔ دن نکل آیا ہے۔ پچھلی رات جو کچھ ہوا“ مجھے اس پر ندامت ہے۔ بانی گاؤ، تم باہر آؤ۔ مجھے ایک بدلا ہوا انسان پاؤ گی۔“

جواب نہیں ملا۔ وہ خوش مزاجی سے کہہ رہا تھا مگر جواب نہ ملنے پر غصے سے دروازے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے دروازے کو پھینکا شروع کیا۔ دو دھمکے سے کوئی ایک بات تھی یا تو وہ اندر تھی یا باہر نہیں آتا چاہتی تھی۔ اس سے سہمی ہوئی تھی یا اس کی نیند کے دوران ہی صبح اٹھ کر اس کا کالج سے چلی گئی تھی۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر آیا۔ دوسری طرف جا کر اس نے بیڑہ دم کی کھڑکی کو دیکھ لیا۔ اندر سے بند تھی۔ شیشے کے پار پردے نظر آ رہے تھے۔ پردوں کے پیچھے کمرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے کھڑکی پر بار بار دستک دی۔ بار بار آوازیں دیں۔ کمرے کی پڑاسرار خاموشی نے اسے اور بھی جھنجھلاہٹ میں مبتلا کر دیا۔

وہ کالج میں واپس آیا۔ فوراً ہی تیار ہو کر دروازوں کو لاک کیا۔ پھر کار میں بیٹھ کر اسے ڈرائیور کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ وہ بہت چالاک ہے۔ میرے بیدار ہونے سے پہلے ہی کالج سے چلی گئی ہے۔ یقیناً کامران کے پاس گئی ہو گی مگر اس کے پاس جا کر میرا کیا بگاڑ لے گی۔ میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ جس پر نکیہ کر رہی ہے، وہ اس کا کوئی نہیں ہے۔ اس کے کسی کام نہیں آ سکتا جو کچھ ہوں میں ہوں۔ میں ہی اس کے ہر طرح کام آ سکتا

اس کی شخصیت سے محبت کرتی ہے۔ وہ لالچی نہیں ہے۔ اس کی نظروں میں میری دولت اور میرے کاروبار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو کامران پر قربان کر دینا چاہتی ہے۔

”تمہیں اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کامران کو دل و جان سے چاہتی ہے۔“

”یہ بے لوث چاہت ہے۔ میں ایسی ہی لڑکی کو چاہتا ہوں۔ ایسی لڑکیاں بازاروں میں نہیں ملتیں۔ لاکھوں میں ڈھونڈو تو ایک ملتی ہے۔ میں اسے کامران سے بانگ لوں گا۔“

”ایسی حماقت نہ کرنا۔“

”آپ میرے معالج ہیں۔ آپ کامران کو یہ مشورہ دے سکتے ہیں کہ میرا علاج کیسی ہے۔ مجھے یہی مونا چاہیے جو صرف میری ذات سے محبت کرے۔ میرے کاروبار کو میری دولت کو نہ دیکھے۔“

”وہ وفادار اور محبت کرنے والی عورت ہے۔ صرف کامران سے محبت کرتی ہے۔“ وہ غصے سے بولا۔ ”کیا محبت کرنے والی وفادار عورتیں میرے نصیب میں نہیں ہیں۔“

”ضرور ہیں۔ ڈھونڈنے سے مل جائیں گی۔“

”ملی گئی ہے۔ تقدیر نے خود اسے میرے پاس پہنچا دیا ہے۔“

”میں تم سے التجا کرتا ہوں۔ کامران سے ہرگز ایسی بات نہ کرنا۔ میری نصیحت کو یوں سمجھو کہ مونا اب نرم پڑی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ نرمی دوستی میں بدل جائے۔ تم صبر و تحمل سے انتظار کیوں نہیں کرتے۔ شاید وہ تمہاری طرف مائل ہو جائے۔“

”ہاں“ یہ غور کرنے کی بات ہے۔ میں تمہارے مشورے پر غور کروں گا۔ ابھی کامران سے کچھ نہیں کہوں گا۔“

”شبلاش، چلو ہم اس سے ملتے ہیں۔“

وہ کامران کے پاس آگئے۔ مونا اسی طرح کامران کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس وقت کامران اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر اور مراد کو دیکھتے ہی خوش ہو

گر کھل۔ ”میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ دیکھو، اب اٹھ کر بیٹھ گیا ہوں۔ کل رات تھوڑی دیر بیٹھ کھڑا رہا۔ صبح اس سانسے والی دیوار تک گیا تھا۔ پھر دایہی میں تکلیف ہوئی لیکن خود بھی یہاں تک آگیا۔“

ڈاکٹر نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ”حوصلے سے بڑھ کر کوئی دوا نہیں ہے۔ تم جلد ہی پلٹے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔“

کامران نے کہا۔ ”مراد! ابھی تمہاری تعریفیں کر رہی تھی۔ میں کس زبان سے شکر ہے ادا کروں۔ تم قدم قدم پر میرے ساتھ تعاون کر رہے ہو۔ ایک بہترین دوست ہونے کا ثبوت پیش کر رہے ہو۔“

اس نے کہا۔ ”آج تم غیروں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ دوست جب دوستی نبھاتا ہے تو وہ احسان نہیں کرتا۔ میں یہ نہیں دیکھتا کہ تمہارے کام آنے کے لیے کس قدر نقصان اٹھانا پڑے گا۔ میں نے اپنے باپ دادا کے رکھے ہوئے نام کو تمہاری خاطر بدل دیا۔ تمہارے نکاح نامے کے مطابق اپنی ولایت بھی بدل دی۔ گویا کہ اپنے باپ سے بھی انکار کیا۔ اس سے بڑی قربانی کوئی ہو سکتی ہے؟“

”واقعی۔ تمہارے جیسے دوستوں کو یہ جاں نثار کہتے ہیں۔ کبھی موقع آیا تو میں بھی اپنی دوستی کا ثبوت دوں گا۔“

مراد نے اذیت میں سر ہلاتے ہوئے۔ ”ہاں! ایسا موقع آئے گا۔ بہت جلد آئے گا۔“

”کیا واقعی، مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟“

مراد نے مونٹا کی طرف دیکھ کر مونا نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔ ہچکچانے لگی۔ ڈاکٹر نے پریشان ہو کر مراد کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا جیسے خاموشی سے سمجھا رہا ہو۔ ”پلیز! ابھی کچھ نہ کہنا۔“ مراد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تم صحت یاب ہو جاؤ۔ ہسپتال سے آ جاؤ۔ پھر طبیعتان سے باتیں کریں گے۔“

ڈاکٹر اور مونا نے طبیعتان کی کمری سانس لی۔ پھر ڈاکٹر نے کہا۔ ”میرا خیال ہے‘ میاں بیوی کو کچھ دیر تنہا چھوڑ دینا چاہیے۔ آؤ باہر گاڑن میں بیٹھیں۔“

وہ باہر جانے لگے۔ انکوائری کاؤنٹر کے پاس سے گزرتے وقت استقبالیہ کلرک نے کلمہ ”ڈاکٹر آپ کا فون ہے۔“

اس نے ریموٹر لے کر دوسری طرف کی باتیں سنیں۔ ان کا جواب دیا۔ پھر ریموٹر رکھتے ہوئے مراد سے کلمہ ”مجھے ایک اہم مریض کو انیڈ کرنا ہے۔ اس لیے جا رہا ہوں۔ تم تھوڑی دیر گارڈن میں وقت گزار لو۔ ملاقات کا وقت ختم ہوتے ہی مونا کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔“

ڈاکٹر چلا گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک کھڑا دور اس دارو کی طرف دیکھتا رہا جہاں مونا کو کامران کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں سینہ خالی قتلہ دل رقیب کے ہاتھوں میں چھوڑ آیا تھا۔

مونا کا ہاتھ ابھی تک کامران کے ہاتھوں میں تھا۔ صرف ہاتھ ہی ہاتھوں میں آسکتا تھا۔ حلال کی لندن کی فضا میں مرد، عورتوں کو، میاں بیوی کو بڑی آزادی ہوتی ہے۔ وہ سرعام بھرپور محبت کا اظہار کر سکتے ہیں لیکن کامران کی تہذیب اور مونا کی شرم یہ گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے کلمہ ”تم نے میرے دوست کو آخر آزما لیا۔ کل اعتراض کر رہی تھیں۔ آج اس کی دوستی کی قائل ہو گئیں۔“

”ہاں، ملاقات انسان کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں۔ قائل ہونا پڑتا ہے۔“

”تجس اور کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟“

”ہو گی بھی تو نہیں بتاؤ گی۔ تم یہاں ہسپتال میں رہ کر کیا کر لو گے؟“

”میں تمہارے لیے یہاں سے بھاگ آؤں گا۔“

”بھی تو نہیں چاہتی۔ میری محبت تجس دوڑنے پر مجبور کرے گی لیکن تم دوڑ نہیں سکو گے۔ میں تجس بے بسی اور بے چارگی کے احساس میں جلا نہیں کرنا چاہتی۔“

”تمہاری باتوں سے ظاہر ہوتا ہے، مجھ سے کچھ چھپا رہی ہو۔ مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتیں۔“

”یہ درست ہے کہ تجس پریشان نہیں کرنا چاہتی دیے کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔“

”کیا تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”بالکل سچ کہہ رہی ہو۔ ہاں اگر کوئی بات ہوئی تو میں تجس کیوں پریشان کر دوں گی۔ تمہارے دوست جو موجود ہیں۔ تجس ان پر اعتماد ہے۔ مجھے بھی اعتماد ہے۔ کیا مسٹر

مراد میرے کام نہیں آئیں؟“

”کیوں نہیں؟ وہ تو جی جان سے کام آئے گا۔ تم اس کا دوستانہ جذبہ دیکھ ہی چکی

ہو۔“

”ہاں، دیکھ رہی ہوں۔“

اجتال کے باہر گارڈن میں مراد کھڑا ہوا اس دارو کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جیسے اس کی نگاہیں ایکسرے کی طرح وہاں پہنچ رہی ہوں جہاں مونا بیٹھی ہے وہ کامران کے لیے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس وقت پوری کی پوری کامران کے لیے ہے۔ اس کی کنگسو، اس کا لوبہ، اس کی محبت کامران کے لیے ہے۔ میں الو کا چٹا ہوں کہ یہاں کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا ہوں۔

کبھی وہ بہت ہی جارحانہ انداز میں سوچتا تھا۔ جی چاہتا تھا فوراً ہی اسے جین جیٹ کر اپنی ملکیت بنا لے۔ اکثر لوگ جذباتی ہوتے ہیں۔ جنونی ہوتے ہیں لیکن اس حد تک نارمل ہوتے ہیں کہ جنونی ارادوں پر عمل نہیں کر سکتے۔ مونا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ شریف آدمی اپنی عزت سے ڈرتا ہے۔ جب انسانوں کی سوسائٹی میں وہ کر اپنی پسند کی عورت کو حاصل نہیں کر سکتا تو سوچتا ہے، کاش وہ کسی چھوٹے سے جزیرے میں اسے لے جائے۔ جزیرے میں کوئی نہ ہو۔ چاروں طرف پانی ہی پانی ہو گا۔ نہ کوئی آسکے گا نہ وہ جاسکے گی۔ اس کی اپنی وہ کر رہ جائے گی۔

وہ سالن کا اندھا قتلہ اس لیے ہرالی سوچ رہی تھی۔ گارڈن کی ہرالی پر کبھی وہ قتلہ تھا۔ کبھی بیٹھ کر انتظار کرتے لگتا تھا۔ آخر ملاقات کا وقت ختم ہو گیا۔ مونا مسکراتی ہوئی اس کے پاس آئی۔ اس طرح ہلکی سی مسکراہٹ سے اس کا تمام سر ہلکا مسکراتا ہوا لگتا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ غصہ بھول گیا۔ جیسے وہ صبح کی بھولی بچی شام کو آگئی ہے۔ قضا غصہ قہوک دینا چاہیے۔ معاف کر دینا چاہیے۔

وہ بے اختیار مسکرانے لگا۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ”میں اس وقت سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر تم نہ آئیں تو میں ہمیں انتظار کرتا رہ جاؤں۔ خواہ دن گزر جائے۔ رات گزر جائے۔ صدیاں گزر جائیں۔“

موتا ہنسنے لگی۔ کتنی سربلی، کتنی مدھر ہنسی تھی۔ اس کی سنجیدگی اور خاموشی میں بڑی جاذبیت، بڑا دھار تھا اور اس کی ہنسی میں بلا کی ترغیب تھی۔ وہ جیسا بھی رویہ، جیسا بھی مزاج اختیار کرتی، دہانے کے لیے قابل قبول ہوتا۔ اس لیے وہ ہنس کر بول کر ان آزمائشی مرحلوں سے گزر جانا چاہتی تھی۔

۔۔ وہ اس کے ساتھ کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے ڈرائیو کرتے ہوئے پوچھا۔ ”کہاں چلو گی؟“

”میں تمہارے بس میں ہوں۔ جہاں لے چلو۔“

اس کی ہاتھیں کھل اٹھیں۔ سوچنے لگا۔ اگر یہ میرے بس میں ہے تو میں اسے بے بس کر سکتا ہوں۔ یہ سوچتے ہی اس نے کہا۔

”کاؤچ چلتے ہیں۔“

”وہاں جا کر کیا کریں گے؟“

”یونہی تھائی میں وقت گزاریں گے۔“

وہ ہنسنے ہوئے بولی۔ ”آپ تھائی کا مطلب نہیں سمجھتے۔ ورنہ کاؤچ جانے کی بات نہ کرتے۔ تھائی تو اس کار میں بھی ہے۔ باہر سے کوئی ہماری اس تھائی میں غل نہیں ہو سکتا۔ ہم کسی گاڑوں میں جا کر بیٹھیں گے، کوئی ہمارے قریب نہیں آئے گا۔ ہم کسی ریسٹوران میں جائیں گے، وہاں بھی کوئی تیسرا نہیں آئے گا۔ ہماری میز پر تھائی ہوگی۔ ایسے بے شمار مقامات ہیں جہاں لوگ موجود تو ہوتے ہیں لیکن وہ دوستوں کو ان کے درمیان تھائیاں میسر ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تھائیاں منہ بند ہوتی ہیں، محافظ ہوتی ہیں۔ بدنامی سے بچاتی ہیں۔“

اس کی باتیں سن کر مراد کو ڈاکڑ کی باتیں یاد آئیں۔ اس نے کہا تھا۔ پہلے محبت نہیں ہوتی، پہلے دوستی ہوتی ہے۔ پھر یہی دوستی رفتہ رفتہ محبت میں بدل جاتی ہے۔ لہذا صبر

و قفل سے کام لو۔ رفتہ رفتہ مائل ہونے دو۔

اس نے قائل ہو کر کہا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ محفل میں بھی تھائی ہوتی ہے۔ ہمیں ہلکی ہی تھائیوں کو پسند کرنا چاہیے جہاں دوستی پر الزام نہ آئے۔“

وہ اسے لندن کی سیر کرانا رہا۔ دوسرا کو انہوں نے ایک جگہ لچک لکھ پھراس نے موتا سے پوچھا۔ ”کیا تم لچک کے بعد آرام کرتی ہو۔“

”اگر مسلسل کام کے بعد تھک جاؤں تو کھانے کے بعد آرام کرتی ہوں لیکن یہاں تو ممکن کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم تفریح کر رہے ہیں۔ آرام ہی کر رہے ہیں۔“

وہ مایوس ہو گیا۔ لندن کی ہماری آبادی میں موتا کے ساتھ تھائی میسر تھی۔ اس کے باوجود وہ کاؤچ چاہتا تھا اور وہ جانے سے کترا رہی تھی۔ شام سے کچھ پہلے اس نے کہا۔ ”اب تم کامران سے ملاقات کرنے ہسپتال جاؤ گی، ہسپتال چل کر لباس تبدیل کر لو۔“

اس نے معصومیت سے پوچھا۔ ”اس لباس میں کیا خرابی ہے؟“

”میں نہیں چاہتا کہ صبح جو لباس پہنا ہے وہ.....“

موتا ایک دم سے اداس ہو کر وینڈ اسکرین کے پار دیکھنے لگی۔ پھر بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”جیسے سب کچھ مل سکتا ہو اور اسے کچھ نہ ملے تو وہ ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بھل جاتا ہے۔ اس کے سامنے کھنسی چوٹی کرنے اور اپنے آپ کو ہنا ستوار کر پیش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔“

مراد اس کی ہماری سنجیدگی کے پیش نظر کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ سوچ کر صبر کرنے لگا کہ وہ تمام دن اس سے کتنا زاری رہے لیکن رات کو کاؤچ میں جانا ہی ہو گا۔ یہاں اس کا کوئی دوسرا ٹھکانہ نہیں ہے۔

وہ دونوں کامران کے پاس پہنچے۔ وہ بستر پر نہیں تھا۔ قریب ہی ایک کھڑکی کے پاس کھڑا ہوا کبھی باہر دیکھ رہا تھا۔ کبھی ہر آہٹ پر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ پھر موتا اور مراد کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھو میں بستر سے اٹھ سکتا ہو۔ چل سکتا ہوں۔ انشاء اللہ کل صبح تک چلتے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔“

مونا خوشی سے کھل گئی لیکن مراد مرتحاکہ اسے توقع نہیں تھی کہ وہ وہی دن میں ہسپتال سے اٹھ جائے گا۔ مونا خوش ہو کر اس کی طرف بڑھنے لگی۔ کامران بھی دونوں بازو پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اگرچہ اس کے چہرے سے کمزوری اور چال سے ڈگمگاہٹ ظاہر ہو رہی تھی، تاہم وہ مسکرا رہا تھا۔ خود آگے چل کر محبت کو پا لینے میں جو مسرت حاصل ہوتی ہے، وہ مسرت زخموں کو اور پیاریوں کو بھلا دیتی ہے۔ آگے بڑھ کر آنے والی کے استقبال کا حوصلہ دیتی ہے۔

کامران کے ہاتھوں میں مونا کا ہاتھ یوں آیا جیسے پھول آیا لیکن پھول کے ساتھ کانٹے بھی آتے ہیں۔ اچانک مراد کے دو ہاتھوں نے ان دونوں کے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لیا جیسے وہ بھی ہاتھ ملا رہا ہو۔ اس وقت تینوں کے ہاتھ ایک دوسرے کی گرفت میں تھے۔ مونا نے فوراً ہی اپنے ہاتھوں کو کھینچ لیا۔ الگ ہو گئی۔ مراد نے جینپ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہیں صحت یاب ہونے کی مبارک دعا دیتا ہوں۔ شاید دو چار روز میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤ گے۔“

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”تم دو چار دن کی بات کرتے ہو، میں کل ہی مری سے چھٹی لینے کی کوشش کروں گا۔ میں مونا سے دور نہیں رہ سکتا۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”تم جب سے مونا کی زندگی میں آئے ہو۔ میں دعوے کرتے رہے ہو لیکن ہمیشہ دور رہتے آئے ہو۔“

”یہ تو تقدیر کو منظور تھا۔ شاید اب منظور نہ ہو۔“ اس نے مونا کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمارے لمن کی گھڑی آنے لگی ہے۔“

وہ سر جھکا کر شہزادی تھی، مسکرا رہی تھی۔ اس کی یہی ادائیں جان لیتی تھیں اب وہ شہزادے نہ، مسکرائے نہ، کوئی ادا دکھائے نہ تو پھر وہ عورت کس کام کی؟ وہ دیکھنے والوں کو یہ تو نہیں کہتی تھی کہ وہ دیکھیں اور دیوانے بن جائیں۔ اب مراد اس کی ایک ایک ادا پر قربان ہو رہا تھا تو اس میں اس بچاری کا کیا قصور تھا؟

مراد سوچتی ہوئی نظروں سے کبھی مونا کو اور کبھی کامران کو دیکھ رہا تھا جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے تیزی سے پلٹ کر جاتے ہوئے کہا۔ ”میں باہر انتظار کر رہا

ہوں۔“

وہ یوں کہہ کر گیا جیسے مونا پر فیصلہ چھوڑ رہا ہو کہ میں ہسپتال کے باہر ہوں، کامران اندر ہے۔ کہاں آؤ گی؟ کتنی جلدی آؤ گی؟ اگر دیر سے آؤ گی تب بھی آنا ہی ہو گا۔ کامران کی زندگی سے لگنا ہی ہو گا۔ یہ تقدیر کا بھی فیصلہ ہے اور موجودہ حالات کا بھی۔

اس کے جانے کے بعد مونا نے پوچھا۔ ”کیا ہسپتال سے کل چھٹی لے سکتے ہو؟“

”مجھے یقین ہے کہ کل میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ تمہارے ساتھ ہسپتال سے باہر جا سکتا ہوں۔“

”کیا بریڈ فورڈ بچنے کے لیے زیادہ چلنا پڑے گا؟“

وہ ہنسنے لگا۔ ”لندن میں پیدل چلنے کی ضرورت قدم قدم پر پڑتی ہے اور چلنے والے تو میلوں پیدل چلتے ہیں۔ ویسے ہم بس کے ذریعے بریڈ فورڈ جا سکتے ہیں اور برٹش ریل کے ذریعے بھی۔“

وہ خوش ہو کر بولی۔ ”ہم ریل کے ذریعے سفر کریں گے۔“

”جب مراد کی کار موجود ہے۔ ہم اس میں آرام سے سفر کر سکتے ہیں تو پھر.....“

وہ بات کاٹ کر بولی۔ ”میں کسی کا زیادہ احسان لینا نہیں چاہتی۔ مراد صاحب نے ہمارے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ اگر ہم اکیلے سفر کریں تو کیا ہرج ہے؟“

”میں پوری طرح چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہوں۔ جتنے آرام سے بریڈ فورڈ پہنچ سکو اتنا ہی بہتر ہے۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ ”میں مراد کا احسان لینا نہیں چاہتی۔“

”عجب بات ہے۔ کل تم اس پر مجبور ہو۔ نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ صبح آ کر اس پر مجبور ہو کر شروع کیا۔ اس کی تعریفیں کیں۔ اب تمہارے تیور پھر بدل رہے ہیں۔ کیا میرے دوست سے کوئی غلطی ہوئی ہے؟“

”غلطی ہم سے ہوئی ہے۔ تم نے مجھے مراد کے حوالے سے بلایا۔ میں تمہارے پاس آنے کے لیے ایسی دیوانی تو نہیں تھی۔ کیا ہمیں اس کے غلط نتائج کا سامنا نہیں

کرنا پڑے گا؟

”کیسے غلط نتائج؟ تم کہنا کیا چاہتی ہو؟“

”میں نے سنا ہے، کتابوں میں پڑھا ہے، دوسروں کو بھی دیکھتی آئی ہوں جو غلطی کرتے ہیں، وہ ضرور بچھتا ہے۔ کیا ہماری غلطی کا کوئی غلط نتیجہ نہیں نکلے گا؟“

”تم خواہ تو اہ پریشان ہو رہی ہو۔ ضروری نہیں کہ ایک غلطی مجبوری کی حالت میں کی جائے تو اس کا نتیجہ ہماری توقع کے خلاف نکلے۔“

”نکلے گا تو ہم کیا کر سکیں گے؟“

”حالات کا مقابلہ کریں گے، ہم کمزور نہیں ہیں۔“

مونا نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور سر پر جگہ جگہ پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اس کا جسم زخموں سے سجا ہوا قتل بے شک وہ کمزور نہیں تھا لیکن حالات اسے کمزور بنا سکتے تھے۔ وہ ایک گرمی سانس لے کر بولی۔ ”اچھی بات ہے، نتیجہ سامنے آنے کا تو دیکھا جائے گا۔ ابھی بحث فضول ہے۔“

”مونا! شاید ہمارے جیسے دو لدا دلن کوئی نہ ہوں۔ شادی کو اتنا عرصہ گزر گیا لیکن ہمیں ایک پل کی تلافی میسر نہیں ہوئی۔“

مونا کی آنکھیں پھینکنے لگیں۔ وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی مگر آنسو بھری آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ میں نے سنا کہ پہلی رات تمہارے ساتھ یوں گزارا کہ تم تمہیں تھے۔ ایک سایہ تھے جسے میں دیکھ سکتی تھی، پکڑا نہیں سکتی تھی۔

بیوی اپنے شوہر کے سامنے میں رہتی ہے۔ دوسری رات نہ تو میں تمہارے سامنے میں تھی اور نہ ہی تمہارا وہ سایہ میرے ساتھ قتل پہلے میں پکڑا نہیں سکتی تھی۔ صرف دیکھ سکتی تھی۔ اب دیکھ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس کے بعد ہر شب باقی سنا رہا کہ کوئی کسی کے کنک کو دیکھ کر روتا ہے۔ میں سنا کہ سرخ جوڑے کو دیکھ کر روتی رہی۔

آج میرے سنا کہ کا اچھل کا ایک نام نثار شوہر کی گرفت میں ہے۔ وہ اچھل کھینچ رہا ہے۔ میرا سر ٹکا ہو رہا ہے۔ یہ مکافات عمل ہے، ہم نے دیس میں جو بویا، وہ

ہو دیس میں کاٹ رہے ہیں۔

کامران نے آہستگی سے کہہ ”آنسو پونچھ لو۔ لوگ کیا کہیں گے؟“

وہ منہ پر آچھل رکھ کر آنسو پونچھنے لگی۔ ملاقات کا وقت ختم ہو رہا تھا۔ اس نے رخصت ہوتے ہوئے کہہ ”مجھے یقین ہے، کل تم میرے ساتھ چلنے کے قابل ہو جاؤ گے۔ میرا سہارا لے کر چلو گے تو کم از کم ساتھ رہے گا۔ میں تمہا کی کے رحم و کرم پر نہیں رہ سکتی۔“

وہ بڑی محبت سے رخصت ہو گئی۔ باہر گاڑوں میں مراد انتظار کر رہا تھا۔ شام کی تاریکی پھیل رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھا۔ جیسے یہ دوسری رات بڑی مرادوں کے بعد آ رہی ہے۔ اس نے کار میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ”کالچ چلو گی؟“

”تھوڑا دیر گھومنا چاہتی ہوں۔ کچھ کھانے کے بعد چلیں گے۔ کیا گھر میں جا کر پکڑنے کا ارادہ ہے؟“

”کامران ہسپتال سے آ جائے تو ہم گھر میں پکائیں گے اور خوب انجوائے کریں گے۔“

وہ رات کے کھانے کے بعد تقریباً دس بجے کالچ میں پہنچا۔ مراد بہت خوش تھا۔ ہولے ہولے گفتگو کر رہا تھا۔ لطیفے سنا کر اسے ہنسنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کالچ کے سامنے پہنچ کر اس نے گاڑی روکی۔ مونا نے اس دوران اس کے ساتھ بیٹھتے بولنے رہنے کی کوشش کی تھی لیکن اندر ہی اندر ذرا خوف زدہ اور پریشان تھی۔ ایک اجنبی میزبان کے ساتھ یہ دوسری رات تھی۔ سوچ رہی تھی، کسی طرح یہ رات عزت و آبرو سے گزر جائے تو زندگی ایک سخت امتحان سے گزر جائے گی۔

وہ کالچ کے دروازے پر پہنچا۔ پھر اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ”آج تم سے اپنی زندگی کی سب سے اہم گفتگو کروں گا۔“

”کیا ان باتوں کا تعلق مجھ سے ہے؟“

”خاص تم سے ہی ہے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”پھر تو میں چاہتی ہوں، آپ میرے نقصان کی باتیں نہیں کریں

”کے“

دروازہ کھل گیا۔ وہ خوش ہو کر بولا۔ ”کیا تمہیں مجھ پر اتنا اعتماد ہے؟“

”آپ مجھے اتنی دیر تک بٹاتے رہے۔ خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر بھلا دکھ پہنچانے کی باتیں کیوں کریں گے؟“

وہ اپنے کمرے کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔ پھر چونک کر بولی۔ ”اودہ میں اپنا پرس تو کار میں بھول آئی۔ ابھی لے آئی ہوں۔“

”غصہ“ میں لا رہا ہوں۔“

وہ کانچ کے باہر آیا۔ اس نے کار کو لاک کر دیا تھا۔ دروازہ کھول کر اگلی سیٹ پر بڑے ہوئے پرس کو اٹھایا۔ وہ بست ہلاک رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جب یقین ہو گیا کہ مونا وہاں نہیں ہے تو فوراً ہی اسے کھول کر تلاشی لینے لگا لیکن وہ خالی تھا۔ اسے برا تعجب ہوا۔

اس نے پرس کو بند کیا۔ پھر کار کو لاک کرنے کے بعد کانچ کے اندر آیا۔ مونا وہاں نہیں تھی۔ اس نے پکارا۔ ”مونا!“

بیڈ روم کے اندر سے آواز آئی۔ ”میں یہاں ہوں اور میں نے اپنے دروازے کو اندر سے لاک کر لیا ہے۔ رات زیادہ ہو گئی ہے۔ ہم دونوں تھکے ہوئے ہیں۔ لہذا آرام سے سو جانا چاہیے۔ صبح ملاقات ہوگی۔ شب بخیر۔“

مرد حیران پریشان بند دروازے کو دیکھنے لگا۔ اب اسے خالی پرس کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ مونا نے پہلے ہی بیڈ روم کی دونوں چابیاں اور نقد رقم وغیرہ کو اپنے پاس چھپا لیا تھا۔ خالی پرس کو گاڑی میں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔ ”کیا تم نے مجھے بے وقوف بنانے کا منصوبہ پہلے ہی بنایا تھا۔“

اندر سے جواب ملا۔ ”تم نے بھی کافی میں خواب آور دوا ملانے کا منصوبہ پہلے ہی بنالیا تھا۔ میں نے اپنی حفاظت کے لیے پیشگی منصوبہ بندی کی اور اس پر عمل کر رہی ہوں۔“

”مونا! یہ میرے لیے چیلنج ہے۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں، مرد کو کبھی نہ بھڑکایا کرو۔“

اگر میں بھڑک گیا تو دروازے کو توڑ کر رکھ دوں گا۔“

”تم تو بڑا شروع کرو گے، میں چننا شروع کروں گی۔ لوگ جمع ہو جائیں گے۔ میرے دل سے تمہاری کا خوف جاتا رہے گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ موجودہ حالات پر غور کرتا رہا۔ اگر وہ شوہر کی حیثیت سے دروازہ کھولنے پر مجبور کرتا تب بھی ناکامی ہوتی۔ مغربی ممالک میں شوہر اپنی بیوی پر خواہ مخواہ رعب نہیں ڈالتے۔ اس کی اجازت کے بغیر بیڈ روم میں بھی نہیں جاسکتے۔ پھر بھلا وہ دروازہ کیسے توڑ سکتا تھا۔ وہ تو محض دھمکی دے رہا تھا اور وہ دھمکی بے اثر ہو گئی تھی۔

وہ جھنجھلا کر اپنے بیڈ روم میں آیا۔ غصے سے ٹپکنے لگا۔ اسے کسی طرح قرار نہیں آ رہا تھا۔ پھر اس نے الماری کھولی شراب کی بوتل نکالی۔ اس کے بعد گلاس میں ایک پیکی لے کر پینے کے لیے اس نے غصہ مٹانے کے لیے ایک پیکی حلق سے اتارا۔ کچھ سکون محسوس ہوا۔ وہ آرام اور سہولت سے موجودہ حالات کا تجزیہ کرنے لگا۔ پھر وہ اطمینان سے چلا ہوا اور دوسرے بیڈ روم کے دروازے میں پہنچا۔ دستک دیتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مونا! میری بات سن لو۔ کل میں نے تمہاری کافی میں خواب آور گولیاں ملائی تھیں۔ یہ میری دشمنی نہیں تھی۔ میری دیوانگی تھی۔ میری چاہت تھی۔ ایک حصول کا جذبہ تھا۔ تم میری اس حرکت کو دشمن کی نظر سے دیکھو تو میں برا ہوں۔ دوست کی نظر سے دیکھو تو میں کامران سے بھی زیادہ تجھارا بھلا بھلا ہوں۔“

وہ چند لمحے چپ ہو کر جواب کا انتظار کرتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ”میری طلب وقتی نہیں ہے۔ پائیدار ہے۔ میں تمہیں بیشک کے لیے اپنا چاہتا ہوں۔ میں اپنا نام اپنی عزت اپنی شہرت اپنی دولت اپنا سب کچھ تمہارے نام کرنا چاہتا ہوں یقین نہ ہو تو پہلے سب کچھ اپنے نام کر لو۔ پھر چاہو تو مجھے کنگال بنا کر دھکا دو۔ میں پھر بھی ثابت قدم رہوں گا اور آخری سانس تک تمہیں تم سے طلب کرتا رہوں گا۔“

اس نے پھر جواب کا انتظار کیا۔ پھر بیڈ روم کے اندر خاموشی رہی۔ وہ پلٹ کر اپنے کمرے میں آیا۔ دوسرا پیکی بنا کر اسے حلق سے اتارنے لگا۔ محسوس ہوا جیسے قطرہ

تقرہ شراب کوئی اثر نہیں دکھا رہی ہے۔ اس نے بوتل کی گردن دو بچ لی۔ جیسے موتی کی گردن ہاتھ آگئی ہو۔ پھر اس نے بوتل کو منہ سے لگالیا۔ غٹا غٹ دو چار گھونٹ حلق سے اتار کر مری سانس لینے لگا۔ دو گھونٹ اور پینے کے بعد وہ بیڑ روم سے باہر آکر لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں بولا۔ ”اے میں جانتا ہوں، تم جاگ رہی ہو۔ تم کیا سمجھتی ہو؟ کیا میں سنا ہوں۔ بھونک رہا ہوں۔ اس لیے جواب نہیں دیتا چاہیے۔ میں پھر تمہیں سمجھا رہا ہوں۔ مجھے بھونکے اور پھر کانٹے پر مجبور مت کرو۔“

وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا دروازے کے قریب آیا۔ بوتل کو منہ سے لگا کر دو گھونٹ حلق سے اتارے۔ پھر آستین سے منہ پونچھتے ہوئے بولا۔ ”تم میرے کھینچے میں ہو۔ یہاں میری بیوی ہو۔ میں چاہوں تو ایک لمبے کے لیے تم کامران سے نہیں مل سکتیں۔ اگر ابھی تم نے دروازہ نہ کھولا تو کل سے میں اپنے قانونی حقوق استعمال کروں گا۔“

اس نے بوتل پھر منہ سے لگائی۔ پھر دو گھونٹ پنے اور آستین سے منہ پونچھنے کے بعد کلمہ ”میں جانتا ہوں، تمہاری اجازت کے بغیر میں ازدواجی حقوق حاصل نہیں کر سکتا۔ تم بھی یہ مان لو کہ میری اجازت کے بغیر تم کامران کی بیوی نہ بن سکو گی۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔“

بیڑ روم کے اندر مونا ایک دم سے گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ اب تک وہ آرام سے لیٹی ہوئی تھی۔ مراد کی باتوں کو بکواس سمجھ کر نظر انداز کر رہی تھی لیکن یہ آخری بات دل کو لگ رہی تھی۔ یہ درست تھا؟ وہ قانونی شوہر بن کر اس کے اور کامران کے درمیان ایک ایسی دیوار بن سکتا تھا جسے کوئی نہیں گزیر سکتا تھا۔ یہاں اس کا کامران ہے بس تھا اور رضا مراد کو قانون کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

وہ چنگ سے اتر کر کھڑی ہو گئی۔ دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”میں آج بھی کامران کا بہترین دوست ہوں۔ میں نے پہلے بھی اس کے لیے قربانیاں دی ہیں۔ اب بھی دے سکتا ہوں۔ کیا وہ میرے لیے اتنی قربانی نہیں دے سکتا کہ میرے حق میں تم سے دستبردار ہو جائے؟ اور وہ ضرور قربانی دے گا۔ دوستی امتحان لیتی ہے اور وہ

اس امتحان میں ناکام نہیں ہو گا۔“

مونا انگار میں سر ہلاتے ہوئے دروازے کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔ وہ خاموش اداؤں سے کہہ رہی تھی۔ ”نہیں نہیں۔ کامران کبھی ایسی قربانی نہیں دے گا جس سے محبت پر حرف آئے۔ جس سے عورت کی حیا نلام کا مال بن جائے۔ ہرگز نہیں۔ کامران کبھی ایسا نہیں کرے گا۔“

باہر سے پھر مراد کی لٹکار سنائی دی۔ اس بار آواز بہت زیادہ لڑکھڑاتی ہوئی تھی۔ وہ بمشکل الفاظ ادا کر رہا تھا کہ رہا تھا۔ ”اے“ تم سو گئی ہو یا مر گئی ہو؟ میں جانتا ہوں تم نہیں مر گئی۔ تم نے مجھے مار ڈالا ہے۔ باہر آؤ اور مجھے محبت سے مارتی رہو۔ میں مرنا رہوں گا۔ ضد کرو گی تو تمہارے اور کامران کے درمیان آج بھی اور کل بھی سات سمندر کا فاصلہ قائم رہے گا۔“

وہ دروازے سے لگ گئی تھی۔ پریشان ہو کر سوچ رہی تھی۔ اپنے سر کو تھام کر دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ”میں پیدا کیوں ہوئی؟ پیدا ہوئی تو جوان کیوں ہوئی؟ جوان ہوئی تو بے نام ساکن کیوں بنی؟“

یہ سوچنے کے دوران دروازہ ہولے سے لرز گیا۔ جیسے دوسری طرف سے دھکا دیا گیا ہو۔ جبراً اسے کھولنے کی کوشش کی گئی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ بیٹھ گئی۔ کی ہول سے آنکھ لگا کر دیکھنے لگی۔ پہلے مراد کی پشت نظر آئی۔ وہ دروازے سے ذرا دور جا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ رک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے ہاتھ میں شراب کی بوتل پکڑی ہوئی تھی۔ اب وہ بوتل کو منہ سے لگا کر ایک ایک گھونٹ پی رہا تھا۔ دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جھجھلا رہا تھا۔ پھر اس نے گھونٹا دکھاتے ہوئے کلمہ۔ ”میں دروازے کو نہیں توڑ سکتا مگر قانون کے ایک گھونٹے سے تمہاری ازدواجی زندگی کو ریڑھ کر سکتا ہوں۔“ اس نے ایک ہنگی لی۔ نشے میں لڑکھڑاتا پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کی ہول سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ یقیناً لڑکھڑانے کے بعد اونٹھے منہ گرا ہو گا۔ ہنگی سی دھپ کی آواز سنائی دی تھی۔

وہ کی ہول کے پاس سے ہٹ گئی۔ بخش پیدا ہوا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ کیا کرنے

والا ہے۔ کیا نشہ اس پر غالب آئے گا یا وہ نشہ اسے دیوانہ بنا کر دروازہ توڑنے پر مجبور کرے لگ بھگ پتا نہیں آج رات کیا ہونے والا ہے؟

اس نے سوچ آف کیا۔ اپنے بیڑ دوم کی جی بھا دی۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ پھر وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کھڑکی کے پاس آئی۔ اس کے پردے کو ذرا سا ہٹا کر شیشے کے پار دیکھ لیا وہ فرش پر ادھر ہڈیاں ہوا تھا۔ اب آہستہ آہستہ بڑھاتا ہوا کھڑکی پر ہٹا ہوا چاروں شانے چٹ رہا تھا۔ کھلی ہوئی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس میں سے گری ہوئی شراب اس کے گریبان کو بھگو رہی تھی۔ اس نے پھر بوتل کو منہ لگا لیا۔ شراب اس کے حلق میں اترنے لگی۔ اس کا بہت سا حصہ فرش پر اور اس کے لباس پر بہہ گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں بوتل خالی ہو گئی۔ اب ایک قطرہ بھی نہیں گر رہا تھا۔ اس نے جھنجھلا کر بوتل کو زور سے سامنے والی دیوار کی طرف دے مارا۔ پھر اٹھنے لگا مگر اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ بار بار گر جاتا تھا۔ پھر اس نے فرش پر کئی ٹپکی۔ اس کے سارے اٹھنے کی کوشش کی۔ اٹھنے کے دوران اس نے پھر دروازے کی طرف دیکھ لیا۔ اس کی طرف گھونسا دکھانا چاہا لیکن نشہ اس قدر زیادہ تھا کہ ہاتھ پاؤں اس قدر ڈھیلے پڑ رہے تھے کہ وہ گھونسا دکھانے کے لیے مضی نہیں باندھ سکتا تھا۔ وہ اٹھنے اٹھنے پھر لڑکھڑا کر اونٹھ سے منہ گر پڑا۔ اس بار وہ اٹھ نہ سکا وہیں بڑھاتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز ڈوبتی جا رہی تھی۔ مونا چپ کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ سسے ہوئے انداز میں سوچ رہی تھی۔ کئیں شراب کی زیادتی اسے مار نہ ڈالے۔ اگر یہ مرجائے گا تو کیا ہو گا؟

ہو گا کیا؟ ایک مصیبت ٹل جائے گی۔ ایک دشمن مرجائے گا لیکن اس کاٹج میں اس کی موجودگی میں دشمن کی موت اس کے لیے پریشانی کا باعث ہوگی۔ اگرچہ اس کی موت کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوگی۔ تاہم وہ کامران مرتضیٰ عرف مراد کی بیوہ کھلائے گی۔ اس کی موت کے بعد لندن میں رہنے کا کیا جواز رہے گا؟ کیا وہ اپنے مرحوم شوہر کی مٹی کیب ابھنی کا کاروبار سنبھال سکے گی۔ تو یہ وہ مراد کو اپنا مرحوم شوہر تسلیم کیوں کرے گی۔ جب کہ اسے زندہ شوہر تسلیم نہیں کر رہی ہے لیکن قانون کے آگے بے بس ہوگی۔

پھر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس نے مراد کے کاروبار کو سنبھال لیا تو اپنے کامران مرتضیٰ کے ساتھ کیسے ازدواجی زندگی گزار سکے گی؟ وہ لندن میں اس کا قانونی شوہر نہیں کھلائے گا ہاں، ایک بات ہے کہ وہ مرحوم کامران مرتضیٰ کے حوالے سے یہاں کی قانونی اور باقاعدہ شہری رہے گی۔ اگر اپنے کامران مرتضیٰ کو یہاں کا باقاعدہ شہری بنانا چاہے تو اس سے شادی کر سکتی ہے۔ ایک بیوہ جو باقاعدہ شہری ہو وہ کسی بے قاعدہ شہری سے شادی کر کے اسے یہاں کے شہری ہونے کا قانونی حق دلا سکتی ہے، مگر کیا وہ اپنے شوہر کامران مرتضیٰ سے دوبارہ نکاح پڑھائے گی؟

تو یہ تو یہ! انگریزیشن کے قوانین سے کھیلنے کے لیے، قانون کے ممانظوں کو ایک فریب دیا۔ سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں چلی آئی۔ اب ایک فریب کے بعد کتنے ہی فریب کے جال پھیلنے جا رہے تھے۔ پتا نہیں اسے کیا کچھ کرنا ہو گا۔ یہ سمجھ میں آ گیا تھا، جو کچھ بھی کرنا ہو گا وہ اخلاق، تہذیب اور قانون کے خلاف ہی ہو گا۔

وہ فرش پر اونٹھ سے منہ پڑا ہوا تھا۔ بالکل بے حس و حرکت تھا۔ کھڑکی سے ذرا دور تھا۔ اس لیے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سانس چل رہی ہے یا نہیں؟ کیا وہ مرچکا ہے؟ وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گئی۔ پردے کو برابر کر کے اندر سے میں کھڑکی کچھ سوچنے لگی۔ اس کا دل بری طرح گھبرا رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے باہر ایک میت پڑی ہے۔ وہ ایسے گھر میں ہے جو آسپ زدہ ہو چکا ہے۔ کیا اس کی روح بھٹک رہی ہو گی؟ کیا وہ ادا نہ آسکا؟ اس کی روح تو کمرے کے اندر آئے گی۔

وہ سسہ کر، تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ اگرچہ وہ ضعیف الاعتقاد نہیں تھی۔ پھر بھی ان حالات میں جانے کیسے کیسے خیالات دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ اس کی پریشانی میں اضافہ کر رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ آج رات کیا ہو رہی ہو گی۔ وہ خواہ کتنی ہی حوصلہ مند ہو تاریکی میں نہیں رہ سکتی تھی۔

رات گزر رہی تھی۔ ادھر مراد فرش پر پڑا ہوا تھا۔ ادھر وہ کمرے میں ٹل رہی تھی۔ کبھی بیٹھ رہی تھی، کبھی اٹھ رہی تھی۔ آنکھوں سے نیند اڑ گئی تھی۔ پھر پتا نہیں کتنا وقت گزر گیا۔ مراد کے جسم میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی۔ وہ کرانے لگا۔ آہستہ آہستہ

آنکھیں کھولنے لگا۔ وہ جہاں پڑا ہوا تھا وہاں سے باب کی روشنی نظروں میں دھندلا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر پکڑا رہا قلعہ درو دروار کھولتے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ ہر چیز آہستہ آہستہ گردش کر رہی تھی۔ اسے یاد آیا کہ وہ بند دروازے کو کھول نہیں سکا تھا۔ اس نے لڑکھائی ہوئی زبان سے کلمہ ”آجاؤ“ دروازہ کھول کر آجاؤ۔ اگر یہ دروازہ آج نہ کھلا تو دوستی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ کل سے دشمنی کے دروازے کھل جائیں گے۔“

وہ کہتے کہتے رگ میلہ بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ دروازہ کھلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ بھی نظر آ رہی تھی۔ اگرچہ سر پکڑا رہا قلعہ دماغ قابو میں نہیں تھا پھر یوں لگ رہا تھا جیسے وہ حقیقت ہو، جیسے خواب ہو۔ جو کوئی بھی ہو اس کی دھمکی کے مطابق دروازہ کھل چکا تھا۔ وہ سامنے آگئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ فرش پر ٹیک کر اٹھنے لگا۔ اگرچہ ڈمگا رہا تھا۔ اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکا تھا پھر بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جب مطالبہ پورا ہو رہا تھا وہ نکلنے والی چیز پھر ہاتھ آ رہی ہو تو ایسے میں توانائی حاصل ہو ہی جاتی ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ پیچھے ہٹ کر ایک طرف جاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔ تم نے دروازہ کھولنے کے لیے کہا“ میں نے کھول دیا۔ پاس آنے کے لیے کہا“ آئی۔ اب یو لویا چاہے ہو؟“

وہ سرخ لباس میں تھی۔ کل پاکستان سے سرخ ساری میں بوس آئی تھی۔ آج اس نے سرخ شلوار سوٹ پہنا ہوا قلعہ وہ ایسی ساکن تھی جو صرف لباس سے ساگ کا بھرم رکھ رہی تھی۔ ورنہ جس کی منکوحہ تھی اس کے من میں تھی اور جس کی منکوحہ نہیں تھی اس کے گھر میں تھی۔ نہ اسے حاصل ہو سکتی تھی۔ نہ اسے مل سکتی تھی۔ وہ لڑکھاتے ہوئے آگے بڑھل دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

سرخ پوش کہ لب ہام نظر ی آید

نہ بزور و نہ بزاری نہ بزور ی آید

وہ جو سرخ لباس میں نظر آ رہی ہے، وہ لب ہام ہے۔ میری پہنچ سے دور ہے۔ نہ میری قوت سے حاصل ہو سکتی ہے نہ آہ زاری سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی قریب

سکتی ہے۔ بیک شاعر نے ایسے ہی حالات کے لیے درست کہا ہے لیکن وہ شاعر یہ نہیں جانتا تھا کہ جو کسی طرح حاصل نہ ہو وہ چالاک ہی مل سکتی ہے۔

رخسار کا ہاتھ جیب سے باہر آیا۔ پھر ایک کٹاکٹ سے اچانک ہی چاقو کھل گیا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم نے پہلے ہی منصوبہ بنایا تھا کہ مجھے بے وقوف بنادو گی اور بیڑہ روم میں جا کر بند ہو جاؤ گی۔ میں بھی سوچ کر آیا تھا کہ کل تم نے کچن کا چاقو دکھایا تھا“ آج میں چاقو دکھاؤں گا۔ کل تہماری چال کامیاب ہوئی تھی“ آج میری ہو گی۔“

وہ گھبرا کر بولی۔ ”میں چیخنا شروع کر دوں گی۔“

”اس سے پہلے ہی یہ چاقو تہارے جسم میں اتر جائے گا۔ اگر اپنی زندگی چاہتی ہو تو چپ چاپ میرے پاس چلی آؤ۔“

”تم ابھی محبت سے کہہ رہے تھے کہ..... دروازہ کھولوں گی تو دوستی قائم رہے گی۔ ورنہ دشمنی کی ابتدا ہو گی۔ میں نے تہماری بات مان لی۔ کیا پھر بھی دشمنی کرو گے؟“

”ہاں“ ایک بار ہاتھ سے نگلی ہوئی چیز دوبارہ ہاتھ آ جائے تو پھر دھوکہ نہیں کھاتا چاہیے۔ میں اب قریب نہیں کھاؤں گا۔ میں اتنا اناڑی نہیں ہوں۔ آج تمہیں حاصل نہ کر سکا تو کل ہاتھ ملتا رہا جاؤں گا۔“

وہ آگے بڑھل یہ پیچھے ہٹنے لگی لیکن پچ کر کہاں جا سکتی تھی۔ چاقو اس کے ہاتھ میں قلعہ اس نے ایک ہاتھ سے اسے پکڑ لیا۔ دھمکی دی۔ ”اگر شور مچاؤ گی تو جان سے جاؤ گی۔“

پھر بھی اس نے ایک پیچ ماری۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چاقو سے حملہ کیا۔ پہلے حملے سے وہ پیچ نکلی لیکن پہنچنے کے ساتھ ہی پیچھے دیوار سے ٹکرائی۔ بدحواسی میں بھٹکنے کا راستہ نہ ملا۔ دوسرا حملہ ہوا۔ پھر اس کے جسم میں پے در پے چاقو کا پھل اترتا رہا۔ جسم سے خون کے چھینٹے اڑتے رہے۔ دیدے پھیلے رہے۔ وہ ساکت ہوتی رہی۔ ساکن کا سرخ جواں لہو کی سرخی میں بھینکا چلا گیا۔

انسان سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے جب اس نے پہلی بار چاقو سے حملہ کیا تو شیشہ ایک چھانکے سے ٹوٹ گیا قلعہ اس کے بعد اس نے پے در پے حملے کیے۔ مولانا زبانی

ہوتی تھی اس کی تصویر پر جابہ جاسور اٹھ پڑے گئے لیکن اس کی آنکھوں کے سامنے دیوار پر
مونا لیزا کی تصویر نہیں تھی بلکہ مونا دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ دیے مونا ہو یا مونا لیزا
مسکراہٹ کو ہر دور میں قتل کیا جاتا ہے اور وہ قتل کر رہا تھا۔ جوئی انداز میں چاقو سے حملے
کر رہا تھا۔ پھر وہ تھک کر ہانپنے لگا۔ گھور کر دیکھنے لگا۔ چند لمحوں کے بعد اس کے ہاتھ سے
چاقو جھوٹ کر گر پڑا۔ وہ اچانک ہی دھمازیں مار کر روئے لگا۔ روئے روئے دیوار سے
لپٹ کر کہنے لگا۔ ”آہ! میں نے یہ کیا کیا؟ تمہیں مار ڈالا۔ میں تمہارا قاتل ہوں۔ میں تمہارا
قاتل ہوں۔ مگر میں کیا کرتا؟ تم زندگی میں میرے ہاتھ نہیں آ سکتی تھیں۔ مگر مری ہاتھ
لگ سکتی تھیں۔ دیکھو! اب تم بے جان ہو گئی ہو۔ اب تم مدافعت نہیں کر سکو گی۔ مجھے
قریب آنے سے نہیں روک سکو گی۔ اس لیے تم میری سانسوں کے قریب ہو۔ میرے
جسم و جان میں سلائی ہوئی ہو۔“

وہ دیوار سے لپٹ رہا تھا اور نشے کی حالت میں آہستہ بڑھتا ہوا بیٹھتا جا رہا
تھا۔ پھر وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے بعد فرش پر لڑھک گیا۔ وہاں تھوڑی دیر تک خاموشی
چھائی رہی۔ آخر اس کے خزانے سلائی دیے گئے۔

مونا بیڈ روم کے اندر سہی ہوئی تھی۔ اس کی بک بک سختی رہی تھی۔ باتوں سے
ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے پاس چاقو ہے اور وہ چاقو سے کیسے حملے کر رہا ہے۔ اب وہ اس
کے خزانے سن رہی تھی۔

وہ خزانے رات کے اندھے سینے میں تیز خنجر کی طرح اتر رہے تھے۔ وہ راتیں
کیسی ہوتی ہیں جو سنا گئیں گزاری ہیں۔ یہ رات کیسی ہے جو ایک اچانک گزار رہی ہے۔

☆ ----- ☆ ----- ☆

کامران اپنے بستر پر گم صم بیٹھا سن رہا تھا اور مونا اسے سناری تھی۔ ایک ہوتا ہے
بات کہتا اور ایک ہوتا ہے بات سنا۔ وہ کبھی سولت سے کہتی جاتی تھی اور کبھی خوب
سٹاتی جاتی تھی۔ پھر ایک ہوتا ہے دکھڑا روئے کہنے اور سنانے کے دوران وہ روتی بھی جاتی
تھی۔

اس کی مکمل روداد سننے کے بعد کامران نے کہا۔ ”میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ
مراد جیسا دوست ایسی حرکتیں کر سکتا ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“
وہ غصے سے بولی۔ ”میں نے قیامت کی دو راتیں گزاری ہیں اور تمہیں یقین نہیں
آ رہا ہے۔ کیا تم نے مجھے اسی لیے بلایا ہے کہ میں اکیلی کمزور عورت تم سے دور شیطانوں
کی پناہ میں رہوں؟“

”مونا! یہ بات نہیں ہے۔ میں تمہاری ایک ایک بات کا یقین کرتا ہوں۔“
”یقین کرتے ہو تو ابھی ہسپتال سے چھٹی لے کر چلو۔ چھٹی نہ ملے تو مجھے بریڈ فورڈ
کے مکان کا پتا دے۔ میں تمہارا جا کر رہوں گی۔“
”تم تنہا کیسے جاؤ گی؟ یہ شہر شیطان کی آنت کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ پھر تمہیں مراد
کے ہاں سے اپنا سامان بھی لے کر آنا ہو گا۔“

”میں نے اپنا اور تمہارا تمام سامان وہاں سے سمیٹ لیا ہے۔“
”کیا وہ سب کچھ اپنے ساتھ لائی ہو؟“
”میں نے وہ سامان ریلوے اسٹیشن کے لاکر میں رکھ دیا ہے۔ لاکر کی چابی میرے
اِس ہے۔“

”تم اپنے بندہ روم میں اندر سے بند ہو گئی تھی۔ پھر کیسے نکل کر آئیں۔ کیا مراد نے نہیں روکا؟“

”میں تمام رات جاگتی رہی۔ وہ تمام رات خراٹے لیتا رہا۔ میری نیند اڑ گئی تھی اور شراب نے اسے سلا دیا تھا۔ صبح میں نے اپنے کمرے سے نکل کر دیکھا، وہ اسی طرح فرش پر پڑا ہوا تھا۔ میں نے اپنا اور تمہارا تمام سامان سمیٹا۔ فون کر کے ٹیکسی کو بلا دیا۔ پھر تمام سامان باہر نکال کر اس کاٹج کو لاک کر دیا۔ مراد کی جیب سے کاٹج کے دونوں چابیائیں نکال لیں۔ پیچھے کین کا دروازہ ہے۔ اسے بھی باہر سے لاک کر دیا ہے۔ وہ اب کاٹج سے نہیں نکل سکے گا۔ اگر نکل سکتا تو اب تک میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں پہنچ جاتا۔“ کامران اس کے بھوپہن پر مسکرایا۔ پھر کہنے لگا۔

”میں تمہیں ڈاکٹر جان ہنز کا فون نہر بتا رہا ہوں۔ اس سے رابطہ قائم کرو۔ اسے مختصر حالات بتاؤ اور یہاں آنے کے لیے کہو۔ اس کے ذریعے مجھے فوراً چھٹی مل جائے گی۔ مراد کاٹج میں بند رہ کر زخمی درندے کی طرح غرا رہا ہو گا۔ ڈاکٹر ہنز اسے قاپو کر کے لے گا۔“ اس کی بات ختم ہوتے ہی ڈاکٹر ہنز دروازے پر نظر آیا۔ اس نے وہیں سے مونا پر ایک نظر ڈالی۔ پھر تیزی سے چلا ہوا اس کے قریب آ کر بولا۔ ”مجھے مراد نے فون کے ذریعے بتایا ہے، تمہاری بیوی اسے کاٹج میں بند کر کے چلی آئی ہے۔ وہ غصے میں چیخ رہا ہے۔ دہاڑ رہا ہے۔ آخر اسے لاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

مونا نے پہلے تو گاداری سے ڈاکٹر کو دیکھا۔ پھر بڑے تحمل سے پوچھ لگا۔ ”ڈاکٹر! جنگلی درندوں کو بچھروں میں کیوں بند کیا جاتا ہے؟ ایک جنونی انسان کو سلاخوں کے پیچھے کیوں رکھا جاتا ہے؟“

”میں جانتا ہوں، مراد نے کوئی غلطی کی ہو گی لیکن.....“

مونا نے بات کٹ کر کہہ۔ ”لیکن آپ حالات پوری تفصیل کے ساتھ نہیں جانتے۔ اتنا ہی سمجھ لیجئے پچھلی دو راتیں میں نے جس طرح اپنی عزت کی حفاظت کرتے ہوئے گزاری ہیں، شاید کوئی دوسری عورت ہوتی تو حوصلہ ہار جاتی اور تمہارے مریض کی ہوس کا نشانہ بن کر رہ جاتی۔ میری تقدیر اچھی تھی یا بدتر اچھی تھی، میں سچ کہہ چکی آئی۔“

آپ وہاں جائیں اور کاٹج کھول کر دیکھیں۔ آپ کو وہاں شراب کی بوتلیں ملیں گی۔ چاقو لے گا اور مونا لیزا کی تصویر زخمی نظر آئے گی۔ شاید وہ نشے کی زیادتی کے باعث تصویر کی جگہ مجھے دیکھ رہا تھا، مجھ پر حملہ کر رہا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ اگر واقعی میں اس تصویر کی جگہ ہوئی، یہی کچھ ہو گا۔“

ڈاکٹر سر جھکا کر سوچنے لگا۔ پھر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”مراد بہت اور ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ لاعلاج نہیں ہے۔ مجھے آپ دونوں کا تعاون چاہیے۔“

”معاذ کیجئے گا ڈاکٹر! میں کسی صورت میں اس کے لیے تعاون نہیں کروں گی۔ میں تو اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

کامران نے کہہ۔ ”ڈاکٹر! آپ اسے اس طرح ٹریٹ کریں کہ مونا کو اس کے سامنے نہ جانا پڑے۔“

”تم اس کے دوست ہو، میرے ساتھ بھرپور تعاون کرو۔ میں کو شش کرتا ہوں اس سے مونا کا سامنا نہ ہونے پائے۔ مونا کو کسی ہوش و غمیرہ میں چھوڑ دیا جائے۔“

”میں کیسے نہیں جاؤں گی۔ بریڈ فورڈ میں میرے شوہر کی رہائش گاہ ہے۔ یہاں وہ ہیں رہوں گی۔“

”مسز کامران! میں سمجھتا ہوں، تم کسی پر بھروسہ نہیں کرنا چاہتیں لیکن عورتوں پر تو کر سکتی ہو؟ یہاں عورتوں کے بہت سے ہوش ہیں۔ تم چند دن کے لیے وہاں رہ سکتی ہو۔“

مونا اعتراض کرنا چاہتی تھی۔ کامران نے اسے سمجھایا۔ ”گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ عورتوں کے ہوش میں اجازت کے بغیر کوئی مرد داخل نہیں ہو سکتا۔ صرف میں تمہاری اجازت سے ملنے آ سکتا ہوں۔“

کامران نے سمجھایا تو وہ سمجھ گئی۔ ڈاکٹر ہنز نے پہلے تو کامران کو ہسپتال سے چھٹی دلائی۔ پھر دونوں کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن گیا۔ وہاں کے لاکر سے سامان لیا۔ پھر مونا کے لیے عورتوں کے ایک اچھے سے ہوشل میں جگہ حاصل کی گئی۔ وہ اس ہوشل کے ماحول سے مطمئن ہو گئی۔ اسے اچھی طرح اطمینان دلانے کے بعد وہ دونوں

کالج میں پہنچے۔ جب ڈاکٹر کی کار کالج کے سامنے آ کر رکی تو مراد اندر سے دروازے کو پیٹ رہا تھا۔ یقیناً اس نے کار کی آواز سن لی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دروازہ اب ضرور کھلے گا وہ بے صبری کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ بہر حال ڈاکٹر بختہ نے دروازے کو کھول دیا۔ اس کے کھلنے ہی مراد نے کامران کو دیکھ لیا۔ پھر ایک دم سے چپ ہو گیا۔ دونوں دوستوں کی نظریں ایک دوسرے سے ٹکرائی رہیں۔ کامران نے بڑی آہستگی سے 'بڑی نرمی سے پوچھا۔ "مراد! یہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے" اس پر مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔ کیوں کہ میں تمہاری دوستی پر اب بھی اندھا اعتماد کرتا ہوں۔"

وہ غرا کر بولا۔ "تو اس مت کرو۔ اگر اعتماد کرتے تو اسے چمپا کر نہ آتے۔ کہاں ہے وہ؟ وہ وہ جھجکتی ہے" مجھے بند کر کے جانے گی تو میں نکل نہیں سکوں گا۔ اس کا بیچھا نہیں کر سکوں گا۔ آخر وہ بھاگ کر کہاں جائے گی؟ کیا سمندر میں ڈوب کر مرے گی؟"

ڈاکٹر جان بختہ نے آگے بڑھ کر اس کے شانے کو چھوتے ہوئے کہا۔ "ذرا تحمل سے" ذرا آرام سے" انہیں مسٹر مراد اندر آ جائیں۔ ہم سہولت سے بات کریں گے۔"

مراد نے ڈاکٹر کا ہاتھ اپنے شانے پر سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ "وہ سہولت سے کیا بات کر سکتا ہے جس کی بیوی گھر سے بھاگ گئی ہو؟"

"یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"کیا غلط کہہ رہا ہوں؟ کیا مونا میری بیوی نہیں ہے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ تمہاری کوئی نہیں ہے۔"

"اور ڈاکٹر! تم بھی اچھی طرح جانتے ہو" یہاں کے قانون کے مطابق وہ میری بیوی ہے۔ ہاں میری بیوی ہے۔ اس سلسلے میں کوئی مجھے چیلنج نہیں کر سکتا۔ کیوں کامران تم کر سکتے ہو؟"

"مراد! دوستی میں کبھی ایک دوسرے کو چیلنج نہیں کیا جاتا۔ میں دوست کی حیثیت سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"میں بھی دوست کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ میں نے تمہارے لیے بے شمار

قرابتیں دی ہیں۔ جب بھی تمہیں میری ضرورت پیش آئی" میں ہر طرح تمہارے کام آیا۔ آج مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اگر مونا میری زندگی میں آ جائے تو شاید مجھے دواؤں کی ضرورت نہ پڑے۔ کیوں ڈاکٹر! کیا میں غلط کہتا ہوں؟"

"درست کہتے ہو" لیکن دوا حاصل کرنے کے لیے کسی کو جسمانی طور پر ہلاک کر ڈالنا یا اخلاقی طور پر بار ڈالنا انسانیت کے خلاف ہے۔ ایسی بات کرو جو انسانیت اور تہذیب کے عین مطابق ہو۔"

"کیا یہ بات تہذیب کے خلاف نہیں تھی کہ میں نے ایک دوست کی خاطر اپنے باپ دادا کے نام سے" اپنے خاندان سے" اپنی ذات برادری سے انحراف کیا۔ ان کی عظمتوں سے انکار کیا اور کامران مرتضیٰ کا اہم اختیار کیا۔ اس وقت آپ لوگوں نے مجھے تہذیب کے حتمی نہیں سمجھا۔ مونا جیسی عورت جو سہاگن تو ہے لیکن اس نے سہاگ کی ایک رات نہیں گزار دی۔ یہ شادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اس کی زندگی سے کامران نکل جائے اور میں اسے اپنا لوں تو کون سی خلاف تہذیب بات ہوگی۔ کیا صرف اس لیے کہ ایک بار اس کا نکاح کامران سے پڑھایا گیا ہے؟"

یہی سمجھ لو۔"

"یہ سمجھ بھی لوں تو دوسری بار وہ میری منکوحہ کہلاتی ہوگی یہاں پہنچی ہے" پھر تہذیب کہاں رہی۔ تم دونوں کس تہذیب کی باتیں کر رہے ہو؟"

کامران نے دھمکے لہجے میں کہا۔ "محبت اور جنگ میں کبھی خلاف قاعدہ اور کبھی خلاف تہذیب چلیں چلی جاتی ہیں۔ ہم نے بہت مجبور ہو کر تمہارا سہارا لیا۔ سہارا لینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ ہم نے مونا کو تمہاری منکوحہ بنا دیا ہے۔ ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ تم عورتوں سے نفرت کرتے کرتے اپنی جلدی مونا کی طرف مائل ہو جاؤ گے۔"

اس نے انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کامران! یہ تم ہو۔ یہ ڈاکٹر ہیں۔ تم دونوں نے مل کر میری زندگی میں ایک عورت کو لانے کی کوششیں کیں۔ تم دونوں نے لیڑا اور شہانہ کی سفارشیں کیں لیکن دل اسی پر آتا ہے جو دل کو بھاجاتی ہے۔"

اندرو اسے یہاں نہیں لاؤ گے تو میں اپنا بیوی کے اغوا ہونے کی رپورٹ درج کراؤں گا۔
ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو مراد؟ اس کا مطلب سمجھتے ہو۔ پولیس والے
مونہ کے پیچھے چڑ جائیں گے۔ اسے تلاش کریں گے۔ وہ مل جائے گی تو اس سے پوچھا جائے
گا اسے کس نے اغوا کیا تھا۔ وہ کس کے ساتھ تھی تھی۔ پھر اس کے بیان کے مطابق
کامران بھی قانون کی گرفت میں آئے گا۔“

”اسی لیے وقت سے پہلے سمجھا رہا ہوں“ اسے دو گھنٹے کے اندر لے آؤ۔ اگر
پولیس پیچھے چڑ پگتی تو وہ اغوا کالیں ہو گا۔ اگر مونہ نے بیان دے دیا کہ وہ اپنی مرضی سے
کامران کے ساتھ تھی تھی تو پھر یہ بھی بیان دے گی کہ وہ مجھ جیسے شوہر کے ساتھ رہنا پسند
نہیں کرتی۔ شاید مجھ سے طلاق لیتا چاہتی ہے۔ میں نے اگر طلاق دی تو اس ملک میں اس
کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہو گی۔ اسے یہاں سے واپس جانا ہو گا۔“

کامران دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر کہنے لگا۔ ”مراد! مجھے تم
سے ایسی توقع نہیں تھی۔ تم ہمیں مصیبتوں میں جلا کرنا چاہتے ہو۔ تمہیں کیا مل جائے گا؟
کیا مونہ مل جائے گی؟ ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم وہ ایسی عورت نہیں ہے۔ وہ اپنی جان دے
وے گی مگر تمہارا سایہ بھی اپنے آپ پر نہیں پڑے دے گی۔“

”تم مجھے خلیج کر رہے ہو اور غصہ دلا رہے ہو۔ میں اسے حاصل کر کے رہوں
گا۔“

ڈاکٹر ہنسنے کہہ۔ ”تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہارا دوست کامران کتنا بد نصیب ہے
اپنی بیوی کے ساتھ ساگ رات بھی گزار نہ سکا۔ وہ یہاں آئی تو یہ ہسپتال پہنچ گیا۔ آج
ہسپتال سے آیا ہے تو تم ایسی دیوار بن گئے ہو جسے یہ گرا نہیں سکتا۔“

”ڈاکٹر! تم صرف ڈاکٹر کی حیثیت سے بات کر دو۔ میں تمہارا مریض ہوں۔ تم اپنے
مریض کی مجبوریں کو سمجھو۔ مجھے ایک مونہ ملی ہے۔ کامران کو مونہ جیسی کئی لڑکیاں مل
سکتی ہیں۔ اگر میں ایسا کیا کر دوں تو آج میں لیزا یا شانہ میں سے کسی ایک کو اپنا چکا ہوتا
لیکن شینہ کے بعد ایک عرصہ گزر چکا ہے۔ اب مونہ پر دل آیا ہے۔ تم اچھی طرح سمجھتے
ہو، میرا علاج صرف مونہ ہے۔“

”اگر تم محبت کی بات کرتے ہو تو محبت کے حوالے سے ہی سمجھو۔ جسے میں نے
دل و جان سے چاہا اور جو مجھے دل و جان سے چاہتی ہے، وہ تمہیں بھی ویسی ہی محبت کیسے
دے سکتی ہے۔ اب رہ گئی میری دوستی کی بات تو دوست ہر طرح کی قربانی دیتے ہیں۔ اپنی
جان پر بھی کھیل جاتے ہیں لیکن اپنی گھر لیلہ عزت کا نہ تو سودا کرتے ہیں، نہ اسے جبراً کسی
دوست کے حوالے کرتے ہیں۔ یہ مونہ کے دل کا معاملہ ہے۔ اگر حالات ایسے ہوتے کہ وہ
مجھے پسند نہ کرتی، تمہیں پسند کر لیتی تو خدا کی قسم! میں اس سے دستبردار ہو جاتا لیکن مراد!
دل کے معاملات کو سمجھو۔ میں اپنا سب کچھ تم پر قربان کر سکتا ہوں، تمہاری خاطر مونہ کا
دل نہیں پھیر سکتا۔“

”دل کے معاملات نے مجھے بڑا دھوکہ دیا۔ میں سمجھتا تھا، شینہ مجھے دل سے چاہتی
ہے۔ کسی اور کی طرف مائل نہیں ہو گی لیکن وہ میرے بھائی کے کاروبار کی طرف مائل
ہو گئی۔ اس نے دل کو نہیں دیکھا دولت کو دیکھا۔“

”مونہ ایسی نہیں ہے۔“

”تم کیا جانو؟ وہ کیسی ہے۔ رفتہ رفتہ عورت کے پر پڑے نکلتے ہیں۔ میں اسے اپنی
طرف مائل کر سکتا ہوں۔ دل کوئی چیز نہیں ہوتی۔ ہمارے مشرق میں ایسی بے شمار شائیاں
ہوتی ہیں، جہاں دل کے معاملات نہیں ہوتے۔ صرف ان دیکھے رشتے طے ہوتے ہیں۔
ہونے والے میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے ابھتی ہوتے ہیں لیکن شادی کے بعد
دونوں کے دل مل جاتے ہیں۔“

کامران نے کہہ۔ ”میں اتنا جانتا ہوں، ایک تما کزور عورت کو پردیس میں بلا کر
پریشان نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے راستے سے اسے ہٹانا اور اپنی طرف مائل کرنا سراسر
زیادتی ہے۔“

”زیادہ باتیں نہ بتاؤ۔ صاف طور سے آخری بات کہہ دو کہ دوست کی خاطر مونہ
سے دستبردار نہیں ہو سکتے۔ تم میں عرف نہیں ہے۔ تم دوستی بھجنا نہیں جانتے۔“

”یہی سمجھ لو۔“

”پھر تم بھی سمجھ لو، مونہ کو مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکو گے۔ اگر دو گھنٹے کے

”علاج میں کرتا ہوں“ دو آئین میں تجویز کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تمہارے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نقصان دہ ہے۔“

”مجھے صرف اتنا سمجھا دو کہ موتا میرے لیے نقصان دہ کس طرح ہے؟“

”وہ تمہاری طرف مائل نہیں ہے۔ یوں تمہارے دل پر دوسرا زخم لگے گا۔ ایک زخم ٹہینہ دے چکی ہے۔ موتا بھی تم سے محبت نہیں کرے گی۔ پھر تمہارے دل اور دماغ میں نفرت کے سوا کچھ نہیں ہو گا۔ اسی لیے کہتا تھا‘ جو لڑکیاں تم سے محبت کرتی ہیں‘ ان کی قدر کرو۔ ان میں سے کسی ایک کو اپنا لو مگر تم کل بھی بھنڈے تھے‘ آج بھی بھنڈے ہو اور ضدی مریض کا علاج بہت مشکل سے ہوتا ہے۔“

”تم بہت ہار چکے ہو تو کوئی بات نہیں ہے۔ تمہارے لیے مریض بہت ہیں۔ میرے لیے ڈاکٹروں کی کمی نہیں۔ کوئی دوسرا ماہر نفسیات میرے لیے نسخے میں موتا کو تجویز کرے گا۔“

کامران کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا۔ ”تم نہیں سمجھو گے۔ اپنی ضد پر قائم رہو گے۔ میں جا رہا ہوں۔ تم سے جو ہو سکے وہ کر لیٹا۔“

ڈاکٹر نے ہاتھ اٹھا کر اس کا راستہ روکے ہوئے کہا۔ ”غصہ“ تم جہاں بھی جاؤ گے‘ میں تمہیں اپنی گاڑی میں پہنچا دوں گا۔ پہلے تم یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ مراد تمہیں کتنی مصیبتوں میں مبتلا کر سکتا ہے۔ یہاں وہ اس کی قانونی پیروی ہے۔ تم اسے کہیں نہیں لے جا سکو گے۔“

”ڈاکٹر! ایک بات تم دونوں بھول رہے ہو۔ جب بے موت مرنا ہو تو بزدل مرتے ہیں جو مقابلے کا حوصلہ رکھتے ہیں“ وہ لڑتے لڑتے مرنا پسند کرتے ہیں۔ اگر ہم ڈوئیں گے تو مراد کو بھی لے ڈوئیں گے کیوں کہ مراد بھی ہمارے برابر مجرم ہے۔ اس نے یہاں کی حکومت کو دھوکا دیا ہے۔ موتا اس کی پیروی نہیں ہے۔ اس نے امیگریشن کے قوانین سے کھیلنے کے لیے اسے پیوی بنا کر پیش کیا ہے۔ میں پاکستانی نکاح نامے کے ذریعے اس کا فراڈ ثابت کر سکتا ہوں۔ اس طرح صرف میں اور موتا نہیں یہ بھی ہمارے آہنی سلاخوں کے پیچھے جائے گا۔“

مراد نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تم تو بڑے محب وطن بننے ہو۔ پاکستان کے گن گاتے ہو۔ لوگوں سے کہتے ہو‘ ہم غیر ممالک میں جا کر صرف ذمہ داری نہیں کھاتے بلکہ غیر سرکاری طور پر اپنے ملک کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ کیا نمائندگی اس طرح کی جاتی ہے کہ اپنی پیوی کو دوسرے کی پیوی بنا کر یہاں بلایا جائے۔ اگر یہ بات اخبارات میں شائع ہو گی تو تمہاری کتنی نیک نامی ہوگی۔ تم اخلاق سے گر کر اپنے ملک کی نمائندگی کرتے ہو؟“

”مراد! تم بھی پاکستانی ہو۔ پہلی غلطی میں نے کی۔ امیگریشن کے قانون کے خلاف اپنی پیوی کو یہاں بلایا۔ دوسری غلطی تم کر رہے ہو۔ تم پر اپنی پیوی کو اپنی پیوی کہہ رہے۔ کیا تم پاکستانی نہیں ہو؟ کیا تم اپنے ملک کی نمائندگی نہیں کرتے ہو۔“

”بے شک ہوں۔ اسی لیے تمہیں ڈھیل دے رہا ہوں۔ تمہیں موقع دے رہا ہوں۔ تم نے اپنی پیوی کو میری پیوی بنا کر جو غلطی کی ہے‘ اس غلطی کو درست کر لو۔ میری ہی پیوی رہنے دو۔ اس سے دستبردار ہو جاؤ۔ غلطی کون نہیں کرتا۔ ہر شخص کرتا ہے۔ ہر قوم کے‘ ہر ملک کے لوگ کرتے ہیں۔ ہم نے بھی کی ہے۔ ہماری غلطی اس صورت میں نظر انداز کی جا سکتی ہے کہ ہم اسے درست کر لیں۔ اس کا ایک ہی راستہ ہے۔ جو میں بتا رہا ہوں۔ یہاں برطانیہ کے قانون کے مطابق جب یہ طے پا گیا ہے کہ وہ میری پیوی ہے تو اسے میری پیوی رہنے دو۔“

”لیکن پاکستان کے قانون کے مطابق‘ مذہب کے مطابق‘ شرعی طور پر وہ میری پیوی ہے۔ میری پیوی رہے گی اور تمہیں تسلیم کرنا چاہیے‘ کیوں کہ تم بھی مسلمان ہو۔“

”فضول بحث سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں آخری بات کہتا ہوں۔ جس ملک میں ہو‘ اسی ملک کے قانون کی بات کرو۔ بڑے سے بڑا مقدمہ ہو یا چھوٹے سے چھوٹا مسئلہ ہو اسے یہاں کے قانون کے مطابق طے ہونا چاہیے اور ہمارا مسئلہ یہیں کے قانون کے مطابق طے ہو گا۔“

”میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم اپنی ضد سے باز نہیں آؤ گے۔“

7 ضد تم کر رہے ہو۔ میں نے جو مصلحت دی ہے‘ اس کے مطابق اسے میرے پاس پہنچا دو‘ ورنہ قانون کے محافظ اسے ڈھونڈ نکالیں گے اور میرے پاس لے آئیں گے۔“

”ایک دوست پر بھروسہ کر کے اپنی بیوی کے نام کو اس سے منسوب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس کی عزت کو بھی منسوب کر دیا گیا ہے۔ کوئی اپنی خوشی سے اپنی عزت کسی کے حوالے نہیں کرتا۔ اگر مونا کو تمہارے سامنے سے بچانے کے لیے مجھے جان پر کھیلنا پڑے تو میں کھیل جاؤں گا۔ قانون سے تو ہم کھیل ہی رہے ہیں۔ اس کے لیے مجھے اپنی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا تو میں مونا کے ساتھ جاؤں گا لیکن تمہاری دوستی پر تھوکتا رہوں گا۔“

یہ کہتے ہوئے وہ جانے لگا۔ مراد نے کہا۔ ”ایک بات سن لو۔ میری دی ہوئی ملت کے مطابق وہ مجھے نہ ملی تو کل صبح کے اخبارات ہم تینوں کے فریڈی داستان سنائیں گے۔ میں بھی سزا پاؤں گا لیکن آج تیرے گھنے کے بعد سے تم دونوں کو کبھی ایک جگہ رہنے نہیں رہنے دوں گا۔ کبھی ایک ساتھ نہیں رہنے دوں گا۔ جاؤ اور اس لمحہ سے میری دشمنی کو آزمائو۔“

وہ باہر آگیا۔ اسے تھکن محسوس ہو رہی تھی۔ ایک آدھ زخم سے ہلکی ہلکی ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ پھر بھی وہ غصے میں تھا۔ زندگی میں پہلی بار دوستی کا زخم کھاکر دوست کے گھر سے نکل رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کیا کرے۔ مونا کی حفاظت کس طرح کرے؟ اس نے غصے میں مراد کا چیلنج قبول کیا تھا لیکن سمجھ رہا تھا۔ ”آئندہ مونا کے ساتھ ایک منٹ بھی کہیں سکون سے نہیں گزار سکے گا۔“

وہ باہر آکر ایک گلی ناراستے سے آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔ ایک ہی بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ مونا کو ایسی جگہ چھپا کر رکھے جہاں مراد کی رپورٹنگ کے مطابق پولیس والے نہ پہنچ سکیں اور مونا محفوظ رہے۔ وہ مٹی اٹھانے کی بات تو مراد کبھی یہ ثابت نہیں کر سکے گا کہ کامران نے مونا کو اغوا کیا ہے۔

ڈاکٹر ہنری گاڈی اس کے قریب آکر رک گئی۔ وہ کھڑکی سے جھانکتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تم سے کہا تھا اس حالت میں ہپڈل نہ چلانا۔ میں تمہیں پچھادوں گا۔ چلو آؤ۔“ وہ اعلیٰ سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر نے گاڈی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم اپنے لئے مسائل خود پیدا کرتے ہیں۔ میں مانتا ہوں مسائل حالات کے تحت بھی پیدا

وٹے ہیں لیکن اس میں ہماری تمہاری ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں۔ جیسا کہ اب مونا کے لمبے میں ہو رہا ہے۔ تم دونوں ہی دوست اسے یہاں بلائے اور مسائل پیدا کرنے کے لیے دار ہو۔“

”ڈاکٹر! پلیز اسے دوست نہ کہو۔“

”میں دشمن بھی نہیں کہہ سکتا۔ تم دونوں ایک ہی ملک سے تعلق رکھتے ہو۔ ہمارے ملک کے قانون سے کھیلنے کھیلنے آپس میں دشمنی کر بیٹھے۔“

کامران خاموش رہا۔ وہ جواب کیا کہہ سکتا تھا جبکہ حقیقتاً ہی وہ ہاتھ ڈاکٹر نے کہا۔ ”اس لیے ہمارا ملک ایگریشن کے قوانین میں بڑا سخت ہے۔ لوگ قریب دیتے ہیں۔ طرح طرح کے چور راستے اختیار کر کے یہاں آتے ہیں۔“

”سوال یہ ہے کہ لوگ چور راستے کیوں اختیار کرتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ سیدھا راستہ نہیں ملتا۔ سیدھے راستے پر جب بھی پہرے بٹھائے جائیں گے، آدمی نقب لگائے گا۔ یا پھر چور راستے اختیار کرے گا۔ ڈاکٹر! جس وقت کوئی ڈوب رہا ہو تو صحت کام نہیں آتی۔ عمل کام آتا ہے۔ ہاتھ بڑھا کر اسے سارا دے کر ڈوبنے سے بچانا چاہیے۔ کیا تم کسی طرح ہمیں بچا سکتے ہو؟“

”ایک ہی راستہ ہے۔ قانون کے محافظوں کے سامنے اپنی غلطیوں کا اعتراف کر لیا جائے۔ مونا کسی وکیل کی خدمات حاصل کر کے تحریری بیان دے سکتی ہے کہ وہ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر آئی تھی۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ اس لیے واپس جانا چاہتی ہے۔“

”ہو سکتا ہے اسے یہاں کا قانون معاف کر دے اور اسے واپس بھیج دے لیکن یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے اسے حراست میں لیا جائے گا۔“

”میں اس کی طرف سے ضمانت قتل از گرفتاری پیش کروں گا۔“

”اس طرح یہ بات پریس تک پہنچے گی۔ اخبارات کے ذریعے عام ہو گی۔ ہم اس ملک میں بھی بدنام ہوں گے اور ہمارے ملک کے لوگ بھی ہمیں معاف نہیں کریں گے۔“

”پھر تو کوئی صورت نہیں ہے۔ یہ مت سوچو کہ موناکو چھپاتے بھڑگے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ جب مراد اس کے خلاف رپورٹ درج کرائے گا تو پولیس والے یقیناً اسے تلاش کرتے ہوئے عورتوں کے ہوٹلوں میں پتھریں گے وہاں موناکو پائیں گے۔“
وہ ہوشل پہنچ گئے۔ وہاں ایک ملاقاتی کرے میں موناکو سے ملنے آئی۔ کامران نے اسے مراد کے متعلق بتایا۔ اس کا پہنچنے سننے کے بعد موناکو نے کہا۔ ”یوں لگتا ہے ہم نے شادی نہیں کی، بہت بڑی غلطی کی ہے جس کی سزا ہمیں مستقل رمل رہی ہے۔“
ڈاکٹر نے کہا۔ ”ہمارے ملک کے قانون سے کھیل کر تو واقعی غلطی کی ہے۔“
کامران نے کہا۔ ”جسٹ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ ہمیں فوراً ہی کسی نتیجے پر پہنچنا چاہیے۔“

”میں خود کو گرفتاری کے لیے پیش کروں گی لیکن اس کو خوش ہونے کا موقع بالکل نہیں دوں گی۔“
ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں نے کامران کو یہی مشورہ دیا ہے۔ تم یہاں قانون کے محافظوں کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرو۔ ایک وکیل کی خدمات حاصل کرو۔ میں تمہیں گرفتار ہونے نہیں دوں گا۔ اس سے پہلے ہی ضمانت پیش کروں گا۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔“
کامران نے کہا۔ ”میں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہتا جس سے ہمارے ملک کی اور ہماری بدنامی ہو۔ ایک سیدھی سی بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ موناکو یہاں سے فوراً واپس بھیج دوں۔“

وہ بے اختیار نہیں نہیں کے انداز میں سر ہلا کر بولی۔ ”میں واپس نہیں جاؤں گی۔ بڑی مشکلوں سے تمہارے قریب آئی ہوں۔ کیا پھر مجھے سات سمندر پار بھیج دو گے۔ کیا میرے نصیب میں یہی جدائیاں لکھی ہیں۔ کیا اسی لیے میں نے شادی کی تھی؟“

”تم پہلی عورت نہیں ہو جو اپنے شوہر سے بچھڑ رہی ہو۔ لندن میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے میاں بیوی ہیں جو ہر سار پرک سے بچھڑے ہوئے ہیں۔ بے چارہ میاں ادھر پاکستان رہتا ہے، بیوی ادھر ملنے کے سنے دیکھتی رہتی ہے۔ سال میں ایک بار عید آتی ہے۔ بیوی کی زندگی میں دو سال، چار سال، جانے کتنے سالوں بعد میاں کی صورت میں عید کی

فوشیاں ملتی ہیں۔ شوہر کو چھٹی ملتی ہے۔ فرصت ملتی ہے یا اتنی رقم جمع ہوتی ہے تو وہ اپنے وطن جا کر اپنی بیوی سے ملاقات کر سکتا ہے۔ پھر بچے ہوتے ہیں تو اور مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ ان بچوں کو اپنے ملک میں مل کا سایہ تو ملتا ہے مگر باپ کا سایہ نصیب نہیں ہو کہ وہ بیٹھ پر دسکی باپ کے متعلق سننے میں مگراے دیکھتے بہت کم ہیں۔“
کامران نے کہا۔ ”دینا کے تمام میاں بیوی اپنے اپنے مسئلے کا شکار ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے مسئلے پر گفتگو کرنی چاہیے۔“

موناکو نے کہا۔ ”جب اپنے پاؤں میں کانٹا جھپتا ہے، تو احساس ہوتا ہے کہ دوسرے کتنی اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ ہماری تو ابھی ابتدا ہے۔ دوسرے نہ جانے کتنی اتنا کو پہنچ رہے ہیں۔ مجھے ہوٹل میں آکر معلوم ہوا ہے۔ اس شہر میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی بیوی کو یہاں بلانے کے انتظار میں پوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بالکل مایوس ہو چکے ہیں اور اب گمراہ ہوتے جا رہے ہیں۔ یہاں غم غلط کرنے کے لیے شراب ہے۔ دل بھلانے کے لیے طرح طرح کے کلب ہیں۔ راست چلنے لڑکیاں مل جاتی ہیں۔ کیا میں یہ پسند کروں گی کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ۔“

کامران نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ آنکھیں کھ رہی تھیں۔ جن عورتوں کے شوہر ہاتھوں سے نکل چکے ہیں، ان سے چارویں کے دلوں پر کیا گزر رہی ہو گی؟ ان کا دکھ میرا دکھ ہے۔ ان کی آنکھوں میں انتظار کا جو کرب ہے، وہ میرا کرب ہے۔ وہ پریشان ہو کر بولی۔ ”میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ ماناکو غیر قانونی طور پر آئی ہوں لیکن یہاں رہ کر تمہیں اپنی نگاہوں میں رکھ سکوں گی۔ تمہیں بھٹکنے نہیں دوں گی۔ میں کبھی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔“

”دوسروں کی گمراہی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بھی تمہیں بھول جاؤں گا۔ میں ایسا نہیں ہوں۔“

”دوسروں نے جب اپنی عورتوں سے شادی کی تو وہ بھی ایسے نہیں ہوں گے۔ وہ اپنی بیویوں سے محبت کرنے والے شوہر ہوں گے۔ یہاں ہزاروں میل کی دوری نے، بھوری نے اور حالات نے انہیں بھٹکا دیا۔ میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہونے دوں گی۔“

پھر اس نے ڈاکٹر سے پوچھ ل ”مراد آپ کا مریض ہے۔ کیا آپ اسے کچھ عرصے تک قابو میں نہیں رکھ سکتے؟“
”میں ایسا کر سکتا ہوں لیکن وہ جب بھی تم دونوں کو ایک ساتھ دیکھے گا تو رقابت کی آگ میں جلتے لگے گا۔“

”یوں بھی تقدیر اور حالات مجھے میرے شوہر سے جدا کرتے آرہے ہیں۔ مراد بھی یہی چاہتا ہے تو کچھ عرصہ ان سے الگ رہوں گی۔ ہمیں ہوسٹل میں رہوں گی۔ ان سے نہیں ملوں گی۔ کیا مراد ایسی صورت میں مجھے سکون سے رہنے دے گا۔“
”ایسی صورت میں ممکن ہے لیکن تم کچھ عرصہ تنہا رہ کر کیا کرو گی؟“

”مجھے جتنا بھی وقت ملے گا‘ ہفتے‘ مہینے‘ سال‘ دو سال یہاں تنہا رہوں گی۔ کوئی ملازمت کرں گی۔ پھر اخبارات کے ذریعے ان ہزاروں مظلوم عورتوں کی حمایت میں آواز اٹھاؤں گی جو اپنے شوہروں سے چھڑی ہوئی ہیں اور ان کے انتظار میں اپنے اپنے ملکوں میں رہ کر بے روزگی ہوئی جا رہی ہیں۔ میں وہاں ہسپتال میں ملازمت کرتی رہی تھی۔ کیا آپ کے ذریعے یہاں ہسپتال میں ایک نرس کی حیثیت سے ملازمت مل سکتی ہے؟“
”مل جائے گی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔“

”پر دس میں ایک تو مراد آپ کے قابو میں رہے اور آپ کے ذریعے مجھے ملازمت مل جائے تو اس سے بڑا احسان کیا ہو سکتا ہے؟ میں یہ احسانات کبھی نہیں بھولوں گی۔“
ڈاکٹر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر کامران! میں باہر انتظار کر رہا ہوں۔“
وہ کمرے سے چلا گیا۔ کامران نے مونا کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھ ل ”تم یہاں تنہا رہو گی۔ میں تمہارے بغیر کیسے رہ سکتا ہوں؟“

”کیا میرا سوال ہے؟ میں تمہارے بغیر کیسے رہ سکتی ہوں لیکن حالات نے ہمیں مجبوری اور بے بسی کی زندگی گزارنا سکھا دیا ہے۔ ہم یونہی گزاریں گے۔“
”یہ تو بڑی مشکل ہے۔ میں تم سے ملنے آؤں گا اور مراد کو مظلوم ہو گا تو وہ انتہائی کارروائی کرے گا۔“

”میں تم سے اسلحا کرتی ہوں‘ میاں نہ آئے ہم ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کر لیں

گے لیکن ایک دوسرے کے سامنے نہیں آئیں گے۔ میں نے اپنے دل کو پتھر بنا لیا ہے۔ میں وہ بد نصیب ہوں جو اپنی زبان سے اپنے شوہر کو آنے سے منع کر رہی ہوں۔ اسے ملنے سے روک رہی ہوں۔“

اس کی آنکھیں پینچنے لگیں۔ پہلے وہ ایسی باتوں پر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی۔ اب اس حد تک صبر آگیا تھا کہ بے اختیار آنسو نہیں بہتے تھے۔ آنسوؤں کو ضبط کرنا‘ دل کو مضبوط کرنا آگیا تھا۔

وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے تھے۔ اب تک تقدیر نے اتنی رعایت کی تھی کہ انہیں ایک دوسرے کے ہاتھوں کو تھامنے کا موقع دیتی رہی تھی۔ آج کے بعد یہ موقع بھی ہاتھ سے جا رہا تھا۔ اب شاید کامران اسے دور سے دیکھ سکے گا اور اگر دشمن بننے والے دوست نے اس کا بھی موقع نہ دیا تو شاید مونا کو صرف سن سکے گا۔ صرف فون کے ذریعے۔

وہ دل پر پتھر رکھ کر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ مونا کا دل اس وقت خوب رونے کو چاہتا تھا لیکن وہ اپنے دل کو سمجھا رہی تھی۔ آج تک رو کر کیا ملا جواب ملے گا۔ وہ آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کے چند قطرہوں کو آنچل سے پونچھتے ہوئے اپنے ہوسٹل کے کمرے میں آئی۔ اس کمرے کے چار گوشوں میں چار پتنگ بچے ہوئے تھے۔ مونا کے علاوہ وہاں تین اور ایشیائی عورتیں تھیں۔ انگریز عورتیں شاید اس لیے نہیں تھیں کہ مزاج نہیں ملتے ہوں گے۔ کچھ کمرہ میں یورپی ممالک کی عورتیں تھیں۔ مزنا کی ہم ملیں عورتوں میں سے ایک کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا۔ اس کا نام ملی بانو تھا۔ ملی بانو کی شادی ڈیڑھ برس پہلے ہوئی تھی۔ تب سے اس کا شوہر اسے یہاں بلانے کے سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ درخواستیں دے رہا تھا۔ اپنے سفارت خانے کے ذریعے پھر پور کو شش کر رہا تھا لیکن ملن کا کوئی وسیلہ نہیں تھا۔ ملی بانو اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں دو بار ہائبرڈرپ کے بہانے یہاں آ چکی تھی۔ وہ ہفتے دو ہفتے کے لیے آتی۔ اپنے شوہر کے ساتھ کچھ دن رہتی‘ پھر جلی جاتی تھی۔ اب وہ تیسری بار آئی تھی اور اچانک آئی تھی۔ کسی نے یہی خبر سنائی تھی کہ اس کے شوہر نے ملن میں کسی دوسری عورت سے

شادی کر لی ہے۔ وہ چپ چاپ اس بات کی تصدیق کرنے آئی تھی۔ اس لیے ہوشل میں آکر ٹھہری ہوئی تھی۔

لی بانو کے علاوہ اس کمرے میں دو ہندوستانی عورتیں تھیں۔ ایک کا تعلق مدراس سے اور دوسری کا دہلی سے تھا۔ دہلی والی مسز تارا پرشاد کلماتی تھی۔ اس کے بچے کا نام جاگی پرشاد تھا۔ اس کی شادی کو تقریباً تین برس گزر چکے تھے۔ جاگی پرشاد اولاد کی طرف سے مایوس ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ ہندوستان جاتا اور لٹا سے ملتا تو یہی کہتے ہم دونوں میں سے کوئی بانیجہ ہے، اسی لیے اولاد نہیں ہو رہی ہے۔ کبھی تارا لندن آئی تھی اور اسے یقین دلاتی تھی کہ بھگوان نے چاہا تو ضرور اس کی گود ہری ہوگی۔

بچی باری تارا پرشاد جب اپنے بچے سے مل کر ہندوستان واپس گئی تو دو ماہ بعد پتا چلا اس کے پاؤں بھاری ہیں اور وہ ماں بننے والی ہے۔ اس نے فوراً ہی خط کے ذریعے خوشخبری اپنے بچے کو سنائی۔ لندن سے جاگی پرشاد نے خت لیے جسے لکھا۔

”تم مجھے بے وقوف بنانا چاہتی ہو۔ میاں آئی تھیں تو کچھ نہیں تھا۔ دو مہینے کے بعد تم ماں کیسے بن رہی ہو۔ دوسرے کا پاپ میرے سر تعویث چاہتی ہو؟“

یہ تارا پرانا بڑا الزام تھا جسے وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اپنی صفائی پیش کرنے لگئی تھی۔ اپنے بچے سے ملاقات کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے اپنی رہائش بدل دی تھی۔ ملاقات نہیں ہو رہی تھی۔ بے چاری کو ہوشل میں قیام کرنا پڑا تھا۔

مدراس والی مسز کلکتا پانڈے کلماتی تھی۔ وہ اس کمرے میں ’مونا‘ لی بانو اور تارا پرشاد کے مقابلے میں عمر رسیدہ تھی۔ ان سب سے زیادہ ذہن اور تجربہ کار تھی۔ اس نے انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا تھا۔ وہاں کے ایک انگریزی اخبار کی مستقل کالم نویس تھی۔ ان تین عورتوں کو حوصلہ دیتی تھی۔ ”ہمت ہارنے سے کبھی منزل نہیں ملتی۔ میں امیگریشن کے خت قوانین کے خلاف جنگ کر رہی ہوں۔ اس جنگ میں تمنا نہیں ہوں۔ ہزاروں ہندو مسلمان، سکھ، عیسائی عورتیں جو ایشیا سے تعلق رکھتی ہیں، وہ سب میرے ساتھ ہیں۔ مونا آج سے تم بھی میرے ساتھ ہو۔“

کلکتا سے ملنے کے بعد ہی مونا میں حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ اسی لیے اس نے ڈاکٹر جان

پنٹر سے اور کامران سے کہا تھا کہ وہ کچھ عرصے تک ہوشل میں رہے گی اور شوہر سے بچھڑ کر رہنے والی عورتوں کی حمایت میں آواز اٹھاتی رہے گی۔

کلکتا کے بچے کا نام ریش پانڈے تھا۔ وہ ایک اچھا کاروباری تھا لیکن بدکردار تھا۔ کلکتا جب بھی میاں آئی تو پانڈے اپنی حرکتوں سے باز آ جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا اس کی بیوی سختی تیز طرار ہے۔ اخبارات میں اس کا نام اچھالے گی۔ وہ دیکھتا رہتا تھا اور اس کے کالم پڑھتا رہتا تھا۔ اس جیسے کتنے ہی پانڈوں کے خلاف وہ خت الفاظ لکھتی رہتی تھی۔

کلکتا نے چند کافزات مونا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت ہی عمدہ لکھ رہی ہو۔ اگر تمہاری تحریر کے یہی تیور رہے تو امیگریشن کے موضوع پر تھلک مچا دو گی لیکن ایک آدھ مضمون لکھنے سے کام نہیں چلے گا۔ اگر مسلسل لکھنے کا عزم کرو اور اخبارات میں شائع ہوتی رہو تو یقیناً ہمارے شمارے دل کی بات عوام سے لے کر حکام تک پہنچے گی۔“

مونا نے وہ کافزات لیے۔ پھر کلکتا کا ہاتھ محبت سے تھام کر کہا۔ ”دیدہ! تم میری حوصلہ افزائی کر رہی ہو۔ میں ضرور کھسوں گی اور لکھتی رہوں گی۔ دعا کرو کہ مجھے میاں کچھ عرصے تک رہنے کا موقع مل جائے۔“

کلکتا اور دوسری عورتوں نے کہا۔ ”ہم سب تمہارے لیے فائٹ کریں گے۔ کون ہے وہ رضا مراد؟ ذرا ہمارے سامنے آئے۔ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔“

اسی وقت ہوشل کی ایک ملازمہ نے آکر کہا۔ ”مسز مونا کامران؟ تمہارے کامران مرتضیٰ ملے آئے ہیں۔“

مونا خوش ہو گئی کہ اس سے رخصت ہو کر جانے والا وہ نہ سبک پھر اس سے ملنے آ گیا ہے۔ ملازمہ نے کہا۔ ”لیکن عجب بات ہے۔ پہلے جو کامران مرتضیٰ آئے تھے وہ کوئی اور تھے اور یہ صاحب بھی آپ کے شوہر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ آخر بات کیا ہے؟ اس سے پہلے کہ آپ ایک ہی نام کے کسی دوسرے شوہر سے ملے جائیں، ہوشل کا انچارج آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتی ہیں۔“

کلکتا نے کہا۔ ”میں سمجھ گئی، یہ رضا مراد ہو گا۔ تم فکر نہ کرو۔ مراد سے ملے جاؤ۔ ہم عورتیں ہوشل کے انچارج سے ملے جا رہی ہیں۔ ہم تمہاری طرف سے صفائی

پیش کریں گے۔

مونا ملاقات کے کمرے میں آئی۔ اسے دیکھتے ہی مراد زہریلے انداز میں مسکرائے لگہ وہ جواباً بڑی معصومیت بڑی محبت سے مسکرائے لگی۔ وہ ایک دم سے پھر کر کھڑا ہو گیا۔ مٹھیاں بھیج کر کہنے لگہ ”تم مجھے ابو بتا رہی ہو۔ اس طرح مسکراؤ گی تو کیا میں بھول جاؤں گا کہ تم نے مجھے میرے ہی گھر میں لاک کر دیا تھا۔“

مونانے کہہ ”وٹمن کو ہتھیار سے بارود تو وہ فوراً مر جاتا ہے۔ اس کی حالت زار پر مسکراؤ تو وہ جھٹلا کر دھیرے دھیرے مرتا ہے۔ اگر تم دھیرے دھیرے مرتا نہیں چاہتے ہو تو میری مسکراہٹ کو ایک دوست کی نظر سے دیکھو۔“

”کیا اس رات تم نے دوستی کی تھی؟“

”میں دو راتیں تمہارے گھر میں رہ چکی ہوں۔ وہاں تمہارے ارادے کیا تھے تمہاری نیت کیا تھی؟ یہ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو۔ جو کچھ میں نے کیا وہ مناسب تھا۔ مراد تمہیں میرا احسان ماننا چاہیے۔ میں نے ان راتوں میں تمہیں شیطان بننے سے باز رکھا اور تمہیں انسان بنانے رکھا۔“

”میرا نام مراد نہیں کامران ہے۔“

”کیا تمہارے سینے میں کامران کا دل ہے۔ کیا تمہارے دماغ میں محبت کی وہ اعلیٰ ترقی ہے جو مجھے تغیر کر لیتی ہے۔“

”ہاں ہے۔ تم مجھے آزما کر دیکھو۔“

”میں تو آزما رہی ہوں۔ تم نے مجھے نہیں آزمایا ہے۔“

”تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں تمہیں کس طرح آزما سکتا ہوں۔“

”اس طرح کہ ہم دشمن کی بجائے دوست بن کر رہیں۔“

”وہ کس طرح؟“

”مجھے یہاں ہوشل میں رہنے دو۔ یہ خیال دل سے نکال دو کہ تم زور زبردستی کرو گے۔ مجھے اپنی بیوی ثابت کرنے کی کوشش کرو گے تو میں گھبرا جاؤں گی۔ میں یہاں سے واپس چلی جاؤں گی۔ اپنے کامران سے نہیں ملوں گی لیکن تمہارے ہاتھ کبھی نہیں آؤں

کی۔ میں کتنے مضبوط اعصاب کی عورت ہوں، یہ تم بچھلی دو راتوں میں آنا چکے ہو۔ آرام سے بیٹو اور فیصلہ کرو، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

وہ بیٹھے ہوئے بولا۔ ”کیا کرنا چاہیے؟“

”یہی کہ ہم میاں بہن ایک ہو جائیں اور ہمارے ایک ہونے کا سرا تمہارے سر بندھے۔“

”مجھے ایسا سرا باندھنے کا شوق نہیں ہے۔“

”دوسری صورت میں ہم صرف دوست بن کر رہ سکتے ہیں۔“

وہ ذرا خوش ہو گیا۔ ”میں دوست بننے اور بنانے آیا ہوں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اسے بھول جاؤ۔“

”میں بھول چکی ہوں۔ ہم نئے سرے سے یہاں زندگی گزاریں گے لیکن صرف دوست کی حیثیت سے۔“

”مجھے منظور ہے لیکن ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ہمارے درمیان کامران نہیں آئے گا۔“

”تو پھر تم بھی میرے اور کامران کے درمیان نہیں آؤ گے۔ تم اس پر پابندی عائد کرو گے، میں تم پر پابندی عائد کروں گی۔ دوستی کرنا چاہتے ہو تو ہم تینوں کے درمیان ہو گی۔“

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگہ پھر بولا۔ ”میں ایسی دوستی نہیں کرنا چاہتا جس کی آؤ میں تم کامران سے مل سکوں۔ میں نادان نہیں ہوں۔ تم مجھ سے دوست کے بناتے ہو گی اور اس سے بیوی کے بناتے۔ وہ شوہر ہو گا۔ میں کٹھ پتلا بن کر رہ جاؤں گا۔“

”ہم تینوں ایک دوسرے کی موجودگی میں ملا کریں گے۔ پھر تو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔“

”کامران کی موجودگی میں مجھ سے ملو گی تو تمہارا دل ادھر لگا رہے گا۔ مجھ سے صحیح طرح بات نہیں کرو گی۔ پوری توجہ نہیں دے سکو گی۔ میں جو کہوں گا اس بات کو ہوں

ہاں کہہ کر باقی رہو گی۔"

"میں اپنی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد ایک محنت ہمارے ساتھ تفریح کے لیے چلوں گی اور ایک محنت اس کے ہاتھ۔ اس طرح تم تنہائی میں مجھ سے جی بھر کر باتیں کر سکو گے۔ ہمارے درمیان کوئی تیرا نہیں رہے گا۔ اس طرح میں کامران سے تنہائی میں باتیں کروں گی۔ وہاں درمیان کوئی تیرا نہیں رہے گا۔ تم سمجھو کہ کرنا چاہتے ہو تو بات ہے گی، ورنہ میں اپنی بات پر قائم ہوں۔ یہاں سے چلی جاؤں گی اور تم مجھے روک نہیں سکو گے۔"

وہ پھر اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ واقعی وہ خدی ہے۔ وہ ضد کرے گا تو کبھی ہاتھ نہیں آئے۔ یہ محبت سے قائل کرے گا تو شاید کلیا پلٹ جائے۔ عورت کا دل پھرنے میں دیر نہیں لگتی۔ وہ پھر جائے گی۔ ویسے بھی مجھے مرہم کی ضرورت ہے۔ شینے نے جو زخم لگایا ہے، اسے مانا بھر سکتی ہے۔ یہ یونی ہے، دوست بن کر رہی رہے تو اطمینان رہے گا کہ یہ میری نہیں ہے تو کسی کی بھی نہیں ہے۔ شینے بے لگام ہو گئی تھی۔ موتا کی لگام میرے ہاتھ میں ہے۔ یہ مجھے دھوکا نہیں دے سکے گی۔ میں اسے موقع ہی نہیں دوں گا۔

مراد نے خوب سوچنے اور سمجھنے کے بعد کہا۔ "مجھے منظور ہے لیکن چند شرائط ہیں۔ پہلی شرط یہ کہ تم کامران سے..... صرف دوست بن کر ملو گی۔ دوسری یہ کہ صرف دن کے وقت ملو گی اور یہ کہ کسی چار دیواری میں نہیں کھلی جگہ ملو گی جتنا وقت مجھے دو گی، اتنا ہی وقت اسے دو گی، اس سے زیادہ ملو گی اور میری شرائط کے خلاف عمل کرو گی تو میں دوست نہیں رہوں گا۔"

"مجھے تمہاری تمام شرائط منظور ہیں۔"

اس نے حیرانی سے پہلے موتا کو دیکھ کر پھر پوچھا "تجربہ ہے۔ تم کامران سے دور رہو گی تم نے میری شرائط پر ذرا بھی اعتراض نہیں کیا۔ بخوشی منظور کر رہی ہو۔"

"بڑی مشکل ہے خوشی سے کوئی بات منظور کرو تب بھی حیرانی ہوتی ہے۔"

"شاید تم سوچ رہی ہو، یہاں کچھ عرصہ اسی طرح رہ کر کسی وکیل کی خدمات حاصل

کر کے ایسا کوئی قانونی نکتہ نکال لو جس کے ذریعے مجھ سے نجات مل جائے۔"

"میں تمہارے سوچنے کے انداز کو بدل نہیں سکتی۔ اتنا سمجھا سکتی ہوں کہ تمہاری موجودہ سوچ ایک دلدل ہے جتنا میرے خلاف سوچتے جاؤ گے اتنا ہی دھننے چلے جاؤ گے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ "اچھی بات ہے۔ ہمارے معاملات طے پا گئے ہیں۔ اس کی رو سے تم ابھی میرے ساتھ تفریح کے لئے چل سکتی ہو۔ ایک محنت میرے ساتھ گزار سکتی ہو۔"

"آج معاملات طے پائے ہیں۔ ابھی تو میں ٹائم ٹیبل بناؤں گی۔ تم آج شام فون کے ذریعے کل ملاقات کا وقت معلوم کر لیتا۔"

وہ چپک کر بولا۔ "اودھ میں تو ٹیلی فون والی بات بھول ہی گیا تھا۔ کامران تم سے ٹیلی فون کے ذریعے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ جانے تم دونوں کتنی کتنی دیر تک باتیں کرتے رہو اور مجھے خبر نہ ہو۔"

وہ بڑی تکی سے مسمرا تے ہوئے بولی۔ "مجھے تم پر ترس آتا ہے اس طرح سوچتے سوچتے تیار پڑ جاؤ گے۔ آخر مجھے کہاں کہاں روکو گے، فون کرنے سے نہیں روک سکو گے۔ تم کتنے پہرے بٹھاؤ گے، کہاں کہاں پابندیاں عائد کرو گے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اپنی وفاقی اور جسمانی صحت کا خیال رکھو اور اتنی ہی پابندیاں عائد کرو، جہاں تک تمہارا بس چلتا ہے۔ اس سے آگے سوچنے کو چیلے کر دیتے ہوئے زندگی گزارو گے..... یاد رکھو اگر میں یہاں سے جانے پر مجبور ہو گئی تو صرف کامران ہی نہیں تم بھی میرے لئے ترپے رہو گے۔ اس وقت سمجھ میں آئے گا کہ جو چیز نگاہوں میں تھی۔ نگاہوں میں ہی رہتی۔ بیشک کے لئے دور دیں جا کر اوجھل تو نہ ہو جاتی۔"

اس وقت گفتگو، لالی بانو، لانا پر شاہ اور ہوشل کی انچارج وہاں آگئیں۔ انچارج نے کہا "مسٹر کامران! میں نہیں جانتی کہ تمہارا نام کامران ہے بھی یا نہیں لیکن مسز گفتگو پائے اور ان عورتوں کے بیانات سے ہچا رہا ہے، تم فراڈ پریٹنڈ ہو۔ میں چاہوں تو تمہارے خلاف پولیس میں رپورٹ درج کرا سکتی ہوں۔ اتنا فراڈ کرنے پر تمہیں جیل ہو سکتی ہے۔ تمہاری شہرت منسوخ ہو سکتی ہے۔ تمہارا کاروبار ختم ہو سکتا ہے۔"

مراد نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں“ میرا بہت نقصان ہو گا۔ میں اس سے بھی بڑے بڑے نقصانات برداشت کر سکتا ہوں لیکن مونا سے دوری کا نقصان برداشت نہیں کر سکتا۔ اگلے اس کے لئے میں تیار ہو جانا پسند کرتا ہوں۔“

انچارج نے کہا۔ ”تو پھر آپ باہر جا کر تیار ہوں۔ آئندہ میں یہاں کسی بھی شوہر کو دیکھنا پسند نہیں کروں گی چاہے تم ہو یا اصلی کامران ہو۔ مونا ہو شل سے باہر تم دونوں سے ملاقات کر سکتی ہے۔ یہاں اس کی اجازت نہیں ہے۔ بالکل آپ چلے جائیں۔“

مراد نے مونا کو دیکھا پھر کہا۔ ”میں شام کو فون کروں گا۔ مجھے بتادینا مکمل مکمل ملاقات ہوگی اور کب ہوگی؟“

وہ چلا گیا شکستا نے کہا۔ ”بڑا ہی ڈھنٹ ہے۔ تمہارا پیچھا چھوڑنا نہیں چاہتا۔“
مراد نے کہا۔ ”دیدی! میں اسے دیکھ کر پریشان ہو جاتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں“
حوصلہ ہاروں گی تو واپس جانا پڑے گا اور میں کامران کو چھوڑ کر جانا نہیں چاہتی۔“

شکستا نے اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ”ہماری یہی کو شش ہو گی کہ کوئی تمہیں واپس جانے پر مجبور نہ کرے۔“

شام کو رضا مراد نے فون کے ذریعے معلوم کیا۔ اس نے جواب دیا۔ ”کل شام کو چار بجے۔ کوئی جگہ مقرر کرو۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔ ہاسٹل کے سامنے نہ آنا۔ میں اپنی بدنامی نہیں چاہتی۔“

جگہ کا تعین ہو گیا۔ اس نے فون رکھ دیا۔ ذرا دیر بعد ہی پھر ایک فون آیا۔ اس نے اپنے کمرے سے آکر اسے ایڈیٹ کیا۔ ریسورٹ اٹھا کر پوچھا تو دوسری طرف سے ڈاکٹر ہنٹر کہہ رہا تھا۔ ”تمہیں ایک نرس کی ملازمت مل سکتی ہے میں بتاتا ہوں“ نوٹ کر لو۔ صبح دس بجے وہاں پہنچ جانا۔ میں وہاں ہوں گا۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔“

مونا نے اس کے بتائے ہوئے پتے کو نوٹ کیا۔ پھر اسے بتایا کہ رضا مراد آیا تھا اور اس سے کیا کچھ باتیں ہوئی رہی تھیں۔ تمام باتیں سننے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔ ”تم نے بڑی خوبصورتی سے میرے مریض کو پینڈل کیا ہے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ اسے سمجھا بھرا کر رکھو۔ یوں سمجھو“ ایک نادان بچہ اپنے قد سے کہیں زیادہ بلندی تک اچھل رہا ہے۔

لوٹری بھی اسی طرح اچھلتی رہتی ہے۔ وہ بھی مجبور ہو کر کے گلا انگوڑ کھٹے ہیں۔“

یوں دیکھا جائے تو سبھی مونا کی حمایت کر رہے تھے۔ سب ہی اپنی بساط کے مطابق اس کی مدد کر رہے تھے۔ اگر ارادے ایک ہوں، محبت بھی ہو تو دنیا ساتھ دیتی ہے لیکن کردار میں ذرا بھی کمزوری پیدا ہو جائے تو دنیا کے ساتھ دینے کے باوجود کام بکوتا چلا جاتا ہے۔ مونا اور کامران کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ انہوں نے ایک غلط طریقہ اختیار کیا تھا۔ صرف برطانوی قانون کے محاذوں کو دھوکا نہیں دیا تھا بلکہ اپنے مذہب کے خلاف بھی اپنی پیروی کو دوسرے کے نام سے منسوب کیا تھا۔ اگرچہ نام کا سودا کرنے اور عزت کا سودا کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے تاہم غلط سودا کوئی سادھی ہو آخر غلط ہوتا ہے جو عمل تہذیب کی نفی کرتا ہے وہ قاتل گرفت ہوتا ہے۔ اگر گرفت سے بچا رہے تب بھی قدم قدم پر مشکلات کا اور مسائل کا سامنا کرتا رہتا ہے۔ جیسا کہ وہ دونوں کر رہے تھے۔

دوسری صبح وہ دینی ملازمت حاصل کرنے کے لئے پونے کو بجے ہو شل سے نکلی۔ وہ ڈاکٹر ہنٹر کے بتائے ہوئے پتے پر پون گھنٹے میں پہنچ سکتی تھی اور وقت سے پہلے ہی پہنچ سکتی تھی لیکن ہو شل سے باہر آتے ہی اسے مراد کی کار نظر آئی وہ دروازہ کھول کر باہر آ رہا تھا اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ”کل رات ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی تھی“ اس سے معلوم ہوا تم ملازمت کے لئے پبلک سروس بلڈنگ کی طرف جاؤ گی۔ میں بھی اوسر ملٹن کورٹ، مورلین کی طرف جا رہا ہوں۔ آؤ تمہیں چھوڑ دوں گا۔“

مونا نے اپنی رسٹ وایج کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت نو بجتے کے لئے دس منٹ ہیں۔ اب جتنا بھی وقت گزرے گا“ میں تمہارے شام کے ایک گھنٹے میں سے اتنا ہی وقت کم کروں گی کیونکہ تم خدائی میں مجھ سے ملاقات کر رہے ہو۔“

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یہ کیا مذاق ہے۔ میں تو تمہاری مشکل آسان کرنے آیا ہوں۔ تم آگے جا کر بس اسٹاپ پر کھڑی رہو گی۔ پھر بس میں بیٹھ کر جاؤ گی۔ کلنی وقت گئے گا۔ اتنا وقت میرے ساتھ گزاریں۔“

”میں نے کہا نا“ میں گھڑی دیکھ چکی ہوں۔ جتنا وقت تمہارے ساتھ گزرے گا وہ.....“

مراد نے بات کاٹ کر کہہ۔ ”ہماری ملاقات کا وقت اپنی جگہ ہے لیکن ہم کبھی اتفاقاً یا ضرورتاً تو مل سکتے ہیں۔“

”کامران بھی اتفاقاً یا ضرورتاً مل سکتا ہے۔ تمہیں اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے محبت سے التجائی۔ دوسرے لفظوں میں خوشامدی۔ ”مونا! خواہ مخواہ ضد کر رہی ہو۔ اگر میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں، تمہیں آرام سے چھوٹا چاہتا ہوں تو کیا میرے ایک گھنٹے میں سے وقت کاٹ کر میرا نقصان کرو گی جبکہ میں تمہارا نقصان نہیں کر رہا ہوں۔“

”اگر تم میری مدد کر رہے ہو تو فاضل اوقات میں کامران بھی میری مدد کر سکتا ہے۔“

وہ بے بسی سے بولا۔ ”اچھا جتنا وقت ابھی میرے ساتھ گزار دو گی، اتنا ہی فاضل وقت تم کامران کو دے سکتی ہو۔“

”ہاں، یہ انصاف کی بات ہے۔“

”میں دل سے مجبور ہوں۔ تمہارے پاس آ کر تم سے جی بھر کر باتیں کئے بغیر دور نہیں جا سکتا۔ جاؤں گا تو شام تک بے چین رہوں گا۔ آؤ میرے ساتھ بیٹھ چلو۔“

اس نے کار کا دروازہ کھول دیا۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ ”ایک بات یاد رکھو میں نے تمہیں چار بجے کا وقت دیا ہے۔ چار سے پانچ بجے تک تمہارے ساتھ رہوں گی۔ ٹھیک پانچ بج کر دس منٹ پر کامران سے ملاقات ہو گی۔ مجھے چھ بج کر دس منٹ پر اس سے رخصت ہونا چاہیے لیکن تمہارے ساتھ گزارا ہوا یہ فاضل وقت اسے دیا جائے گا۔ یہاں پانچ بجے سے ہی شام کے سائے پھیلنے لگتے ہیں۔ چھ بجے کے بعد رات ہونے لگتی ہے۔ شکایت نہ کرنا کہ میں رات کو اس کے ساتھ رہی۔“

وہ ابھن میں پڑ گیا۔ یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اندھیرا ہونے کے بعد وہ کامران سے ملے۔ اس نے کہہ۔ ”تم مجھ سے دوستی کی بجائے دشمنی کر رہی ہو۔ مجھے پریشان کر رہی ہو۔“

”پریشان تو تم نے کیا ہے۔ جو معاملات ملے ہو گئے تھے اس کے خلاف ملنے چلے

آئے۔“

”اچھا یوں کرو جتنا وقت ابھی میرے ساتھ گزرے یہ وقت کل دن کو کسی وقت کامران کے ساتھ گزار لیتا۔“

”نہیں۔ آج کا حساب آج کے کھاتے میں جائے گا۔ جب دوستی اور محبت میں حساب کتاب شروع ہو چکا ہے تو پھر ہمیں اس کا پابند رہنا چاہیے۔“

وہ غصے سے تھلا کر بولا۔ ”جاؤ بس میں چلی جاؤ میں کبھی برداشت نہیں کروں گا کہ اچھے بچے کے بعد کامران سے ملو۔“

وہ غصے سے پاؤں پٹختا ہوا اسٹیرنگ سیٹ پر پھنچا۔ اس نے گاڑی اشارت کی پھر اسے تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا اس کی نظروں سے دور ہوتا چلا گیا۔ وہ سختی سے مسکراتے ہوئے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بس اسٹاپ کی طرف جانے لگی۔ پبلک سروس کی بلڈنگ عام مریضوں کے لئے نہیں تھی۔ وہ صرف خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مخصوص تھی۔ وہاں ایسے نئے شادی شدہ جوڑے آتے تھے جو فی الحال ماں باپ بننا نہیں چاہتے تھے اور جو بن چکے تھے وہ مزید اولاد کی روک تھام کے لئے آتے تھے۔ وہاں ایسی مائیں بننے والی عورتیں آتی تھیں جن کی صحت برائے نام ہوتی تھی۔ وہ بے حد کمزور ہوتی تھیں۔ انہیں دیکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا تھا کہ ان کا بلنالاڑی ہے یا ان کی زندگی بچانا ضروری ہے۔ مختصر یہ ہے کہ پبلک سروس بلڈنگ کا تعلق خاندانی منصوبہ بندی سے اور خصوصاً عورتوں سے تھا۔ وہاں مونا کو ملازمت مل گئی۔ پہلے ہی دن شام پانچ بجے سے ڈیوٹی مقرر ہوئی۔ پہلے پہنچے شام پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک۔ پہنچے ڈیوٹی بدلتی رہتی اور اسے چھ گھنٹے تک ڈیوٹی انجام دیتے رہنا تھا۔ پہلے ہی دن اپنے کامران سے ملاقات کرنے کا وقت اس کی ڈیوٹی کی بذر ہو گیا تھا۔

وہ ہوسٹل آگئی۔ وہاں سے اس نے مراد کے کالج کے فون نمبر پر رابطہ قائم کرنا چاہا لیکن وہ گھر میں نہیں تھا۔ پھر اس نے ڈاکٹر ہنزے پر رابطہ قائم کیا۔ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہہ۔ ”مجھے ملازمت مل گئی ہے۔ آج شام پانچ بجے سے ڈیوٹی پر جاؤں گی لیکن پانچ بجے کامران سے ملنے کا وقت مقرر تھا۔ اب چاہتی ہوں، دن کے کسی حصے میں ایک گھنٹے

کے لئے اس سے ملاقات کروں مگر اس سے پہلے مراد کو اطلاع دینا ضروری ہے ورنہ وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے گا۔

”مسٹر مراد میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں ان سے گفتگو کرو۔“

چند لمحوں کے بعد ہی مراد کی آواز سنائی دی۔ وہ خوش ہو کر کمرہ رہا تھا۔ ”میں جانتا تھا“ جذبہ عشق سلامت رہے تو محبت کرنے والی کچے دھاگے سے بندھی چلی آتی ہے آخر تم نے مجھے یاد کر لی لیا۔“

مونا نے اپنی مجبوری بیان کی۔ سب کچھ سننے کے بعد اس نے کلمہ ”میں کیا کر سکتا ہوں۔ یہ تو کامران کے نصیب ہیں۔ بقول تمہارے آج کا صاب آج کے کھاتے میں جائے گا۔ اس لئے آج تم اس سے مل نہیں سکو گی۔“

”کیوں نہیں مل سکتی؟ میں دن کو کسی وقت بھی ایک گھنٹے کے لئے مل سکتی ہوں۔“

”بقول تمہارے جب محبت اور دوستی میں حساب کتاب شروع ہو چکا ہے تو ہمیں مقررہ وقت کے مطابق عمل کرنا ہو گا۔“

”یعنی ایک ہفتے تک میں شام پانچ بجے سے رات کے گیارہ بجے تک ڈیوٹی دیتی رہوں گی اس طرح ایک ہفتے تک کامران سے نہیں مل سکتی۔“

”میں نے کہا تھا یہ کامران کی بد نصیبی ہے۔ تم ایک ہفتے تک اس سے مقررہ وقت پر نہیں مل سکو گی اور کوئی دوسرا وقت مقرر نہیں کیا جا سکتا۔“

مونانے اسے اپنی ڈیوٹی کے بدلے ہونے والے اوقات کے متعلق بتایا۔ پھر کلمہ ”تم بھی نوٹ کر لو۔ اب سے چوتھے ہفتے میری ڈیوٹی دن کے گیارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک ہو گی گویا کہ تمہارے لئے چار بجے سے پانچ بجے تک کا جو وقت مقرر ہے وہ چوتھے ہفتے میری ڈیوٹی کی نذر ہو گا اور تم پورے ہفتے مجھ سے ملاقات نہیں کر سکو گے۔ بولو منظور ہے؟“

وہ چپ رہا۔ جواب نہ دے سکا۔ مونا نے پوچھ ل ”خاموش کیوں ہو۔ جواب دو۔“
وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”تم اس سے مل سکتی ہو لیکن ملنے کا وقت مجھے بتا

کہ اس کے بعد میں تمہیں اس کے ساتھ نہ دیکھوں۔“

”میں دو بج کر پچیس منٹ پر اس سے ملاقات کروں گی۔ تین بج کر پچیس منٹ پر ملاقات کروں گی۔ اس کے پانچ منٹ کے بعد یعنی ٹھیک چار بجے تم سے ملاقات کروں گی۔“

”یہ بھی بتا دو کہاں ملاقات کروں گی؟“

”کامران نے یہ نہیں پوچھا ہے کہ تم سے کہاں ملاقات کروں گی؟“

یہ کہہ کر اس نے ریسور رکھ دیا۔ کامران نے اسے چند فون نمبروں کرائے تھے کہ ضرورت ہو تو وہ ان میں سے کسی نمبر پر رابطہ قائم کر سکتی ہے۔ اس نے ایک نمبر کو نکال لیا۔ کامران نے کہا تھا جب تک وہ پوری طرح صحت یاب نہ ہو جائے، زخم اچھی طرح بھرتے جائیں، وہ اپنے ایک اور دوست کے ساتھ رہے گا۔ اس کے ہاسٹل سے زیادہ فائدہ نہیں رہے گا۔ اس کا دوست ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ فلیٹ آزر سے رابطہ قائم ہو گیا۔ مونا نے کلمہ ”آپ کے کرائے دار مسٹر منور کے پاس کامران ٹائی ایک صاحب ہیں۔ پلیز آپ ان سے کہہ دیں کہ وہ مونا سے فون پر رابطہ قائم کریں۔“

یہ کہہ کر اس نے ریسور رکھ دیا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد ہی کامران نے فون کے دوسرے رابطہ قائم کیا۔ پھر کلمہ ”مجھے ابھی تمہارا پیغام ملا ہے۔ کو کوئی خاص خبر ہے؟“
”ہاں۔ مجھے ملازمت مل گئی ہے“ آج شام پانچ بجے سے رات گیارہ بجے تک ڈیوٹی

”یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔“

”کیسا اس خوشی میں بھول گئے کہ پانچ بجے مجھ سے ملاقات کرنا ہے؟“

”کیسے بھول سکتا ہوں تم سے جدا ہوتے ہی خیالوں میں ملاقات کرتا رہتا ہوں۔ پانچ بجے تم مصروف ہو تو کوئی بات نہیں۔ کوئی دوسرا وقت مقرر کر لیتے ہیں۔“

دوسرا وقت مقرر کرنے پر مراد کو اعتراض تھا لیکن میں نے اسے راضی کر لیا ہے۔
”دو بج کر پچیس منٹ پر ملیں گے اور ٹھیک تین بج کر پچیس منٹ پر رخصت ہو جائیں گی۔“

”اوہ مونا! یہ کیا مذاق ہے۔ ہم میاں بیوی ہیں یا مراد کے زر خرید غلام ہیں جو اس کے اشارے پر ناچ رہے ہیں۔“

”اس پر اصرار کر کے تم نے مجھے بلایا ہے اور اس کے حوالے سے بلایا ہے تو اس کے حوالے سے ہی مل سکتے ہیں۔ فون پر زیادہ بحث کرنے کی کیا ضرورت ہے وقت کا خیال رکھو اور مجھے بتاؤ، مکمل ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”تم جس ہوٹل میں رہتی ہو وہاں سے گرین پارک اور ہائیڈ پارک قریب ہیں۔ ہائیڈ پارک میں سرین ٹائن ٹرے کے اوپر ایک کٹناہ پل ہے۔ وہاں ایک ریستوران اور ایک اسٹیک بار ہے تم وہاں میرا انتظار کر سکتی ہو۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچ جاؤں گا۔“

وہ ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔ مونا اسی ریستوران کے باہر کھلی فضا میں ایک میز کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ کامران نے پاس آکر سمراتے ہوئے پہلو کلمہ پھر کئے۔ ”یہ کھلی فضا ہے چلو ریستوران کے اندر کسی کیمین میں بیٹھیں گے۔“

اس نے انکار میں سر ہلا کر کلمہ ”مراد بھی مجھے کسی ریستوران کے کیمین میں بیٹھنے کو کہے گا۔“

”وہ ابھی نہیں دیکھ رہا ہے۔“

”تم کیا جانو؟ وہ ہمارا چچا کبھی نہیں چھوڑے گا۔ کیس نہ کیس چھپ کر ہمیں دیکھتا رہے گا اور ہماری عمر بانی کرتا رہے گا۔“

وہ پریشان ہو کر وہیں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مونا اسے محبت سے اور بڑی حسرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سر جھکا کر بولا۔ ”مجھے اس طرح نہ دیکھو۔ میں خود کو بڑی شدت سے مجرم محسوس کرنے لگتا ہوں۔ تم مجھے اپنی زندگی میں آنے کی اجازت نہیں دے رہی تھیں۔ میں نے جبراً تمہارے دل میں جگہ بنائی، تم نے اجازت دے دی۔ پھر اس ملک کا قانون اجازت نہیں دے رہا تھا۔ میاں بھی میں نے ضد کی اور غیر قانونی طور پر تمہیں بلا لیا۔ ایسا نہ کرتا تو پتا نہیں تمہارا مستقبل کتنا شاندار ہوتا۔ پتا نہیں کون تمہارا جیون ساتھی ہوتا اور تم اس کے ساتھ.....“

وہ میز پر ہاتھ مار کر بولی۔ ”بس کرو۔ بہت ہو چکا تم کیا سمجھتے ہو؟ بے شمار عورتیں جو

اپنے شوہروں سے چمچ کر دیں پر دیں میں تمہارا زندگی گزارتی ہیں، کیا وہ دوسرے جیون ساتھیوں کے خواب دیکھتی ہیں؟ خواب بدل سکتے ہیں مگر خوابوں میں آنے والا نہیں بدل سکتا اور جب وہ زندگی میں آجاتا ہے تو پھر آخری سانس تک بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

”تم ناراض ہو گئیں، میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ میں تو اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہوں۔“

”مجرم ہم دونوں ہیں۔ ہم دونوں نے غلطیاں کیں۔ ہم دونوں بچتا رہے ہیں۔ اب اس بچتا رہنے سے کس طرح کھانا ہے اس کے لئے میں جدوجہد کر رہی ہوں۔ تم بھی کرتے رہو، کسی وکیل سے رابطہ قائم کرو۔“

”ضرور کروں گا۔ آج ذرا آرام کروں۔ کل شاید اچھی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں گا۔ پھر میری کروں گا۔“

وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر ریستوران میں گئے۔ سیلف سروس کے مطابق اپنے اپنے کچے پیٹڈ چیز اور کافی کی دو پیالیاں لیں۔ پھر اپنی جگہ واپس آکر بیٹھ گئے۔ ان کی محبت میں بڑی سنجیدگی آگئی تھی۔ پہلے جیسی بات نہیں رہی تھی کہ ملے تو شامی یا روٹیاں باتیں شروع ہو گئیں۔ اب وہ مستقبل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ انہیں کیا کرنا چاہئے؟ مونا اسے اپنے کمرے کی ان ساتھیوں کے متعلق بتا رہی تھی جو انگریزین قوانین کی ماری تھیں۔ وہ سب مونا کے دکھ کو سمجھ رہی تھیں اور ہمہ وقت اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار تھیں۔

ایک گھنٹہ کیا ہوتا ہے؟ کچھ نہیں ہوتا۔ بلکہ جیسے ہی گزر جاتا ہے کیونکہ یہ وصال کے لمحات ہوتے ہیں۔ وہ وقت سے چندہ منٹ پہلے ہی اٹھ گئے۔ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پارک سے باہر جانے لگے تاکہ باہر پہنچنے تک وہ وقت پورا ہو جائے۔

اوپن ایئر ریستوران کے احاطے سے باہر نکل کر چند قدم چلتے ہی وہ رک گئے۔ ذرا آگے دوچار آدمی کسی شخص کو منبھال رہے تھے۔ وہ جھکا ہوا تھا اور کسی تکلیف میں جھکا نظر آتا تھا۔ کامران نے اسے دور سے دیکھتے ہوئے کلمہ ”ارے یہ تو مراد ہے۔“

وہ دونوں تیزی سے چلتے ہوئے اس کے قریب پہنچے۔ کامران نے ان آدمیوں سے کہل "میں اسے جانتا ہوں۔ یہ میرا دوست ہے۔"

ایک شخص نے کہل "تمہیں گلو، ہم پریشان ہو گئے تھے پلیز اسے فوراً طبی امداد پہنچائیں۔"

اسے ایک گاڑی میں بٹھا کر پارک کے باہر پہنچایا گیا۔ پارکنگ ایریا میں ایک ٹیکسی میں بٹھایا گیا۔ کامران نے بھی بیٹھے ہوئے مونا سے کہل "تم بھی چلو، ہم اسے ڈاکٹر جان ہنر کے پاس لے چلیں گے۔"

"میں کیسے بیٹھ سکتی ہوں۔ جو وقت تمہارے لئے مقرر تھا، اس کے پندرہ منٹ مراد کی وجہ سے ضائع ہو رہے ہیں۔ اس کا حساب کیا یہ کرے گا؟"

مراد اپنے سینے پر ہاتھ رکھے، دل کو تھامے، تکلیف سے کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"تم جو حساب کرنا چاہو گی، کروں گا پلیز مجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔"

"کافی! تم واپس چلے جاؤ۔ کل میں ایک گھنٹے پندرہ منٹ تک ملاقات کروں گی۔"

کافی یوں بھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ زخمی حالت میں اپنے گھر سے پارک تک آیا تھا۔ اس وجہ سے تھک گیا تھا۔ مونا کی بات پسند آئی آج کے پندرہ منٹ کل کے ایک گھنٹے میں شامل کئے جائیں گے۔ وہ چلا گیا۔ مونا مراد کے ساتھ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ٹیکسی وہاں سے روانہ ہوئی۔ اس نے کن انکھیں سے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ بیزا رہا تھا۔ "میں مراد جان گاؤں تم مجھے بہت یاد کرو گی۔ آہ! بہت یاد کرو گی۔"

مونا نے دل ہی دل میں کہل "ہم خدا کو یاد کرتے ہیں لیکن شیطان بھی جبراً یاد آتا ہے اور ساری زندگی یاد آتا رہتا ہے۔ تم یاد آؤ گے تو کن ہی نئی بات ہو گی۔"

وہ بیزا تے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں برداشت نہیں کر سکتا۔ جب میں نے خمیدہ کو دلہن بن کر اپنے ہی بھائی کے گھر میں جاتے دیکھا تو پہلی بار میرے دل میں درد اٹھ گیا۔ تکلیف سے ترس پڑا۔ آج تمہیں کامران کے ساتھ ریسٹوران میں دیکھ کر پھر یہی حالت ہو گئی۔ میں کیا کروں۔ میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

مونا نے ناگواری سے، ذرا ہمدردی سے اسے دیکھا وہ دشمن تھا مگر اس پر ترس آ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈاکٹر جان ہنر کے جمپر میں پہنچ گئے۔ مونا اسے چھوڑ کر جانے لگی۔

تکلیف سے کراہتے ہوئے بولا۔ "نہ جاؤ، مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ اب تو چار بج چکے ہیں۔ مجھے سے ملاقات کا وقت ہے۔"

"بے شک! تم سے ملنے کا وقت ہے لیکن چار دیواری میں نہیں۔ میں کھلی فضا میں رہوں گی۔ طبیعت بحال ہو جائے تو چلے آؤ۔"

ڈاکٹر نے ایک گولی مراد کو کھانے کے لئے دی۔ پھر مونا سے کہل "خدا نہ کرو۔"

بھلا رہ جاؤ میرے مریض کی سب سے اہم دوا ہو۔"

"اور میری سب سے اہم دوا میرا شوہر ہے۔ اس کے بغیر میں ذہنی طور پر بیمار رہتی ہوں۔ یہاں علاج کے لئے آئی ہوں۔ کیا آپ اور آپ کا یہ مریض میرے لئے وہ دوا تجویز کر سکتے ہیں؟"

"دیکھو، تم تینوں کے درمیان سمجھوتہ ہو چکا ہے۔"

"میں اسی سمجھوتے کی رو سے کہہ رہی ہوں۔ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ کبھی صرف کھلی فضا میں مل سکتی ہوں۔"

ڈاکٹر نے کہل "مراد تم خود ہی اپنے حق میں برا کرتے ہو۔ تمہاری شرائط کی رو سے یہ درست کہہ رہی ہے۔ اگر تم اسے روکنا چاہتے ہو تو شرائط میں تبدیلی لاؤ اور کہہ دو کہ یہ کامران کے ساتھ بھی چار دیواری کے اندر ملاقات کر سکتی ہے۔"

وہ تکلیف سے کراہ کر بولا۔ "ہرگز نہیں، چار دیواری کے باہر وہ کہیں مر جائے گا۔"

مونا نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ پھر باہر چلی گئی۔ ڈاکٹر کی جو دوا کہیں بے ضرر اور بے اثر ہوتی تھیں، وہ بھی مراد پر اثر کرتی تھیں۔ اس پر مونا قریب تھی تو پھر اثر کیں نہ تھیں۔ وہ دس منٹ کے بعد ہی ٹھیک ہو گیا۔ بہتر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پوچھنے لگا۔ "وہ کہاں ہے؟"

ڈاکٹر نے کہل "باہر گاڑن میں ہے۔"

وہ فوراً ہی اٹھ کر وہاں سے جانے لگا۔ ڈاکٹر نے خاموشی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر ایسی سی گردن ہلا کر کہہ "پورفلو۔ میں اس کے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

وہ گاڑن میں مونا کے پاس پہنچ گیا۔ مونا نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہہ "ملاقات کے وقت کا آدھا گھنٹہ ختم ہو چکا ہے۔ اب آدھے گھنٹے میں ہم یہاں سے کسی میں بیٹھ کر پبلک سروس بلڈنگ کی طرف چلے جائیں گے۔ وہاں پہنچتے پہنچتے میری ڈیوٹی کا وقت جاتے گا۔ چلو۔"

وہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا۔ "یہ تو کچھ بھی نہ ہوا۔ میرا آدھا وقت بیماری میں گزر گیا اور آدھا تمہارے ساتھ جانے میں گزر جائے گا۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں۔ تمہارے لئے یہی وقت مقرر تھا۔"

"مگر تم چاہو تو میں رات گیارہ بجے اسپتال آ جاؤں۔ اتنی رات کو تم ہاسٹل واپس جاؤ گی میں تمہیں اپنی گاڑی میں پہنچا دوں گا۔"

مونا نے خوش ہو کر کہہ "ہاں اچھا آئیڈیا ہے۔ آج تم مجھے پہنچا دینا۔ کل رات کو گیارہ بجے کامران آکر مجھے ہاسٹل پہنچا دیں گے۔"

وہ ہونٹوں کو مسیج کر اسے گھورنے لگا۔ وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ "اس طرح کیا دیکھ رہے ہو۔ جب تم ایک بات کا حساب کرتے ہو تو پھر ہمارے حساب کرنے پر غصہ کیوں آتا ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ آگے جا کر وہ دونوں ایک بس میں سوار ہو گئے۔ مونا ایک سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "ڈو میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

وہ اس کے پاس خالی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ مونا نے پوچھا۔ "مجھے اسپتال چھوڑنے کے بعد کیا تم گھر جاؤ گے؟"

اس نے چونک کر پوچھا۔ "کیوں؟"

"اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ تمہیں مجھ پر یقین نہیں ہے تم سوچو گے کہ تمہارے جاتے ہی میں اسپتال سے نکل بھاگوں گی۔ کامران کے پاس پہنچ جاؤں گی یا کامران میرے پاس پہنچ جائے گا۔ تم رات گیارہ بجے تک وہاں ڈیوٹی دیتے رہو گے۔"

وہ سیٹ پر پہلو بدل کر رہ گیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ "میں تمہیں مشورہ دیتی ہوں، کہیں آرام سے بیٹھ کر اس سوال پر غور کرو کہ تمہیں دوست بنانا ہے یا ہاموس؟ اگر ہاموس بنو گے تو راتوں کی نیند اڑ جائے گی، گیارہ بجے تک میرے لئے اسپتال کے سامنے رات بھر پردہ دو گے۔ صبح گھر جا کر سونا چاہو گے تو نیند آنے کے باوجود چونک چونک کر اٹھو گے۔ خواب میں بھی تم مجھے اور کامران کو ملتے ہوئے دیکھ کر سو گے۔ جب تک ہم میاں بوی جدائی کے صدمے سے رہیں گے تم ہمارے دماغ کے اندیشوں میں جھلارے کے دماغی مریض بننے رہو گے۔"

"تم چاہو تو اس مریض کو ایک نئی زندگی دے سکتی ہو۔ چاہو تو مجھ سے شادی سے پہلے میری تمام دولت، جائیداد اور کاروبار اپنے نام لکھوا دو مجھے کنکال بنا دو اور یہ دیکھو کہ میں تم پر کتنا اعتماد کرتا ہوں۔ تمہاری ایک ہاں ہر بات کے لیے پورا ہونے پر بھی دستخط کروں گا۔"

"جب تم مجھے اتنا چاہتے ہو تو میری خوشیاں کانپل رکھو محبت اس کو نہیں کہتے کہ جس کی طلب ہو اسے حاصل کر لیا جائے۔ محبت قربانی کا نام ہے۔ تم میری بھولی اپنی دولت سے نہیں، بلکہ قربانیاں دے کر میری خوشیاں سے بھر دو۔ تم جانتے ہو کہ مجھے خوشیاں صرف کامران کی ذات سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ کیا حق یہ قربانیاں نہیں دے سکتے۔ یقین کرو قربانی سے تمہاری محبت دائمی اور مثالی بن جائے گی۔"

"تم قربانی کا یہ سبق کامران کو بھی پڑھا سکتی ہو۔"

"ہمارا نکاح نامہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے بہت سے ایک دوسرے کو حاصل کر لیا ہے۔ اس کے بعد کوئی بھی محبت کا دعویٰ کرنا گناہ ہے۔ محبت میں قربانی دینی ہوگی لیکن بحث فضول ہے تم نہ سمجھو گے۔ تمہیں کچھ باتیں کہنی ہیں۔"

وہ بس سے اتر گئی۔ پھر اسپتال کی طرف ہلے ہوئے بھولی۔ "کل چار بجے ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ۔"

وہ جانے لگی۔ وہ چپ چاپ کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اندر چلتا رہا اور سوچتا رہا۔ نہ طاقت سے حاصل ہوتی ہے نہ دولت سے ہل ہوتی ہے۔ نہ سینہ پیٹ کر آہ

زاری سے حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے سامنے کوئی چھلکا کام آتی ہے۔

وہ سوچتے سوچتے لرزنے لگے۔ مضامین بھیجنے کا جب کوئی حربہ کام نہ آئے تو دیوانگی طاری ہونے لگتی ہے۔ دماغ میں آندھیاں سی چلنے لگتی ہیں۔ جنونی کیفیت شدت اختیار کرنے لگتی ہے۔ ایسے ہی وقت آدمی یا تو ہارے ہوئے سپاہی کی طرح ہتھیار ڈال دیتا ہے یا ایک دم سے پھٹ پڑتا ہے یا پھر دماغی مریضوں کی طرح تیار پڑنے لگتا ہے۔ اسے تکلیف کا احساس ہونے لگتا۔ اس نے جلدی سے جب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹی سی ذبیہ نکالی۔ پھر اس میں سے ایک سرخ رنگ کی گولی نکال کر منہ میں ڈال لی۔

☆ ----- ☆

مونا نے امیگریشن کے موضوع پر جو مضمون لکھا تھا وہ تیسرے دن ایک معروف اخبار میں شائع ہو گیا۔ یوں تو آئے دن کتنے ہی صحافی اور رپورٹرز انسانی زندگی کے حقائق کو بے نقاب کرتے رہتے ہیں مگر بہت کم صحافی اور قلم کار لوگوں کی نظروں میں آتے ہیں اور پسند کئے جاتے ہیں اس کی چند وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ بعض قلمکار تحریر کے ذریعے منفرد انداز پیش کرتے ہیں جو پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے بعض قلم کار تلخ حقائق کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑتے۔ اس طرح وہ حقیقت نگار کی حیثیت سے مقبول ہو جاتے ہیں۔ بعض صحافی اور حقیقت پسند قلم کار مختلف ذرائع اختیار کرتے ہیں اور اپنی آواز کو دور تک بلکہ اعلیٰ حکام تک پہنچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

تنگٹلا پانڈے بھی مختلف ذرائع اختیار کرتی تھی۔ ہمیشہ عورتوں کے حقوق پہ لکھتی تھی۔ اس کا خاص موضوع امیگریشن ہوتا تھا وہ ان عورتوں کی نمائندگی کرتی تھی جو ایشیا کے مختلف ممالک میں اپنے شوہروں کا انتظار کرتے کرتے بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ جب بھی اس کا کوئی مضمون شائع ہوتا تو اس مضمون کی کئی نقلیں وہ مختلف اداروں میں مختلف ممالک میں ارسال کرتی تھی۔

جب مونا کا وہ مضمون شائع ہوا تو تنگٹلا نے سب سے پہلے اسے امیگریشن کے

شعبوں سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ افسروں کے پاس بھیجا۔ اس کی ایک نقل وزارت خارجہ کے دفتر میں بھیجی۔ پھر اس کی کئی نقلیں اس نے سولہ ممالک کی خواتین اول کے پاس ارسال کیں۔ دنیا کے کئی ممالک کی سیاسی اور سماجی تنظیموں سے تعلق رکھنے والی خواتین کو بھی اس مضمون کی طرف متوجہ کر دیا یعنی وہ دنیا کی ایسی تمام خواتین کو امیگریشن کے مسئلے پر اپنا ہم خیال بناتی جاری تھی جو کسی نہ کسی شعبے سے تعلق رکھتی تھیں۔ کسی نہ کسی ملک کی خاتون اول یا سیاست دان تھیں، ڈاکٹر تھیں، اپنے ملک میں اور بین الاقوامی سطح پر بہت ہی معروف سماجی کارکن تھیں۔ وہ تمام مرد حضرات بھی ان خواتین کے ہم خیال تھے جو برسوں سے امیگریشن کے مسئلے سے دوچار ہوتے چلے آ رہے تھے۔

مونا کا جو پہلا مضمون اخبار میں شائع ہوا، اس کا عنوان تھا 'ہم اجازت چاہتے ہیں۔' اس عنوان کے تحت اس نے لکھا تھا کہ ہم اجازت اس لئے چاہتے ہیں کہ کوئی بھی شریف انسان کسی کی اجازت کے بغیر کسی کے گھر میں داخل نہیں ہو سکے۔ برطانوی حکومت کو اپنے قانون میں اتنی لچک پیدا کرنا چاہیے کہ شریفوں اور بد معاشرہ کی علیحدہ شناخت ہو سکے۔

قانون دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کی جڑیں انسانی تہذیب میں بڑی گہرائی تک ہیں۔ اس کے باوجود انسان کی ذہانت یا اس کی مکاریوں کے آگے قانون بے بس ہو جاتا ہے۔ چاہے کتنے ہی سخت قوانین نافذ کرو، منشیات کے پیو پارٹی، عورتوں کے سواگر، سرکاری رازوں کو چرانے والے اور سیاسی سازشیں کرنے والے اپنی مکاریوں سے چور دروازے بنا کر ہمیشہ ہر ملک میں اور خصوصاً انگلینڈ میں داخل ہوتے رہے ہیں، صرف اپنے شوہروں سے وفا کرنے والیاں داخل نہیں ہو سکتیں۔

انگلینڈ میں اپنا وطن چھوڑ کر آباد ہونے والوں کے متعلق یہاں قانون کے محافظ پوری طرح چھان بین کرتے ہیں۔ ان کے پاس ایسے قواعد و ضوابط ہیں اور ایسی لائن آف ایکشن ہے جس کے ذریعہ وہ ان کی جانچ پڑتال کے بعد یہاں رہنے کی اجازت دیتے ہیں۔ پھر کچھ دیا ہے کہ غلط قسم کے لوگ تو آسانی سے ملک میں داخل ہو جاتے ہیں لیکن جو غلط نہیں ہوتے، جو قانون کا لحاظ کرتے ہیں، وہ سرحد کے باہر منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

فی عورتیں اور مرد اپنے اپنے مسائل بیان کرتے تھے۔ شکلتا نے کہا۔ ”ان تمام لوگوں کے بچے نوٹ کرتی رہو“ ان سے رابطہ بھی قائم رکھو۔ ہم بہت جلد لندن کی شاہراہوں پر بہت بڑا جلوس نکالیں گے۔ اپنا مطالبہ منوانے کی کوشش کریں گے۔“

دوسری طرف کامران کئی دیکھوں سے ملاقات کر چکا تھا۔ کوئی اس کے مزاج اور مطلب کے مطابق نہیں تھا۔ ایک نے کہا۔ ”مسٹر کامران! پہلے تم یہاں کے باقاعدہ شہری بننے کی کوشش کرو۔ اس کے بعد تمہاری وائف کے لئے کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔“ وہ اس دیکھ سے مطمئن نہیں تھا۔ ایک بچتے بعد ایک پاکستانی دیکھ سے ملاقات ہو گئی۔ اس نے تمام حالات سننے کے بعد پوچھا۔ ”میاں صاحب زادے! جنہیں انگریز آئے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا پاکستان میں روزی حاصل نہیں ہوتی؟“

”آپ بھی تو پاکستان سے یہاں آکر وکالت کر رہے ہیں۔“

”میں کر سکتا ہوں۔ میرے بیوی بچے یہاں موجود ہیں۔ تمہاری وائف کو یہاں رہنے کی اجازت نہیں مل سکتی، تم خود باقاعدہ شہری نہیں ہو تو پاکستان واپس چلے جاؤ۔“

”میرے پاکستان واپس چلے جانے سے کیا ان تمام لوگوں کے مسائل حل ہو جائیں گے جو انگریزیشن کے سخت قوانین کے باعث مجسٹیش اٹھا رہے ہیں۔“

”میں مانتا ہوں“ ہمارے ملک کے کتنے ہی لوگ یہاں بیوی بچوں سے چھڑ کر زندگی گزار رہے ہیں لیکن جنہیں دوسروں سے کیا بھر دی ہے، جبکہ جنہیں اپنے ملک پاکستان سے محبت نہیں ہے۔“

کامران نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟“

”میں درست کہہ رہا ہوں۔ اگر جنہیں پاکستان سے محبت ہوتی، اس کی عزت کا خیال ہوتا تو اپنی وائف کو کسی دوسرے کے نام سے منسوب کر کے یہاں بھی نہ بلاتے۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے۔ کیا تم اسے سمجھ سکتے ہو؟ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر سمجھ سکتے تو کبھی ایسا قدم نہ اٹھاتے۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہی شرم آتی ہے کہ پاکستان کے ایک جوان نے اپنی بیوی کو ایک دوست سے منسوب کیا۔ اگر یہ بات پریس تک پہنچے گی تو جانستے ہو ہمارے ملک کی کتنی بدنامی ہوگی؟“

اگر اس ملک میں داخلے کی اجازت ہو اور متعلقہ شعبہ جات کا عملہ اور افسران ذمہ دار نہ ہوں تو چور، قاتل، اسلگر جیسے مجرم آجائے ہیں۔ یہاں بات صرف اجازت دینے پر ختم نہیں ہوتی بلکہ متعلقہ افسران کے غائبے سے شروع ہوتی ہے۔

اگر اس ملک میں داخلے کی اجازت نہ ہو تو سیدھے سادے لوگ مجبور ہو کر غیر قانونی طور پر چور دروازے سے آتے ہیں۔ انسانی تہذیب کی ابتداء سے آج تک کسی بھی شریف آدمی نے صرف اتنا ہی جرم کیا ہے جتنا حالات نے مجبور کیا، اگر وہ تین دن خانے کرے تو تب ایک روٹی چراتا ہے یعنی شریف آدمی ضرورت کے مطابق ایک قطرہ چراتا ہے اور قانون شکن پورا سمندر چراتے رہتے ہیں۔

اگر مرد کو اپنی بیوی سے اور بیوی کو اپنے مرد سے عمر بھر جدائی کی سزا دی جائے تب وہ چور راستوں سے ملنے آتے ہیں۔ یہ میاں بیوی کیا ہیں؟ یہ کچھ معصوم جذبوں کے اور کچھ دنگلین و سنگین جذبوں کے اسلگر ہیں۔ بیوی اپنے جذبوں کو، میاں اپنے جذبوں کو چھپا کر سلت سمندر پار اسلگر کرتے ہیں اور ایسی اسلگرنگ پر تمہارا قانون مجبور کرتا ہے۔ اگر تم بد معاشوں کو روک دے تو نیکی کے علمبردار کسلاؤ گے کیونکہ بد معاشوں کا راست قانون کے شریف محافظ روکتے ہیں اور شریف آدمیوں کا راست ہمیشہ بد معاش روکتے آئے ہیں۔ اگر کوئی قانون شریفوں کا راست روکتا ہے تو وہ بد معاش ہو گا۔ بولو! تمہارا قانون شرافت پر مبنی ہے یا بد معاشی پر؟

اگرچہ موتا کی تحریر کا انداز جارحانہ تھا لیکن وہ اپنے حالات اور اپنے مزاج سے مجبور تھی۔ ہر قسم کار اپنے مزاج اور حالات کے مطابق ذرا گرم ہوتا ہے، ذرا نرم ہوتا ہے۔ ابھی موتا میں نرمی نہیں آسکتی تھی۔ ابھی وہ انگاروں پر چل رہی تھی، اس لئے شعلے اگل رہی تھی۔

ایک ہفتے میں اس کے چار مضامین شائع ہوئے چاروں مضامین نے اچھی خاصی دھوم مچادی۔ ان کی اشاعت سے یہ ظاہر ہوا کہ ان کی طرح کتنے ہی لوگ انگریزیشن کے سخت قوانین کے باعث پریشانیاں میں مبتلا رہتے ہیں۔ شکلتا کے پاس ایسے بے شمار لوگوں کے خطوط آیا کرتے تھے۔ اب موتا کے پاس بھی خطوط آنے لگے تھے۔ ان خطوط میں کتنی

کامران ہونٹوں کو سختی سے پیچھ کر چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس نے پوچھا۔ ”آپ نے اپنے دل کی بھڑاس نکال لی۔ اب میری سنتے۔ کسی بھی ملک میں کسی بھی قوم میں کسی بھی برادری میں انسان بھی ہوتے ہیں شیطان بھی ہوتے ہیں۔ راہِ راست پر چلنے والے بھی ہوتے ہیں اور خطا کار بھی ہوتے ہیں لیکن ان خطا کاروں کے باعث پورا ملک، پوری کی پوری قوم، پوری کی پوری برادری بدنام نہیں ہوتی۔ کسی کی ایک انگلی زخمی ہو جائے تو وہ مکمل طور پر اپنا چم نہیں کھاتا۔ میں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ہماری حکمرانیت پاکستان ڈھکے چھپے گناہوں کو ختم نہیں کر سکتی تھی لیکن سرعام ہونے والے گناہوں کا سدباب کر سکتی تھی۔ لہذا بازار حسن بند کر دیئے گئے۔ اب وہاں سرعام جسم فروشی نہیں ہوتی لیکن چند شیطان صفت لوگ بنگال سے عورتیں لا کر وہاں فروخت کرتے ہیں۔ عورتوں کی خرید و فروخت کا مذموم دھندا چل رہا ہے۔ ان کا یقیناً حساب کیا جا رہا ہو گا۔ ایک دن وہ ضرور گرفت میں آئیں گے لیکن ان کی وجہ سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہاں جسم فروشی کا کاروبار ہوتا ہے پورے ملک کو بدنام کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ اگر میں نے اور مونا نے ایک خطا کی ہے تو اس سے پاکستان بدنام نہیں ہو گا۔“

دکیل نے میز پر مکہ مارتے ہوئے کہا۔ ”لیکن انگریز قوم ہمیں بدنام کرتی ہے ہم پر فتنی ہے۔ کتنی ہے ایٹمیائی لوگ ایسے ہی جرائم پسند ہوتے ہیں۔ اسی لئے انہیں یہاں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔“

”آپ اور ہم ان کی باتوں کا معتقل جواب دے سکتے ہیں۔ صرف ایشیاء کے ممالک سے نہیں، یورپی ممالک سے بھی کتنی ہی چور، بدعاش، امیگر اس ملک میں آتے ہیں۔ یہاں کی جیلوں میں یورپ کے بڑے بڑے گناہ گار مجرم نظر آئیں گے اور جو مجرم گرفت میں نہیں آتے، وہ بڑے بڑے گناہ گار ہیں، بڑی بڑی تقریبوں میں شریف انسانوں کے روپ میں دکھائی دیں گے۔“

”تم دوسروں کی نہیں صرف اپنی اور اپنے ملک کی باتیں کرو یا ایشیاء کی بات کرو۔“

”میں اپنی بات کرتا ہوں۔ اگر ہم مجرم ہیں، اگر ہم غیر قانونی طور سے یہاں آئے

ہیں تو مونا کے وہ مضامین پڑھ لیجئے جو پچھلے دنوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ جو لوگ ایشیاء میں اپنے اپنے ملک کے منفرد شہری ہیں، ان کے ملک کی حکومت ان کے ملک کا سفارت خانہ، ان کا پانچورت ان کا ایلیٹہ سرٹیفیکٹ اور کرکٹ سرٹیفیکٹ جب یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ ہر طرح سے بے داغ ہیں، کسی جرم میں بھی ملوث نہیں رہے، معزز شہری ہیں تو پھر انہیں یہاں آنے کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی؟ ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔ ہم نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا۔ ہم نے محبت سے مجبور ہو کر، دوری سے مجبور ہو کر، قوانین سے مجبور ہو کر حالات سے مجبور ہو کر ایک چور راستہ اختیار کیا۔ سیدھی سی بات ہے کہ سیدھا راستہ کھول دو۔ کوئی شریف آدمی ٹیڑھا راستہ کبھی اختیار نہیں کرے گا۔“

دکیل نے کہا۔ ”سیدھی سی بات ہے، میں یہاں برطانیہ کے قوانین کو چیلنج کرنے نہیں دوکالت کرنے آیا ہوں۔“

کامران مایوس ہو گیا۔ اس دکیل سے بھی بات نہ بن سکی۔ وہ مونا سے ملنے کے لئے ٹھیک پانچ بجے دریائے ٹمبر کے ساحل پر پہنچ گیا۔ مونا میلی برج کے پاس اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ چیخے ہوئے شوق رنگوں کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ بالوں میں پھول لگا رکھا تھا۔ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ لباس کا رنگ اور پھول کی کھٹکھٹ تپا رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ کامران نے کہا۔ ”ایک طویل عرصے کے بعد میں تمہیں کھل کر مسکراتے دیکھ رہا ہوں۔ کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔“

اس نے کہا۔ ”میرا آج ساتواں مضمون اخبار میں شائع ہوا ہے اور اتنا اچھا رسپانس مل رہا ہے کہ بیان نہیں کر سکتی۔“

”تم ایسے خوش ہو رہی ہو جیسے میری شریک حیات کی حیثیت سے یہاں رہنے کی اجازت مل گئی ہو۔“

”میں صرف اپنے متعلق نہیں سوچتی۔ ہزاروں عورتوں کے متعلق سوچتی ہوں جو اپنے شوہروں کے ساتھ رہنے کے لئے جانے کیسے عذاب سے گزر رہی ہیں۔ ان کے دن رات کیسے گزرتے ہوں گے یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں جب دیکھتی ہوں کہ میرے مضامین کا جواب خاطر خواہ مل رہا ہے، لوگ پسند کر رہے ہیں اور اعلیٰ سطح تک ان مضامین

کا چمکا ہو رہا ہے۔ اخبارات میں اس کا رد عمل ظاہر ہوتا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔“

اس نے مونکا کو بڑی محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم بہت زیادہ مصروف ہو گئی ہو۔ روزانہ پبلک سروس بلڈنگ میں سچے گھنٹے تک مصروف رہتی ہو۔ اس کے بعد مضامین لکھنے میں جانے تمہارا کتنا وقت صرف ہوتا ہے۔ ایٹھائی عورتیں اور مرد تم سے آکر ملاقات کرتے رہتے ہیں۔ مجھے یاد کرنے کی ذرا بھی فرصت نہیں ملتی ہو گی۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”جو کچھ کر رہی ہوں تمہیں حاصل کرنے کے لئے مخالف حالات سے لڑ کر تمہیں جت لینے کے لئے، بیش بہا تمہارے پاس رہنے کے لئے۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ کامران نے حیرانی سے پوچھا۔ ”یہ آج تم نے خود ہی اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا ہے۔ کیا اس بات کا خدشہ نہیں ہے کہ مراد کہیں چھپ کر دیکھ رہا ہو گا۔“

”اس نے فون پر کہا تھا کہ بہت بیمار ہے۔ اپنے کانٹے سے نکل نہیں سکے گا۔ لہذا آج میں چار بجے میں جیسی برج کے پاس ملاقات کروں وہ کسی طرح یہاں پہنچے گا لیکن میں چار بجے سے انتظار کرتی رہی، وہ نہیں آ سکا۔“

وہ کتنا کچھ سے کرا کچھ ہے۔ اگر اس نے بیماری کی بات کی ہے تو وہ اس قدر بیمار نہ ہو گا کہ یہاں تک نہ آ سکے۔ یقیناً چھپ کر ہمیں دیکھ رہا ہو گا۔

”دیکھتے دو۔ میں نہیں ڈرتی۔“ وہ اس کے اور قریب آ گئی۔ اس لمحے جیسے تمام کی تمام گمشدہ سرسبز قریب آ گئیں۔ دریائے نمہ کی لہریں یوں تو کم صم بہتی رہتی تھیں، اس لمحے ان کے بھاؤ میں ترنم اُمید ان لہروں میں مستی بھری روانی تھی، پلک تھی، رقص تھا، جیسے دریا لہرا لہڑائی لے رہا ہو.....

لیکن کیا ہو سکتا ہے دشمن محبت نے خوب سوچ سمجھ کر یہ شرط عائد کی تھی کہ وہ تینوں ایک دوسرے سے ملیں گئے تو کھلی فضا میں۔ کسی چار دیواری میں ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ محبت تو ایک خوشبو ہے۔ وہ گلدان میں یا پر فیوم کی بوتل میں بند ہو کر مل سکتی ہے لیکن کھلی فضا میں ہوا کی طرح دور نکل جاتی ہے۔ مہا کی طرح پاس نہیں رہتی۔

انہیں جان بھر کی آواز سنائی دی۔ وہ ان کے قریب آتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ”مداخلت کی صفائی چاہتا ہوں۔ میں ابھی مراد کے پاس سے آ رہا ہوں۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ وہ مونا سے ملنے کے لئے یہاں آنا چاہتا تھا لیکن گھر کے دروازے سے نکلنے ہی پر بڑا۔ بڑی مشکل سے واپس اپنے بیڈ روم میں گیا۔ وہاں سے فون پر مجھے اطلاع دی۔ اگر میں جلد نہ پہنچتا تو وہ طبیعت خستہ کے بعد دوبارہ گھر سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ میرے آنے کے بعد بھی ضد کر رہا تھا کہ دوادے دو، میں فوراً اچھا ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد مونا سے ملنے جاؤں گا۔“

مونا نے کہا۔ ”میں نے دیوانوں کے متعلق بہت کچھ سنا تھا مگر یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایسا کوئی دیوان میرے پیچھے پڑ جائے گا۔“

”مسز مونا کامران! وہ دیوانہ سی لیکن اسے صرف میرا مریض سمجھو، پلیز اس سے ملاقات کرلو۔“

”اس سے ملاقات کا وقت گزر چکا ہے۔“

”وہ صاب آج نہ کرود۔ میں نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ بستر پر آرام سے لیٹا رہے گا تو میں تمہیں لے آؤں گا۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ تم یہاں مل سکتی ہو۔“

وہ انکار کرنا چاہتی تھی۔ کامران نے کہا۔ ”تم چلیں گے۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔ انکار نہ کرود۔“

وہ تینوں وہاں سے چلتے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں ڈاکٹر نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھ کر کانٹے کی طرف جانے لگے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ”مراد پہلا مریض ہے جو میرے دائرہ اثر سے نکلتا جا رہا ہے۔ مسز کامران کے یہاں آنے سے پہلے سائیکلو پیکل ٹریٹ منٹ کا خاطر خواہ اثر ہو رہا تھا۔ بس ایک امید تھی کہ کسی اچھی سی لڑکی سے شادی کر لے گا تو نازل ہو جائے گا لیکن اب وہ گھٹت اور احساس محرومی کے ایسے استیج پر ہے جہاں انسان جنونی انداز میں سوچتا ہے، عمل کرتا ہے اور پاگل خانے میں پہنچ جاتا ہے۔“

وہ کانٹے کے سامنے پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے گاڑی سے اتر کر دروازے کو چابی سے

کھولتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اسے باہر سے لاک کر دیا تھا اور اسے سمجھا دیا تھا کہ ہمارے آنے پر بستر سے نہ اٹھے۔“

لیکن وہ دروازہ کھول کر اندر آئے تو وہ بستر سے اٹھ کر اپنے بیڈ روم کے دروازے تک پہنچ گیا تھا۔ ان کی آواز سن کر آ رہا تھا۔ پھر مونا کو دیکھتے ہی دروازے کے سارے کھڑ ہو گیا۔ خوش ہو کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے روتے ہوئے بچے کو اس کا گم شدہ کھلونا مل گیا ہو۔

کامران اسے بہت دنوں کے بعد دیکھ رہا تھا اور بہت حیرانی سے دیکھ رہا تھا کیونکہ اب وہ پہچاننا نہیں جا رہا تھا۔ اس کے گال پتک گئے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھر گئی تھیں بلکہ جسمانی طور پر وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بننا جا رہا تھا۔ داڑھی بڑھ گئی تھی۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ وہ اتنا لاغر اتنا بے جان نظر آ رہا تھا کہ دروازے کا سمارالے کر کھڑا نہ ہوتا تو شاید فرش پر گر پڑتا اور اس طرح کہہ کر کہہ کر پھر بھی اٹھ نہ سکتا۔

اس نے کہا۔ ”مونا؟ تم نے مجھے بتایا نہیں کہ مراد کی یہ حالت ہو گئی ہے۔ تم تو روزی ملتی رہی ہو۔“

اس سے پہلے کہ مونا جواب دیتی، مراد نے چونک کر کامران کو یوں دیکھا جیسے اب تک صرف مونا نظر آ رہی تھی۔ ساری دنیا گم ہو گئی تھی۔ کامران کو دیکھتے ہی اس نے غصے سے کہا۔ ”تنت..... تم کیوں آئے ہو۔ چلے جاؤ یہاں سے، میں تمہیں.....“

وہ بات پوری نہ کر سکا۔ قہر قہر کانپنے لگا۔ کامران نے آگے بڑھ کر اسے قہقہہ لایا۔ نرمی سے کہنے لگا۔ ”غصہ بعد میں دکھالینا۔ تم نے مجھ سے بڑی دشمنی کی ہے لیکن میں اس حالت میں تم سے دشمنی نہیں کر سکتا۔ آؤ بستر پر لیٹ جاؤ۔“

وہ اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے دوسری طرف سے پکڑ لیا۔ پھر وہ دونوں اسے زبردستی بیڈ روم میں لے گئے۔ اسے بستر پر بٹھانا چاہا، وہ بیٹھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ مونا سے دور رہنا نہیں چاہتا تھا۔ مونا نے کہا۔ ”مراد! میں کامران کے ساتھ آئی ہوں۔ ہم یہاں سے ساتھ جائیں گے۔ اس لئے کامران کو جانے کے لئے نہ کہو۔“

وہ غصے سے گرفتاریت سے چیخے ہوئے بولا۔ ”میں کون گم میں اسے بھگا دوں گا۔ یہ ہمارے درمیان ایک دیوار ہے۔ ڈاکٹر نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مجھے پھٹی کھانے کا شوق ہے لیکن یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ کانٹا گلے میں انک سکتا ہے اور یہ میرے گلے میں انک گیا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ کامران کو پیچھے کی طرف دھکا دینا چاہتا تھا لیکن خود ہی اپنا توازن نہ مہیا کر سکا۔ بری طرح کانپتے ہوئے گرنے لگا۔ ڈاکٹر اور کامران نے پھر اسے سمجھال لیا۔ زبردستی بستر پر لٹا دیا۔ وہ بستر پر چل رہا تھا۔ تڑپ کر ان کی گرفت سے لکٹا چاہتا تھا لیکن اس قدر توانائی تھی کہ پوری توانائی سے تڑپ بھی نہیں سکتا تھا۔

مونا نے بڑے ہی سخت الفاظ میں تنبیہ کی۔ ”اگر تم خاموشی سے بستر پر لیٹنا نہیں چاہو گے تو میں ابھی واپس چلی جاؤں گی۔“

یہ سننے ہی وہ بڑبڑا اور چلتا بھول گیا۔ بالکل سکت ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ میں بستر پر لیٹا رہوں گا مگر تم میرے سامنے رہنا میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتا۔ تم سے باتیں کرتا رہوں گا۔“

انہوں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ چپ چاپ بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ مونا کو کتنے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ میں تمہیں ایک دوا دے رہا ہوں۔ اس کے اثر سے دماغ پر سکون رہے گا پھر تم آرام سے سو جاؤ گے۔“

”نہیں“ نہیں میں سونا نہیں چاہتا۔ میں.....“

مونا نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں یہاں تمام رات کھڑی نہیں رہ سکتی۔ تمہیں معلوم ہے گیارہ بجے سے میری ڈیوٹی ہے۔ مجھے ہاسٹل جانا ہے پھر کھانے پینے کے بعد تیار ہو کر ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہے اس لئے ڈاکٹر جو دوا دے رہے ہیں اسے کھا لو اور آرام سے سو جاؤ۔“

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ڈاکٹر نے ایک دوا اس کی طرف بڑھائی، پانی کا گلاس بھی سونپا۔ مونا نے کہا۔ ”تم نے مجھ پر پابندی عائد کی تھی کہ میں چار دیواری میں کسی سے ملاقات نہ کروں۔ اس کے باوجود تم سے ملنے آئی ہوں۔ کیا تم میری بات نہیں مانو گے۔“

دوا نہیں کھاؤ گے؟

اس نے دوا لے لی۔ دوسرے ہاتھ سے گھاس تھام لیا۔ پھر اس دوا کو منہ میں ڈال کر پانی پینے لگا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”شہناش تم اس طرح ہماری بات ماننے رہو گے تو جلد صحت یاب ہو جاؤ گے۔“

اس نے گھاس لے کر قریبی میز پر رکھ دیا۔ پھر کہا۔ ”مرا! اب تم چاروں شانے چت لیٹ جاؤ، ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دو۔ اپنے دماغ میں صرف ایک خیال قائم کرو اور وہ خیال یہ ہے کہ ایک ٹینے نے تمہیں اس حال کو پہنچایا ہے، تم مرد ہو، ایک عورت کے ہاتھوں شکست نہیں کھاؤ گے۔ مردوں کی طرح زندہ رہو گے اور مرد بھی ایک عورت کا انتقام دوسری عورت سے نہیں لیتا۔“

اس نے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا لیکن آنکھیں کھولے مونا کو دیکھنے جا رہا تھا۔ مونا نے کہا۔ ”آنکھیں بند کر لو۔“

ڈاکٹر نے کہا۔ ”آنکھیں بند کر کے بھی تم مونا کو دیکھ سکتے ہو، یقین نہ ہو تو آزا لو۔“

مرا نے آنکھیں بند کر لیں۔ یقیناً وہ بند آنکھوں کے پیچھے نظر آ رہی تھی اس نے اس نے آنکھ نہیں کھولی۔ ڈاکٹر نے اشارے سے مونا اور کامران کو دوسرے کمرے میں جانے کے لئے کہا۔ وہ دونوں دبے قدموں سے چلتے ہوئے بیڈ روم سے باہر نکل گئے اور دوسرے بیڈ روم میں پہنچ گئے۔ وہاں کامران نے کمرے کو بند کرتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر کہا۔ ”ہم کس مصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ تمہیں یہاں جلاتے وقت کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہم یہاں ایک دوست نما دشمن کے سامنے بے بس ہو جائیں گے اور دشمن بھی ایسا ہے جس کے لئے ہم موت کی دعائیں مانگ سکتے۔ وہ خود ہی مر رہا ہے مگر مرتے مرتے بھی چیخا نہیں چھوڑ رہا ہے۔“

”کامران اس کا ذکر نہ کرو۔ ہم تھک گئی ہوں۔ پریشان ہو گئی ہوں۔“

وہ ایک ہاتھ سے سر تھام کر بستر کے سرے پر بیٹھ گئی۔ کامران نے اسے ہمدردی اور محبت سے دیکھا۔ بے چاری کتنی پریشان ہو رہی تھی۔ اس پر کتنا ترس آ رہا تھا۔ کتنا

فطری صورت لباس پہنا ہوا تھا۔ اس پر خوب راج رہا تھا۔ اس کے بالوں میں جو پھول تھا، وہ ایک اشارہ تھا۔ اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہا تھا، کاش! میں ایک پھول ہوں۔ میری گفتگو تمہارے لئے ہے۔

باہر رات کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ اندر خوابگاہ میں خاموشی تھی، تھالی تھی اور دوسری خواب گاہ میں دشمن سو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلا ہوا اس کے پاس آیا۔ پھر قریب ہی بستر کے سرے پر بیٹھ گیا۔ آہستگی سے ہوا۔ ”تم بہت پریشان ہو۔“

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ کامران نے اس کے ایک ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ تب اس نے چونک کر پہلے تو اپنے ہاتھ کو دیکھا پھر سرگھما کر بند دروازے کو دیکھا۔ یکبارگی رتپ کر اپنے ہاتھ کو پھراتے ہوئے دور کھٹک گئی۔ کامران نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

مونا نے جواباً پوچھا۔ ”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

”مونا! کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں تمہارا شوہر ہوں۔“

”شوہر؟ کیسا شوہر؟ کیا نہیں جانتے کہ عورت بیوی بننے سے پہلے اپنے مرد کے لئے

دلہن بننا چاہتی ہے؟

میرے پاس آنا ہی چاہتے ہو تو جواب دو، مندی کی مک، سناگ کا جوڑا اور میری

تھ کہاں ہے؟

دلہن کا وہ انتظار کہاں ہے جو سناگ کی بیج ہو تا ہے؟ دولہا کے قدموں کی پہلی

اہٹ پر دلہن کا چونک جانے والا وہ لمحہ کہاں ہے؟

وہ گھونگھٹ کہاں ہے جس کی اوٹ سے عورت پہلی بار مرد کے سامنے طلوع ہونا

چاہتی ہے؟“

کامران نے بیٹھے ہی بیٹھے اس کی جانب ذرا کھینکتے ہوئے کہا۔ ”اودہ گڈو تم کتنی

حساس اور جذباتی ہو۔“

وہ لکھت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”میرا ہاتھ تھامنا چاہتے ہو تو پہلے

دروازہ کھولو۔“

وہ اپنی جگہ سے اٹھنے ہوئے بولا۔ "میں جانتا ہوں تم ازدواجی معاملات میں ایک سلیقہ جانتی ہو۔ عورت کا وہ مان چاہتی ہو جو دلن بین کر حاصل ہوتا ہے لیکن یہ تو سوچو خدا نخواستہ تھیں یہاں سے واپس جانا پڑا تو میں تمہاری حسرت ہی کرتا رہ جاؤں گا۔"

"میں کچھ نہیں جانتی، میرے پاس آنا ہے تو پہلے عورت کا مان اور مرتبہ دینے آؤ۔ میں راستے میں پڑا ہوا مسک نہیں ہوں کہ اٹھالیا۔

میں بلیک گارڈن میں کھلے والا پھول نہیں ہوں کہ چلتے پھرتے توڑ لیا۔

کای! میری زندگی کی ایک سب سے اہم رات مجھ سے چھین لی گئی۔ مجھے وہ رات واپس لاؤ، واپس لاؤ، جب تک نہ لاسکو کسی چار دیواری کا دروازہ بند نہ کرو۔ کھول دو۔ خدا کے لئے اسے کھول دو۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چمپا کر رونے لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کامران کا جھکا ہوا سر تسلیم کر رہا تھا کہ بیوی اپنے میاں کے قدموں تلے زمین کی طرح چبھی رہتی ہے مگر اپنی سرشت میں آسمان ہوتی ہے۔ یوں تو اسے بڑی آسانی سے قدموں تلے روند ڈالو لیکن اس کی تمام تر انسانیت کے ساتھ اسے حاصل کرنا ہو تو آداب طلب سے مانگو زمین سے مانگو تو سر جھکا کر مانگو آسمان سے مانگو تو ہاتھ اٹھا کر مانگو۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا دروازے تک آیا۔ اسی وقت ہلکی سی دسک سنائی دی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ ڈاکٹر جان بفر کھڑا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مونا دوسری طرف منہ پھیر کر آنسو پونچھنے لگی۔ ڈاکٹر نے ان کی کچھ باتیں سن لی تھیں۔ باتیں سننا اور بات ہے سمجھنا اور بات ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیوں رو رہی ہے اپنے میاں کے ساتھ تو بیوی کو خوش رہنا چاہئے۔ اس نے معذرت چاہتے ہوئے کہا۔ "سوری" میں نے پھر ڈسٹر ب کیا ہے۔"

کامران نے کہا۔ "کوئی بات نہیں آئیے۔"

"اب ہمیں چلنا چاہئے" وہ گمری نیند سو رہا ہے۔"

وہ دے قدموں چلتے ہوئے کالج کے باہر آئے، ڈاکٹر نے بیرونی دروازے کو لاک کرتے ہوئے کہا۔ "اس کی ایک چابی میں نے مراد کے سرہانے رکھ دی ہے۔ ایک پیغام

لکھ دیا ہے کہ بیدار ہوتے ہی وہ مجھ سے رابطہ قائم کرے۔"

وہ ڈاکٹر کی کار میں آکر بیٹھ گئے۔ کامران نے کہا۔ "ہمارے دج سے آپ کو بڑی زحمت ہوئی ہے ہم اگلی شہراہ سے ٹیکسی میں چلے جائیں گے۔"

"مجھے بھلا کیا زحمت ہوگی۔ میں اپنے مریض کے لئے پریشان رہتا ہوں۔ مجھے مراد کی بڑی فکر ہے۔ میں اپنے کسی مریض کا علاج کرتے ہوئے ٹاکسی نہیں چاہتا۔ کسی طرح اس کا کامیاب علاج کرنا چاہتا ہوں لیکن یہ مجھ سے تعاون نہیں کر رہا ہے۔"

مونا نے کہا۔ "ڈاکٹر! میری دج سے یہاں پریشانی بڑھ رہی ہیں۔ سوچتی ہوں، جب میں اپنے شوہر کی بیوی بن کر نہیں رہ سکتی تو یہاں کیوں رہنا چاہتی ہوں۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہئے۔"

مسز کامران! پلیز ایسا فیصلہ نہ کریں۔ وہ بے موت مرجائے گا۔"

"وہ تو مر ہی رہا ہے۔ ہم آپ کیا کر سکتے ہیں۔"

"ڈاکٹر مریض کی آخری سانس تک مایوس نہیں ہو۔ اے بچانے کی کوشش کرتا ہے میں بھی بچانے کی کوشش کروں گا بشرطیکہ تم تعاون کرتی ہو۔"

"مجھے افسوس ہے" میں دو میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کر سکتی ہوں۔ یا تو واپس چلی جاؤں یا قانون کے مخالفوں کے سامنے اس بات کا اقرار کروں کہ میں نے یہاں قانون کے خلاف قدم رکھا ہے۔ میں کسی ایسے کامران مرتضیٰ کی بیوی نہیں ہوں جو پہلے رضا مراد تھا۔"

کامران نے پوچھا۔ "یہ کیا غصہ کرو گی؟ تمہیں جیل ہو سکتی ہے۔ تمہارے ساتھ میں اور مراد بھی فراڈ کے کیس میں دھرنے جائیں گے۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں، بیچ کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو بھولا نہیں کھلا۔ ہم نے جو غلطی کی، اس کی تلافی خودی کر لیں۔ میں یہاں سے چپ چاپ چلی جاؤں تو بہتر ہو گا جب میں نے ایگریٹین کے سخت قوانین کے خلاف فائٹ کرنے کا مناسب راستہ اختیار کر رکھا ہے تو یہ نامناسب راستہ کیوں اختیار کیا جائے۔ میں جلد سے جلد چلی جاؤں گی۔"

"نہیں مونا! تم نہیں جاؤ گی۔ میں یہاں تمہیں دیکھ کر رہی رہا ہوں۔"

وہ ایک گمراہ سانس لے کر بولی۔ ”ہمارے مذہب میں اس لئے پردے کی اہمیت کا احساس دلایا گیا ہے کہ کسی کو نہ دیکھو، دیکھتے رہو گے تو حصول کی تمنا شدت اختیار کرے گی۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔ تمہاری نگاہوں سے پردہ کر لوں گی تو تمہیں بھی صبر آ جائے گا۔“

وہ ہاشل کے سامنے گاڑی سے اتر گئی۔ ارادہ تھا کہ پاکستان جانے کے لئے طیارے میں سیٹ حاصل کرنے کے لئے فون سے معلومات کرے گی لیکن وہ ہاشل میں پہنچی اور ٹکٹلے کے سامنے اپنے فیصلے کا اظہار کیا تو وہ بولی۔ ”تمہارے جانے سے ہمارے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جس انداز میں تم لکھ رہی ہو اور حساس دلوں کو متاثر کر رہی ہو، یہ قلمی جناب پاکستان میں رہ کر بھی جاری رکھ سکتی ہو لیکن جانا ہے تو پرسوں کے بعد کسی دن بھی جا سکتی ہو۔ پرسوں ہم تمام ایشیائی باشندے امیگریشن کے سخت قوانین کے خلاف جلوس نکال رہے ہیں۔ تمہارا اس میں شریک ہونا ضروری ہے۔“

مونا کی مصروفیات بہت زیادہ بڑھ گئیں۔ جلوس کو ترتیب دینے، ایشیائی ممالک کے سفارت خانوں اور برطانوی حکام تک اپنی آواز پہنچانے کے سلسلے میں نظم و ضبط قائم رکھنا ضروری تھا۔ اسی کے لئے لاکھوں عمل تیار کیا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ مونا اور ٹکٹلے سے ملے ہاشل آئے تھے۔ مونا رات کے دس بجے تک ان کے ساتھ مصروف رہی۔ پھر وہاں سے اپنی ڈیوٹی پر چلی گئی۔ اس دوران اس نے فون کے ذریعے معلوم کیا، چوتھے دن کی فلائٹ میں اسے ایک سیٹ مل سکتی تھی۔ اس نے ٹکٹلے کو اس سلسلے میں رقم دی تاکہ وہ اس کے لئے ٹکٹ لے کر رکھ لے۔ وہ اسپتال پہنچ کر کامران کو فون کے ذریعے اپنی روانگی کے متعلق بتانا چاہتی تھی۔ وہاں انکوائری کاؤنٹر پر پہنچتے ہی پتا چلا کامران کا فون ہے۔ وہ اسے پوچھ رہا ہے۔

اس نے ریسپور اٹھا کر کہہ۔ ”میں ڈیوٹی پر آ گئی ہوں۔ تمہیں فون کرنا چاہتی تھی۔ اچھا ہوا تم نے ہی کر لیا۔ میں نے اپنے لیے سیٹ ریزرو کر لی ہے چوتھے دن کی فلائٹ سے جاری ہوں۔“

دوسری طرف خاموشی رہی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کامران پر سکتہ طاری ہو گیا ہو

ہاس نے پوچھا۔ ”خاموش کیوں ہو؟ بولنے کیوں نہیں؟“
اس کی ایک گہری سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ پھر اس نے کہہ۔ ”کیا بولوں؟“
”تمہیں کس رشتے سے روکا ہوا؟“

”میں ہمارے دریا کی کوئی رشتہ نہیں ہے۔“

”ہم میاں بیوی نہیں کاغذ کے پھول ہیں۔ ابھی ہمارے اندر ازدواجی زندگی کی خوشبو نہیں ہے، میرے پاس وہ حقوق بھی نہیں ہیں جنہیں استعمال کر کے تمہیں جانے سے روک سکوں۔“

”تمہارے پاس تمام حقوق ہیں لیکن میری مجبوری سمجھو۔“

”سمجھ رہا ہوں اس لئے کچھ بول نہیں سکتا اگر تم میرے نام سے میرے رشتے سے آتمیں، میاں کا قانون تمہیں میری شریک حیات تسلیم کرنا تو میں تمہیں جانے نہ دیتا۔“
”میں خود نہ جاتی۔ کیا اپنی منزل پر پہنچ کر کوئی واپس جاتا ہے؟“

”بعض بیویاں لا جھگڑا کرتی ہیں۔ میں تمہیں لڑنے کا موقع بھی نہ دیتا۔ تمہیں محبت سے سمجھاتا۔ محبت سے نہ سمجھتی تو لڑائی کرتا۔ ابھی تو میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ سنا ہے چاہتے والے کچھ دھانچے سے بندھے رہتے ہیں۔ میں تو کچھ دھانچا بھی نہیں ہوں۔“

”کاش تم ایسی باتیں نہ کرو۔۔۔۔۔۔ میں تمہاری بیوی ہوں تمہارے ایک حکم پر اپنی جان دے سکتی ہوں۔ کبھی تمہاری نافرمانی نہیں کر سکتی لیکن مجبوری کو سمجھو۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ میں ایک ایسے پاگل، جنونی شخص کے حوالے سے رہوں جو دن بہ دن ناقابل برداشت ہوتا جا رہا ہو۔ پھر یہ کہ ہم ایک غلطی کرنے کے بعد اس کی تلافی کیوں نہ کریں؟ اتنی غمخواریاں کھانے کے بعد ہمیں سیدھا راستہ ڈھونڈنا چاہئے اور میں نے ڈھونڈ لیا ہے اسی لئے جاری ہوں۔ اور جاری ہوں تو کیا ہوا، تمہارے دل سے تو کبھی نہیں جاؤں گی۔“

”جس دن میں سے تم کبھی نہیں جاؤ گی، وہ دن ہی نہیں مانتا۔ میں حالات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم میاں رہ کر کبھی مجھے نہیں مل سکتیں۔ میں اپنے دل پر پتھر رکھنے کی کوشش کروں گا۔“

وہ تھوڑی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر مونا نے کہہ دیا کہ بیچنے کے لئے دس منٹ ہیں۔ دس منٹ میں اپنی ڈیوٹی کے لئے تیار ہونا ہے۔ اس لئے اجازت چاہتی ہوں کل صبح رابطہ قائم کروں گی۔“

اس نے ریسپور دکھ دیا۔ دوسری طرف سے کامران ریسپور لئے بیٹھا سوچتا رہا..... خیالوں میں اسے دیکھتا رہا۔ ابھی وہ موجود تھی اور خیالوں میں اسے دیکھ رہا تھا۔ جب چلی جانے کی تب بھی خیالوں میں ہی اسے دیکھتا اور ملتا رہے گا۔ امیگریشن کے قوانین نے بیوی کو وہ محمود عورت بنادیا تھا جو گناہ کی طرح صرف خیالوں میں آتی تھی۔ دوسرے دن مونا کا مضمون اخبار میں شائع ہوا۔ اس کا عنوان تھا۔ بدنام سہاگن‘ اس نے لکھا تھا۔

”ہم وہ سہاگنیں ہیں جن کے پاؤں تلے زمین نہیں : تی ہم کبھی انگلینڈ میں شوہر سے ملے آتی ہیں‘ کبھی بچوں کی پرورش کے لئے اپنے دیس میں رہتی ہیں۔ جس کے پاؤں تلے زمین نہیں ہوتی وہ کبھی نیک نام نہیں ہوتی۔ میں ایسی عورتوں کو جانتی ہوں جو انگلینڈ میں آتی ہیں تو اپنے سناج میں مٹھوک ہو جاتی ہیں۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔ آیا وہ عورتیں اپنے اپنے شوہر سے ملنے جاتی ہیں یا شوہروں کی آڑ میں کچھ اور سی کل کھاتی رہتی ہیں۔ انسانی تہذیب کے خاص اصول و ضوابط ہیں جن پر عمل کر کے انسان غیر انسانی عمل سے دور رہتا ہے اور ایک دوسرے کے لئے مغبوطی اور تحفظ کی ضمانت بنتا ہے۔

تہذیب میں ازدواجی زندگی کے اصول یہ ہیں کہ میاں بیوی ایک گھر میں اور ایک ملک میں رہیں۔ اگر روزگار حاصل کرنے کے لئے میاں دوسرے ملک میں جاتا ہے تو بیوی اس کی عزت کا اپنی آبرو کا‘ اس کے نام کا‘ اپنی نسوانیت کا اور اس کے اور اپنے خاندان کی شرافت کا بھرم رکھتی ہے لیکن پرانے ملک میں روزگار کی مدت بڑھتی جائے‘ اور شوہر تنہا رہے‘ اور بیوی اس کا انتظار کرتی رہے تو پھر یہ تہذیب کے منافی ہے۔ جو اصول یا جو قانون میاں بیوی کو الگ کرتا ہے وہ گمراہی اور بے اعتمادی کے راستے ہموار کرتا ہے۔ ہمیں سے شیطانی تہذیب کے اصول کار فرما ہوتے ہیں۔ میں ایسی کی عورتوں کو جانتی ہوں جو مدتوں اپنے دیس میں شوہروں کا انتظار کرتے کرتے گمراہ ہو گئیں۔ وہ سہاگن کسی کے

ام سے تھیں‘ بدنام کسی کے نام سے ہوئیں۔ یہی حال شوہر حضرات کا ہے وہ یہاں انگلینڈ میں اپنا غم غلط کرنے کے لئے شراب کا سارا لینے ہیں۔ کلبوں میں جاتے ہیں۔ تہذیب ایک بیوی کا ہاتھ انہیں پکڑاتی ہے۔ شیطانی تہذیب ان کے آس پاس عورتوں کا میلہ لگا دیتی ہے۔

اس کے باوجود شوہر حضرات بدنام نہیں ہوتے۔

بدنام تو سہاگنیں ہوتی ہیں خواہ وہ پارسا رہیں یا اپنی پارسی کو نہیں پہنچائیں۔ ہمیں پہنچانے میں اس قانون کا ہاتھ ہے جو میاں بیوی کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے ہوس اقتدار یا سیاسی مصلحتوں کی بنا پر سرحدی لائن کھینچ کر ملکوں کو تقسیم کرنے والی باتیں تو سمجھ میں آتی ہیں لیکن میاں بیوی کے محبت بھرے رشتوں کے درمیان سرحدی لائن کھینچنے کی بات کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قانون بے شک انسانی بھلائی کے لئے ہے پھر ایسا قانون کیوں بنایا جاتا ہے جو انسانوں کے درمیان برائیاں پیدا کرنا چلا جائے۔

اگر حکومت برطانیہ بیرونی ممالک سے اور خصوصاً ایشیاء سے آنے والوں کا تحفظ کرتی ہے‘ ان کی فلاح و بہبود کے لئے سوچتی ہے اور ان کے لئے قوانین مرتب کرتی ہے تو پک بھینچے ہی یہ تمام برائیاں اور بدنامیاں ختم ہو سکتی ہیں۔ صرف امیگریشن کے قوانین میں ذرا سی لچک پیدا کر دی جائے۔“

دوسری صبح مونا نے وعدے کے مطابق فون کیا۔ کامران نے پوچھا۔ ”کلت ہو گیا؟“

”ابھی تو میں ڈیوٹی سے آف ہوئی ہوں۔ میں سے فون کر رہی ہوں۔ کھٹکا فون آیا تھا۔ اس نے کلت کے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ کہ رہی تھی میں ہاسل آؤں گی تو مجھ سے تفصیلی گفتگو کرے گی۔ ویسے میں نے‘ کھٹکا نے بلکہ یہاں کی بہت سی عورتوں اور مردوں نے ایک نیا منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبے کے مطابق ہم حکومت برطانیہ کے سامنے یہ انکشاف کر رہے ہیں کہ امیگریشن کے مخالفانہ قوانین کے باعث یہاں کتنی ہی عورتیں اور کتنے ہی مرد غیر قانونی طور پر آئے ہوئے ہیں۔ کل اخبارات کے ذریعے انکشاف ہو گا اور ہم جلوس میں بھی اسی قسم کے پلے کارڈز اٹھائے رکھیں گے۔“

کامران نے پریشان ہو کر پوچھا ”کیا تم خود کو ایکسپوز کرو گی کہ کسی فرضی کامران مرتضیٰ کے حوالے سے یہاں آئی ہو؟“
”بے شک میں اعتراف کروں گی۔“

”یہ کیا حماقت ہے۔ اس طرح تو مراد جیل چلا جائے گا۔ تمہیں بھی حراست میں لیا جائے گا۔ ہمارے ملک کے سفارتخانے کے افسران بھی ہمارا محاسبہ کریں گے۔“

”کاش! آؤی ڈرتا ہے تو پھر ڈرتا ہی رہ جاتا ہے۔ پہلے میں ڈرتی تھی کہ اپنے ملک میں رہ کر تم سے کس طرح جدا رہوں گی لیکن یہاں آ کر تمہارے قریب رہ کر بھی تم سے الگ رہنے لگی تو حوصلہ پیدا ہو گیا۔ اب میں تم سے الگ ہوں، اپنے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہی ہوں۔ اس طرح مجھ میں واپس جانے کا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے۔“

”تم کچھ زیادہ ہی حوصلہ مند ہوتی جا رہی ہو۔ چپ چاپ جانے کا فیصلہ کر لی لیا ہے تو یہاں اپنے بارے میں انکشاف کیوں کرو گی؟“

”اس لئے کہ ہماری غلطی آئندہ کوئی دوسری نہ دوہرائے۔ یہاں قانون کے محافظوں کو معلوم ہو جائے کہ ایسا بھی فراڈ ہوتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دوسرے ایڈیشنوں کے لئے راستہ بند کر رہی ہو۔“
”ایسا راستہ جو اخلاقی پہنچائی کی طرف لے جاتا ہو، اسے بند کر دینا چاہئے۔“

”یہ راستہ یوں بھی بند کر سکتی ہو کہ چپ چاپ یہاں سے واپس چلی جاؤ۔ وہاں جا کر اخبارات میں لکھو کہ میاں بیوی مجبور ہو کر..... فرضی میاں کا پتھر چلائے ہیں اور اس کے نام سے اس کے حوالے سے اپنی بیوی کو لندن بلائے ہیں۔“

”تم مجھے واپس جا کر تحریر کی طور پر جہاد کا مشورہ دے رہے ہو جبکہ یہاں ہزاروں عورتیں اور مرد عملی طور پر مظاہرہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں باقی ہوں، تحریری جہاد بڑی اہمیت کا حامل ہے لیکن عملی جہاد کا موقع آئے تو غلہ کاروں کو بھی اس صف میں شامل ہونا چاہئے اور میں شامل ہو رہی ہوں۔“

”یعنی تم اپنی غلطی کی تفسیر کر کے ہی رہو گی۔“
”یہ صرف میری یا تمہاری غلطی نہیں ہے، ایک مسلمان یا ایک پاکستانی کی غلطی

میں ہے، یہ انسانی غلطی ہے۔ ایسی غلطیاں ہندوستان کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ برہا، بنگلہ دیش اور سری لنکا کے لوگ بھی کرتے ہیں۔ ایشیاء کے کتنے ہی ممالک کے لوگ، اس لئے ایسا کرتے ہیں کہ وہ انسان ہیں۔ کبھی نادانستہ یا بحالت مجبوری کوئی غلطی ہو جائے تو وہ قابل معافی ہیں۔ لہذا اس غلطی کے نقصان وہ نتائج کی تفسیر کی جائے۔ لوگوں کو بتایا جائے کہ ہم نے جو کیا ہے اسے کوئی نہ دہرائے۔ اگر کوئی دہرائے گا اور اس خوش فہمی میں مبتلا رہے گا تو وہ کر غلطیوں کو چھپانے کا کہ چھپانے سے اپنی عزت اور اپنے ملک کا وقار قائم رہے گا تو یہ بڑی حماقت ہو گی۔ چھپانے سے بات نہیں بنتی۔ مجھے فخر ہے کہ میں پاکستانی ہوں اور یہ ہماری اعلیٰ طرفی ہے کہ ہم اپنی غلطیوں کا اعتراف کر کے اس کی نشاندہی کر رہے ہیں اور یہ راستہ بند کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہے ہیں۔“

دونوں میاں بیوی کے درمیان دیر تک فون پر بحث ہوتی رہی۔ پھر کامران نے کہہ دیا ”شام کو ملاقات ہو گی تو ہم اس سلسلے میں اپنے اپنے دلائل پیش کریں گے اور کسی نتیجے پر پہنچیں گے۔“

رابطہ ختم ہو گیا۔ جب وہ ہاسٹل میں پہنچی تو اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق فینڈ پوری نہ کر سکی۔ ٹھٹھکانے لے لیا۔ ”ابھی پریس کلب میں ایک میٹنگ ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق جتنی عورتیں، مرد اور بچے انٹگریشن قوانین سے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں، ان کے بیانات کل کے اخبارات میں شائع ہوں گے۔ ادھر ہم جلوس نکالیں گے۔ ادھر اخبارات میں دھماکہ خیز بیانات شائع ہوں گے۔ اس طرح ہماری تحریک بڑی کامیاب ہو گی۔“

موتانے کہہ ”جب تک ہزاروں کی تعداد میں بیانات شائع نہیں ہوں گے، اس وقت تک یہ تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی۔“

”ایسے ہزاروں سینکڑوں افراد ہیں جو بیانات کے لئے پریس کلب آ رہے ہیں۔ ہمارے پاس خطوط آتے رہے ہیں۔ ان خطوط میں عورتوں، مردوں اور بوزھوں نے اپنے مصائب کا ذکر کیا ہے۔ ان مصائب کا تعلق انٹگریشن قوانین سے ہے۔ لہذا ان کے خطوط بھی اخبارات میں شائع کئے جائیں گے۔“

شکنتا نے لی، اے کا کٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کلمہ "تمہاری خواہش کے مطابق پرہیز رات کی فلائٹ میں ایک سیٹ ریزرو ہو گئی ہے۔" مونا نے کٹ حاصل کرنے کے بعد رضا مراد سے فون پر رابطہ قائم کیا۔ پہلے تو کھٹی جتنی رہی۔ وہ سمجھ رہی تھی، مراد گھر پر ہی ہو گا لیکن اس قدر کمزور ہو گا کہ شاید بستر سے اٹھ کر ٹیلی فون تک نہ پہنچ سکے۔ اس کا خیال درست تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی کمزوری آواز سنائی دی۔ جب مونا نے اپنا نام بتایا تو اس کی آواز میں ذرا سی زندگی کی چمک پیدا ہوئی۔ وہ کھل کر بولا۔ "مونا؟ تم؟ تم مجھے یاد کیا ہے؟ کیا میری دعا قبول ہو رہی ہے؟"

"دعا ہو یا دوا" اگر مناسب ہو تو اثر کرتی ہے چونکہ تمہاری دعا مناسب نہیں ہے، تم کسی کا حق چھیننا چاہتے ہو اس لئے دعا قبول نہ ہو سکی۔ میں واپس جا رہی ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں نہیں، تم نہیں جا سکتیں۔ تم بھلا کیسے جا سکتی ہو؟" "کیوں نہیں جا سکتی؟" "میں بیمار ہوں، کیا مجھے چھوڑ کر جاؤ گی؟"

"اس شمر کے بے شمار اسپتالوں میں بے شمار مریض پڑے ہوئے ہیں کیا میں ان کی خاطر رک جاؤں۔ اتنی بڑی دنیا میں میرے لئے ایک ہی خاص مریض تھا۔ جو پچھلے دنوں زخمی ہو کر اسپتال پہنچا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے اب وہ صحت یاب ہے۔ میں مطمئن ہو کر جا رہی ہوں۔"

رضا مراد ہاتھ میں ریسپور لئے گم صم بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کاپٹا ہوا ریسپور اس بات کا غماز تھا کہ اسے اندر ہی اندر غصہ آ رہا ہے اور وہ برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے بڑی شکست اور کیا ہوتی کہ مونا سے چھوڑ کر چلی جانی اور وہ اس کا کچھ بگاڑ نہ سکتا۔ دوسری طرف سے مونا کی آواز سنائی دی۔ "تم چپ کیوں ہو؟ میں برسوں رات کی فلائٹ سے جا رہی ہوں۔ اگر تم اس قابل ہو سکو کہ ایئر پورٹ آ کر الوداع کو تو ضرور آتے میں انتظار کروں گی۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ وہ انتظار کرنے لگے سمجھ رہا تھا کہ مونا نے ریسپور

رکھ دیا ہے۔ اب اس کی آواز سنائی نہیں دے گی اور برسوں کے بعد وہ دکھائی بھی نہیں دے گی۔

اس نے ریسپور کو کریڈل پر بڑی کمزوری سے بٹخ دیا۔ اس سے زیادہ جھنجھلاہٹ کا مظاہرہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں اتنا دم نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ بستر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہی ایک قد آدم آئینہ تھا۔ وہ اپنے عکس کو دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ کیا میں یہاں سے چل کر مونا تک پہنچ سکتا ہوں۔ کیا مجھ میں اتنی توانائی ہے؟

وہ اپنی رہی سہی قوت کا اندازہ کر رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا آئینے کے سامنے پہنچا۔ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر برسی ہوئی داڑھی کو اور دھنسی ہوئی آنکھوں کو دیکھنے لگا۔ مونا کے پاس آئینے کے لئے حلیہ درست کرنا ضروری تھا۔ یہاں سے وہاں تک چلے ہوئے اس نے دو تین بار خود کو آزمایا۔ پتا چلا، کالج سے نکل کر کار میں بیٹھ سکتا ہے اور کار ڈرائیو کر کے مونا کے پاس چل سکتا ہے۔

لیکن وہاں پہنچ کر کیا کرے گا؟ کیا اتنے دنوں کا تجربہ کافی نہیں ہے کہ وہ صرف اپنے شوہر کی ہے۔ شوہر کی رہے گی اور بڑی بات تو یہ کہ اپنے مجازی خدا کے پاس پہنچ کر اس سے دور ہو رہی ہے۔

مراد بھی سوچ کر جھنجھلا رہا تھا۔ اس کے دور جانے سے کیا ہوتا ہے۔ کامران پاکستان پہنچ کر اس سے مل سکتا ہے لیکن وہ نہیں مل سکے گا۔ جب تک یہاں ہے اس وقت تک اپنی گرفت کسی طرح مضبوط کر سکتا ہے تو کر لے۔

وہ بستر کے سرے پر آکر بیٹھ گیا۔ ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ ایک دیکل سے رابطہ قائم ہو گیا۔ اس نے کلمہ "میں رضا مراد بول رہا ہوں۔ آپ نے میرے کاروبار کے سلسلے میں اکثر میرا ساتھ دیا ہے۔ اب ایک ذاتی معاملے کے سلسلے میں بات کرنا چاہتا ہوں لیکن اتنا بیمار ہوں کہ آہنیں لگتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں، میں شام کو آپ کے ہاں آؤں گا۔"

"شام تک بہت دیر ہو جائے گی۔ میں فوری طور پر آپ سے منگوا کر لے چاہتا ہوں۔"

میں رہ سکتا ہے اختیار ملنے لگتا ہے۔ وہ ملتا ہوا بستر کے آئینے کی طرف گیلہ پھر وہاں سے واپس آیا تو یقیناً خیال آیا کہ تیار ہے، کمزور ہے، ہاتھوں ہے، پلٹے پھرنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ دھپ سے بستر پر بیٹھ گیا۔ یوں ہانپنے لگا جیسے دور سے دوڑتا آ رہا ہو۔ قھوڑی دیر تک وہ یوں ہی ہانپتا رہا اور سوچتا رہا میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ اس طرح غصہ کھا کر اسے زور زبردستی سے روک نہیں سکتا۔ مجھے عقل سے کام لینا چاہیے۔

اسی وقت ملازم نے آکر کہا۔ ”جناب! آپ کے لئے سوپ تیار ہے لے آؤں؟“
وہ جھنجھلا کر جواب دینا چاہتا تھا پھر چپ ہو گیا۔ اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔
”میں ابھی نہیں پیوں گا۔“

”جناب! ڈاکٹر صاحب نے تاکید کی ہے، آپ کو ضرور کچھ کھانا پینا چاہئے ورنہ آپ پلٹے پھرنے کے قابل.....“

اس نے گھور کر ملازم کو دیکھا۔ وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا لیکن مراد سوچ رہا تھا۔ یہ درست کہتا ہے۔ مجھے پلٹے پھرنے کے قابل ہونا چاہئے۔ زیادہ سے زیادہ کھانا پینا چاہئے۔ پھر اس نے کہا۔ ”جی ہاں بات ہے، لے آؤ۔“

اس نے فون کے ذریعے ڈاکٹر ہنر سے رابطہ قائم کرنے کے بعد پوچھا۔ ”کیا تم چلتے ہو کہ وہ جاری ہے؟“

”میں نہیں جانتا۔ کیا واقعی؟“

”ہاں، ابھی اس نے فون پر بتایا ہے۔ اس انداز میں جیسے چیلنج کر رہی ہو کہ میں اسے روک سکتا ہوں تو روک لوں.....“

”تم اسے روک نہیں سکو گے۔“

”میں کبھی شکست تسلیم نہیں کرتا۔“

”تم تسلیم کرتے ہو۔ تم آج تک تینہ سے کھائی ہوئی شکست کو بھول نہیں پائے۔“
”وہج ہے کہ موت کے ساتھ اللہ رہے ہو اور اس حال کو پہنچ گئے ہو۔“

”پلیز اگر تم اسے کسی طرح روک سکتے ہو تو میں تمہاری دوستی کو ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔“

”آپ نہایت مختصر طور پر بتائیں، معاملہ کیا ہے؟“

”میری بیوی میری مرضی کے خلاف پاکستان واپس جانا چاہتی ہے۔ میں اسے کس طرح روک سکتا ہوں۔ میں تیار ہوں۔ کیا وہ قانون مجھے چھوڑ کر جاسکتی ہے؟“

”آپ کی بیماری کے دوران جانے کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کے درمیان کشیدگی ہے لہذا یہ کشیدگی باقی سمجھوتے سے دور ہو سکتی ہے۔ اگر معاملہ طویل پکڑے تو پھر یہ بات عدالت تک پہنچے گی۔“

”اس وقت تک وہ جا چکی ہوگی۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے۔ مقدمہ چلے گا تو اسے جی پی پر حاضر ہونا پڑے گا۔“

”میں اسے یہاں کی عدالت میں نہیں بلا سکتا۔“

”کیوں نہیں بلا سکتے۔ آپ مجھے صاف صاف بتائیں۔“

”وہ کسی دوسرے کی بیوی ہے۔ میں اسے اپنی بیوی بنانا چاہتا ہوں۔ وہ میرے نام اور حوالے سے یہاں آئی ہے لیکن پاکستان چلی جانے کی تو قانونی اور مذہبی لحاظ سے صرف اس کی بیوی ہوگی جس سے اس کا نکاح چڑھایا گیا ہے۔“

”پھر تو بات ختم ہو گئی۔ آپ اسے کسی طرح نہیں روک سکیں گے۔ اگر آپ نے زبردستی کی اور اس نے آپ کے خلاف بیانات دیئے تو آپ اپنی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔ کیونکہ آپ نے پرانی بیوی کو اپنے نام اور حوالے سے بلا کر یہاں کے امیگریشن قوانین کی نئی کی ہے۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”آپ مجھے ہی مجرم ٹھہرا رہے ہیں۔ میں صرف اتنا پوچھ رہا ہوں کیا آپ کسی طرح بھی قانون کا سامرا لے کر میری بیوی کو جانے سے روک سکتے ہیں؟“

”سور میں نہیں روک سکتا۔“

وہ غصے سے پھٹ پڑا۔ ایک دم سے دھاڑ کر بولا۔ ”تم کبواس کرتے ہو۔ تم وکالت نہیں کرتے۔ گھاس کاٹتے ہو۔ ٹو بیل دوہہ یو۔“

اس نے پھر ریسیور ہٹ دیا۔ اور تو کچھ اس کے آس پاس نہیں تھا۔ سارا غصہ ریسیور پر اتار رہا تھا۔ یہ فطری امر ہے کہ آدمی غصے کی حالت میں کھڑا ہوا ہو تو ساکت

”مراد! جو ڈاکٹر ہمارا علاج کر رہا ہے“ وہ کہتا ہے تمہاری حالت بڑی تشویش ناک ہے۔ تمہارا دل اس قدر کمزور ہو گیا ہے کہ کسی وقت بھی دھڑکنامد کر سکتا ہے۔ میں جانتا ہوں، شکست اور احساسی محرومی نے تمہیں غصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرتے کرتے جنون کے اس مرحلے پر پہنچا دیا ہے، جنہاں انسان دفاعی اور جسمانی طور پر بالکل کمزور ہو جاتا ہے۔“

وہ ناگوار سی بولا۔ ”تم اسے روک نہیں سکو گے خواہ خواہ مجھے نصیحتیں کرتے رہو گے؟“

اس نے ریسپور کریڈل پر رکھ دیا۔ ملازم اس کے لئے نرسے میں سوپ لے آیا تھا۔ اسے ایک چھوٹی سی میز پر رکھ کر جا رہا تھا۔ وہ ملازم کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کا نام رشید تھا مگر شیدے کہلاتا تھا۔ بختاب سے سات برس پہلے آیا تھا۔ دو برس یہاں کام کرنے کے بعد ابھی خاصی رقم جمع کرنے کے بعد پاکستان گیا تھا۔ وہاں اپنی برادری کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی۔ شادی کے بعد جب سے آیا تھا پانچ برس ہو گئے تھے، مگر واپس نہیں جا سکا تھا۔ ایک تو گھر والوں کے خرچ کے علاوہ پیوی کے بھی ذاتی اخراجات کے لئے کچھ نہ کچھ بھیجتا تھا۔ پھر منگلی دن بدن بوجھتی جا رہی تھی۔ پانچ برس پہلے وہ ایک ہزار روپے بھیجتا تھا۔ دو برس بعد ڈیڑھ ہزار روپے بھیجنے لگا۔ اب پانچ برس ہو گئے تھے، ماہانہ ذمائی ہزار روپے بھیجنے کے باوجود وہاں کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شیدے یہاں جو کچھ کماتا تھا، اپنے لئے بچا کر نہیں رکھ سکتا تھا یعنی اپنی رقم نہیں بچتی تھی کہ وہ یہاں سے پاکستان جاتا۔

مراد سوچتے سوچتے چونک گیا۔ شیدے اس سے پوچھ رہا تھا۔ ”جناب! آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ”ایک بار تم نے کہا تھا کہ پانچ برس سے اپنی پیوی کے پاس نہیں گئے۔ تمہارے پاس رقم نہیں بچتی ہے۔“

”یہ بہت پرانی بات ہو چکی ہے۔ اب تو سات برس ہو گئے ہیں۔“

”یعنی سات برس گزر گئے اور تم ایک بار بھی اپنی پیوی سے نہیں مل سکے۔“

”صاحب! مجبوری ہے۔ اب تو یوں لگتا ہے جیسے اسی طرح زندگی گزر جائے گی اور وہ ایک بچی کی پرورش کرتے ہوئے میرے نام پر بیٹھی رہے گی، ایک بار میں نے جھنجھلا کر خط میں لکھ دیا تھا میں نہیں آسکتا، مگر وہ چاہے تو مجھ سے نہایت حاصل کر لے۔ وہاں کسی شریف آدمی سے شادی کر لے۔ اس بات پر وہ ناراض ہو گئی تھی۔ بہت غصے میں خط لکھا۔ وہ غصہ دکھانے میں حق بجانب ہے۔ جب عورت اپنے نام بیٹھی ہو اور ہمارے انتظار میں جوانی کے سالوں بھادوں گزار رہی ہو تو اس کے غصے پر بھی غور محسوس ہوتا ہے۔“

”تم چاہو تو اپنی پیوی سے مل سکتے ہو۔ تمہارے آنے جانے کے جو بھی اخراجات ہو گے وہ میں پورے کروں گا۔“

شیدے نے اسے حیرانی اور بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ مراد نے پوچھا۔ ”کیا یقین نہیں آ رہا ہے؟“

”آ رہا ہے مالک! آپ پر یقین نہیں آئے گا تو کس پر آئے گا لیکن بڑے اخراجات ہیں۔“

”میں نے کہا نا، میں پورے کروں گا۔ اس کے عوض تم میرے لئے کیا کر سکتے ہو؟“

”آپ حکم دیجئے، آپ کے لئے جان کی بازی گا دوں گا۔ برس گزر گئے۔ آپ میری پیوی سے، میری بچی سے، میرے والدین سے ملانے کا ذریعہ بن رہے ہیں۔ ایک بار مجھے میری پیوی سے مل کر آنے دیجئے، میں آپ کے لئے جان دے دوں گا۔“

”مگر میں کون، تمہاری جان کی نہیں، میری جان لینے کی بات ہے۔ کیا تم مجھے قتل کرنا پسند کرو گے؟“

وہ چونک کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے کسی پاگل کو دیکھ رہا ہو، اس نے کہا۔ ”جہیں یہ بات مضحکہ خیز لگے گی لیکن میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ کیا تم مجھے زہلا کر دہ سکتے ہو؟“

وہ دم صم کھڑا اسی طرح منہ نکلا رہا۔ مراد کہہ رہا تھا میں مجبور ہوں۔ یہاں سے جا

یوی مونا کا ہرگز سامنا نہ کرے۔

شید نے اس کے حکم کی قہقہہ کی۔ جب باہر سے کال بلی کی آواز سنائی دی تو اس نے دروازہ کھولا۔ مراد کے بیان کے مطابق کامران تھا، مونا بھی ساتھ آئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مراد اٹھ کر بیٹھ گیا۔ کامران نے کہا۔ ”آرام سے لیٹے رہو۔ تم نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے“ اس نے مونا کو ساتھ لے آیا ہوں۔ اب ہمارے درمیان کوئی رنجش، کوئی کشیدگی نہیں رہے گی۔“

مراد نے سر جھکا کر نہایت سے کہا۔ ”مونا کے آنے پر مجھے خوشی ہو رہی ہے لیکن اسے نہ لاتے تو بہتر ہو۔ میرا سر نہایت سے جھک رہا ہے۔ میں کیا کروں۔ کس زبان سے اپنی زیادتیوں کی معافی مانگوں۔“

مونا نے بڑے غور سے اسے دیکھ کر پھر بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھنے ہوئے بولی۔ ”مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے، جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ۔“

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ”میں کوشش کروں گا تو بھول جاؤں گا لیکن تم نہیں بھول سکو گی۔“

”تم میرے دل کی بات کیسے جانتے ہو۔ میں نے کہا میں بھول گئی ہوں۔“

”اگر ایسا ہے تو واپس نہ جاؤ۔“

وہ کچھ کنا چاہتی تھی۔ کامران اس کے قریب ہی بستر کے سرے پر بیٹھنے ہوئے بولا۔ میں بھی یہی سمجھا رہا ہوں۔ اب اسے واپس نہیں جانا چاہئے۔ تم پھر ہمارے دوست بن گئے ہو۔ ہمارے ساتھ تعاون کرتے رہو گے تو اسے میرے پاس ہی رہنا چاہئے۔“

”کالی! تم سے کہہ چکی ہوں“ مجھے اپنے پاس بلانا چاہئے ہو تو اپنے نام سے اپنے حوالے سے بلاؤ۔ ایک طرح سے مراد صاحب نے ہم سے دشمنی نہیں کی ہے۔ دوستی کی ہے ہمیں اچھا سبق پڑھایا ہے۔ قانون سے کھیلنے کا انجام بتایا ہے۔ لہذا ہمیں سبق حاصل کرنا چاہئے۔ اینگریشن کے قوانین میں پلگ پیدا ہو یا نہ ہو، میں واپس جاؤں گی اور اس کے لئے جدوجہد کرتی رہوں گی۔“

مراد اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔

”کبھی اپنی ضد سے باز نہیں آئے گی۔ نہ یہاں رہے گی، نہ میں اسے قابو کر سکوں گا۔“ اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”مونا درست کہتی ہے، ہمیں قانون سے کھیلنا نہیں چاہئے بلکہ یہاں جائز طریقے سے بلانے کے لئے ہم سب کو مل کر جدوجہد کرنا چاہئے۔“

مونا خوش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ کامران نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا تم بھی جانتے ہو۔ تم میرے دوست ہو، میری حمایت کرو تو شاید ہم مونا کو روک لیں۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”ہرگز نہیں“ مونا کو یہاں سے جانا چاہئے اور ضرور جانا چاہئے۔ میں نے ابھی تو حوڑی دیر پہلے ایک پیالہ سوپ پیا ہے۔ اب پرسوں تک خوب کھاؤں گا، پیوں گا اور اس قابل ہو جاؤں گا کہ مونا کو الوداع کہنے ایئر پورٹ تک جا سکوں۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں مونا کو ایک شاندار الوداعی پارٹی دوں گا۔“

کامران نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے تم مجھ سے دشمنی کر رہے تھے اب مونا کے ساتھ مل کر کر رہے ہو۔“

اس کی بات پر مونا اور مراد ہنسنے لگے کامران نے کہا۔ ”ویسے میں پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ مونا کو سمجھانا مشکل ہے۔ جب اس نے جانے کی ضد کر لی ہے تو یہ ضرور جانے گی اور مجھے الوداعی پارٹی دینی پڑے گی۔“

مراد نے کہا۔ ”ہرگز نہیں تم دونوں کھانا میرے ساتھ کھاؤ گے اور یہاں سے ایئر پورٹ ساتھ چلو گے۔ اس وقت سے میری گاڑی تمہارے پاس رہے گی۔ پرسوں تک تم مونا کو لندن کی سیر کراتے رہو۔“

کامران نے کہا۔ ”میرے پاس میں تم بھی ساتھ رہو گے۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”کوئی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے درمیان میرا کسی اور کا سایہ بھی پڑے۔ تم دونوں کو پرسوں تک بالکل تنہا رہنا چاہئے۔ مونا کی روانگی سے پہلے دونوں میرے پاس چلے آؤ۔ ہم کہیں رات کا کھانا کھائیں گے پھر مونا کو ایئر پورٹ لے جائیں گے۔“

”تم پیار ہو۔ کہیں اور جا کر کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہمیں کھانے کا انتظام کر سکتے ہو۔“

مراد نے مونا کو دیکھ کر پھر کہل "یہ چلی بار میرے گھر آئی تو میں نے دھوکا دینا چاہا۔ اس کی کافی میں خوب آور دوا ڈالنے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا کہ جہاں دھوکا دے چکا ہوں وہاں پھر مونا کو دھوکا کھائے کا شبہ ہو۔"

مونا نے کہل "ایسا نہ کہو۔ اب میں تم پر شبہ نہیں کروں گی۔ کافی ٹھیک کتے ہیں تم بیمار ہو۔ ہمیں دُور کے لئے دوسری جگہ نہیں چاہئے۔ تم یہیں سادگی سے کچھ کھائے کا انتظام کرو۔"

"انتظام دو طرح سے ہو سکتے ہیں۔ یا تو کسی ہوٹل سے کھانا منگوا لیا جائے یا کسی باورچی کی خدمات حاصل کی جائیں۔ کامران! اگر ہم بھت آہنی سرلا دیوی کی خدمات حاصل کریں تو کیا رہے گا؟"

"ہاں! سرلا دیوی بہترین ڈشیں تیار کرتی ہیں۔ میں ایک بار ان کے ہاتھوں کا پکوان کھا چکا ہوں۔ وہی مناسب رہیں گی۔"

مونا نے کہل "مسز مراد! کل صبح میں ایک ایسا قدم اٹھا رہی ہوں جس کے بعد ہم تینوں کو قانون کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔"

"میں نہیں سمجھا؟"

کامران نے کہل "میں سمجھا ہوں۔ مونا اخبارات کے ذریعے یہ بیان شائع کر رہی ہے کہ یہ امیگریشن قوانین کے خلاف آئی ہے۔ شوہر کوئی ہے، حوالہ کسی اور کا ہے۔"

مراد نے کہل "اوہ گاڈ! اس طرح مجھے جیل ہو جائے گی۔ مونا کو بھی حراست میں لے لیا جائے گا آخر اس انکشاف کی ضرورت کیا ہے؟"

"میں اس کے جواب میں بہت کچھ کہہ سکتی ہوں۔ صرف اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ ہمیں امیگریشن کے موجودہ قوانین سے شکایت ہے۔ ہم ان قوانین میں تبدیلی لانا چاہتے ہیں۔ یہ کوشش اچھی ہے لیکن موجودہ قوانین سے کھینچے رہنے کی کوشش نہایت ہی غلط ہے۔ لہذا جو بات غلط ہے اس کا اعتراف کرنا چاہئے اور یہ ثابت کرنا چاہئے کہ شریف لوگ مجبور ہو کر قانون سے کھینچے ہیں پھر ان کا ضمیر انہیں غلامت کرتا ہے اور وہ زیادہ

عرسے ایسا نہیں کر سکتے۔ قانون کی پلاستیکی کو تسلیم کرتے ہیں۔ خواہ وہ قانون ہمارے ہی خلاف کیوں نہ ہو۔ جب تک وہ نافذ ہے اس کا احترام کرنا اس پر عمل کرنا ہمارا فرض ہے۔ اس کی تبدیلی لانے کے لئے دوسرے مناسب رستے اختیار کئے جانے چاہئیں۔"

مراد یہ سننے ہی پہنے لگا۔ پھر ہنسنے ہی بہتر پریٹ گیا۔ وہ دونوں اسے قیج سے دیکھ رہے تھے۔ اس نے کہل "مجھے حیرانی سے نہ دیکھو۔ میں اس بات پر ہنس رہا ہوں کہ میری طرف سے ہونے والی الوداعی پارٹی تھی۔ اب ہم جیل کا کھانا کھائیں گے، ہاں اگر زندگی رہی، مقدمہ جیت کے اور قانون نے ہمیں معاف کر دیا اور ہم واپس آئے تو میری دعوت کو نہ بھولنا۔ الوداعی پارٹی صرف میری طرف سے ضرور رہے گی اور تم میرے ساتھ کھانا کھانے کے بعد ہی یہاں سے پاکستان واپس جاؤ گی۔"

مونا نے مسکراتے ہوئے کہل "کون مجھے یا تمہیں جیل میں ڈالے گا۔ اگر خلا کار ایک دو یا دس ہوں یا سو ہوں تب انہیں جیلوں میں ٹھونسا جا سکتا ہے لیکن ہزار ہوں تو انہیں کتنی جیلوں میں ٹھونسا جائے گا کتنوں کو سزائیں دی جائیں گی؟"

مراد نے حیرانی سے پوچھا۔ "تم کیا کہنا چاہتی ہو؟ کیا ہمارے علاوہ بھی کچھ لوگ ہیں؟"

"کچھ نہیں، ہزاروں ہیں۔ انگلینڈ میں تقریباً پچاس ساٹھ ہزار ایشیائی باشندے ہیں جو امیگریشن قوانین کے باعث سخت پریشانی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض غیر قانونی زندگی گزار رہے ہیں لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو قانون کا احترام کرتے ہیں اور وہی قانون انہیں طرح طرح کے مصائب میں مبتلا رکھتا ہے۔ کل لندن سے شائع ہونے والے بیشتر اخبارات میں اس موضوع کے متعلق ایسے دھاکہ خیز انکشافات ہوں گے جو دنیا والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیں گے۔"

مراد اس کی بات سن رہا تھا اور سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ ہوائی قلعے بنا رہی ہے؟

خیالی محل بنانے کے دوران دلائل مستحکم ہوں تو ایک دن سچ ایک مستحکم محل تعمیر ہو جاتا ہے۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ اگر کسی قانون کی مخالفت میں دو چار یا دس یا

تھی۔ وہ وہاں سے چلا ہوا کمرے تک پہنچا تو اچانک تھک گیا۔ کمزوری محسوس کرنے لگا۔ وہ جو توانائی بخشنے والی تھی، وہ جا چکی تھی۔

وہ بستر کے سرے پر آکر بیٹھ گیا۔ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ جب رابطہ قائم ہو گیا تو اس نے کلمہ ”ہیلو آئی؟“

دوسری طرف سے ایک نسوانی ہنسی سنائی دی۔ ”ہاں“ میں تمہاری یونیورسل آئی ہوں۔ تمہاری آواز فون پر بھی پہچان لیتی ہوں۔ آج میں کیسے یاد آگئی؟“

”دعا مانگتا ہوں تو خدا یاد آتا ہے، دعا مانگنا ہوا تو تم یاد آتی ہو۔“

”کیا چاہتے ہو؟“

”فورا پر کہہ نہیں سکتا، تمہارے پاس آ نہیں سکتا۔ بہت بیمار ہوں۔ اتنا کمزور ہو گیا ہوں کہ اپنے کالج سے باہر نہیں نکل سکتا۔ کیا تم تمہوزی دیر کے لئے آ سکتی ہو؟“

”اچھی بات ہے، آ جاؤں گی۔“

”آ جاؤں گی، کہہ رہی ہوں یا آج آؤں گی، کہہ رہی ہو؟“

”دونوں باتوں میں فرق کیا ہوا؟“

”آ جاؤں گی، کا مطلب ہوا کہ ضروری نہیں ہے آج آؤ گی۔ ہو سکتا ہے کل آؤ گی۔ ہو سکتا ہے برسوں آؤ گی۔“

”ارے ہاں تو بات پکڑ لیتے ہو۔ میں آج آؤں گی۔ مجھے کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ تم نہ بلاتے تب بھی میں آئی۔ بس سمجھ لو، آ رہی ہوں۔“

لندن میں جو لوگ سرلا دیوی کو جانتے ہیں وہ اسے یونیورسل آئی یا جگ آئی کہتے ہیں۔ جگ آئی نے ایک دفتر قائم کیا تھا۔ اس کے ذریعہ وہ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتی تھی۔ اس طرح کہ کسی شخص کو گھر میں ملازموں کی ضرورت ہے یا بیوی کی زچگی اور کچھ بھال کے لئے دایہ کی ضرورت ہے، بچے کی لمبے آیا چاہئے یا گھریلو انتظامات کے لئے گورنس کی ضرورت ہے تو یہ تمام ضرورتیں جگ آئی پوری کرتی تھی۔ کم سن لڑکیوں سے لے کر عمر رسیدہ عورتیں تک فراہم کرتی تھی۔ بالکل صاف ستھرا کاروبار تھا۔ کوئی اسے الزام نہیں دے سکتا تھا۔ وہ تو ایسپلانٹس ۱۔ سمجھنے کے طور پر ضرورت مندوں

سوں کو انہیں گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ انہیں زیادہ سے زیادہ باقی کما جاسکتا ہے لیکن اسی قانون کی مخالفت میں اگر لوگ ہزاروں کی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوں تو اس طرح ایک منظم تحریک عمل میں آتی ہے اور قانون سے ہونے والی وہ مخالفت دنیا والوں کو سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

وہ بڑی دیر تک بیٹے بولتے رہے۔ پھر مونا نے کلمہ ”مجھے گیارہ بجے ڈیوٹی پر جانا ہے۔ اس سے پہلے ٹیکسٹا وغیرہ سے کل کے پروگرام کے متعلق ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ہم پھر آئیں گے۔“

مرا نے اپنے ٹیکے کے نیچے سے کار کی چابی نکال کر کامران کی طرف بڑھاتے ہوئے کلمہ ”صبرے پاس اب نہ آؤ۔ پرسوں شام چھ بجے ملاقات ہو گئی۔ ہم ایک ساتھ وقت گزاریں گے۔ ایک ساتھ کھائیں گے اور پھر ۱۰ تا کو ایئر پورٹ لے جائیں گے۔“

کامران نے اس کی کار کے لئے اس کی دوست نوازی کے لئے اس سے سمجھوتہ کرنے والی ذہانت کے لئے شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصتی مصافحہ کیا۔ مونا نے مسکرا کر اسے دیکھ کر پھر دور ہی سے سلام کیا۔ مرا نے دل ہی دل میں کلمہ ”عورت سے خواہ کتنا ہی کم لعل جاؤ کجبت دور ہی سے سلام کرتی ہے۔“

وہ دروازے تک انہیں چھوڑنے کے لئے آیا۔ دونوں اس کی کار میں جا کر بیٹھ رہے تھے۔ اس وقت مونا کی جگہ شینہ اور کامران کی جگہ اس کا بڑا بھائی نظر آ رہا تھا۔ وہ کئی بار چھپ کر دیکھ چکا تھا، شینہ اسی طرح اس کے بھائی جان کے ساتھ کار میں جاتی تھی، اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ پتا نہیں کتنے قصے لگتی ہو گی۔ کتنی محبت ہماری باتیں کرتی ہو گی۔ وہی باتیں جو شادی سے پہلے وہ اس سے کر چکی تھی۔ وہ دانت پیس کر بڑبڑایا۔ ”بے وفا“ بدزات.....

مونا کار میں اگلی سیٹ پر بیٹھ کر چلی گئی۔ کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازے کو بند کر دیا۔ تب احساس ہوا کہ اس میں پہلے جیسی کمزوری نہیں رہی۔ مونا کے آجانے سے ڈوبنے کو ٹھیکے کا سہارا مل گیا تھا اسے زندگی کی نئی توانائی مل گئی

کے لئے ملازمین فراہم کرتی تھی۔

اگرچہ لندن میں معزز اور پراسن شہروں کی اکثریت ہے اس کے باوجود یہ شہر گناہوں اور جرائم کی بین الاقوامی منڈی ہے۔ یہاں ایسے عجیب و غریب گناہ اور جرائم ہوتے ہیں جنہیں دیکھ کر یا جن کے متعلق سن کر حیرت ہوتی ہے کہ انسان صرف سائنس اور ٹیکنالوجی میں نہیں بلکہ گناہوں اور جرائم میں بھی نت نئے تجربے کرتا جا رہا ہے۔

جب آئی سلاویوی جرائم کے جس شعبے میں مہارت رکھتی تھی وہ تھا خودکشی کا شعبہ۔ اگر کوئی دنیا سے تیار ہو گیا ہو 'مرنا چاہتا ہو اور مرنے سے ڈرتا بھی ہو تو جب آئی اس کی موت کو آجھان بنا دیتی تھی..... مرنے ٹھگڑنے والا کہتا تھا۔ "وہ چاقو سے نہیں مرے گا" بتدق کی گولی سے نہیں مرے گا" زہر سے نہیں مرے گا" پھنڈے سے نہیں لٹکے گا مگر آرام سے مرنا چاہتا ہے۔"

جب آئی بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ بھیر کر پچکارتے ہوئے کہتی تھی۔ "فکر نہ کرو۔ بس اتنا بتا دو کہیں مرنا چاہتے ہو؟ کسی ہرے بھرے گلشن میں یا سمندر کے ساحل پر؟ پھولوں کی تاج پر یا ریشمی ہانپوں میں؟ یا پھر میں کی آغوش میں؟ جہاں بھی مرنا چاہو گے موت بڑی سہولت سے بڑے پیار سے آئے گی۔"

جب آئی سے مراد کی دوستی ان دنوں ہوئی تھی جب وہ ٹھینے کی بے وفائی کے باعث ذہنی انتشار میں مبتلا رہتا تھا۔ اکثر غصے کی حالت میں کہتا تھا کہ ٹھینے کو مار ڈالے گا یا خود مر جائے گا۔ کامران اسے سمجھاتا رہا تھا۔ کامران کے علاوہ بھی مراد کا ایک شناسا تھا۔ اس نے اسے جب آئی سے یہ کہہ کر متعارف کرایا۔ "آئی بڑی صلاحیتوں کی مالک ہیں۔ تم جیتنا چاہو گے تو یہ تمہاری زندگی کو ٹھینے سے زیادہ حسین بنا دیں گی۔ مرنا چاہو گے تو موت کو بھی آسان بنا سکتی ہیں۔"

کامران جب آئی سلاویوی کے متعلق اتنی گہرائی سے نہیں جانتا تھا۔ بس اتنا ہی معلوم تھا کہ وہ ضرورت مند عورتوں اور مردوں کے لئے ملازمتوں کا انتظام کرتی ہے اور کہیں جرحہ ڈے یا میریج پارٹی ہو یا کسی طرح کی تقریبات ہوں تو بڑی خوش اسلوبی سے ان تقریبات کا اہتمام کرتی ہے اور اس سلسلے میں معقول معاوضہ لیتی ہے۔

اگر کامران کو جب آئی کی اصلیت کا پتا چلتا تو وہ کبھی مراد کو اس سے قریب نہ ہونے دیتا۔ مراد بھی جانتا تھا کہ کامران جب آئی کے ذریعے ٹھینے سے انتقام لینے والی بات کبھی گوارا نہیں کرے گا۔ بہر حال آئی نے اس سے کہا تھا۔ "مراد! تم موجودہ حالات پر اچھی طرح غور کرو۔ تمہیں فائدہ کس طرح پہنچے گا۔ خودکشی کرنا چاہو گے تو بیٹھ کے لئے دنیا سے چلے جاؤ گے۔ میں تمہیں منع نہیں کروں گی۔ میرا تو کام یہی ہے۔ میں معقول معاوضہ لے کر تمہیں بڑے آرام سے دوسری دنیا میں پہنچا دوں گی لیکن تمہارا بھائی اس دنیا سے اٹھ جائے گا تو تمہیں دو ہزار فائدہ ہو گا۔ ایک تو تمام کاروبار اور جائیداد کے مالک بن جاؤ گے، دوسرے ہاری ہوئی ٹھینے کو جیت لو گے۔"

لیکن مراد اپنے بھائی جان کے خلاف کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس کے انتقام کا مرکز ٹھینہ تھی۔ اکثر یہی ہوتا ہے، مرد سونے چاندی کی چمک دکھا کر عورت کو جیت لے تو سوال نہیں کیا جاتا کہ تم نے بے وفائی کی طرح کیوں ڈالی؟ عورت سے پوچھا جاتا ہے، "تم نے بے وفائی کیوں کی؟ حالانکہ دونوں طرف سے پیش قدمی ہوتی ہے۔ اسے ٹھینے کی پیش قدمی پر غصہ آ رہا تھا اور وہ اسی سے انتقام لینا چاہتا تھا۔

انسان چاہتا کچھ ہے لیکن اس کے لاشعور میں کوئی اور خیال پکتا رہتا ہے۔ وہ ٹھینے کو ختم کر دینا چاہتا تھا۔ اس کا لگا اپنے ہاتھوں سے دلوچنا چاہتا تھا اور اگر نہ دلوچ سکے تو خود مرنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکا۔ اس کے لاشعور میں یہ خیال پک رہا تھا کہ شاید ٹھینے اس کی طرف بھر جائے۔ بھائی جان کی موت کے بعد یہ خیال مستحکم ہو گیا۔ ٹھینے بھی اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگی تھی جیسے ڈوبتے ہوئے سہارا چاہتی ہو۔

ایسے ہی وقت وہ اتفاقاً اس سے نفرت کرنے لگا۔ اسے طعنے دینے لگا۔ دھکارنے لگا لیکن اندر جو محبت تھی وہ بہت مستحکم تھی۔ وہ ٹھینے کو چاہتا تھا۔ دل و جان سے چاہتا تھا پھر اسے اپنا لینا چاہتا تھا لیکن وہ ایک بچے کی ماں بننے کا غرور حاصل کرتے ہوئے مر گئی۔ نہ بچہ رہا نہ وہ رہی۔

یہ محرومی تھی۔ انتقام سے محرومی تھی۔ وہ نہ تو انتقام لے سکا نہ اسے اپنا سکا۔ اسے احساس شکست تھا کہ ایک عورت اسے مات دے کر چلی گئی اور وہ اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔

جبک آنٹی سرلا دیوی اپنے وعدے کے مطابق آگئی۔ اس نے مراد کو دیکھتے ہی حیرانی سے کہل۔ ”اوہ مائی گڈنس“ یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تم تو مرنے سے پہلے ہی مر رہے ہو اور جب مرنی رہے ہو تو پھر مجھے کیوں بلایا ہے؟ اچھا سمجھ گئی۔ عورتوں کو دیکھتے ہی بعض مردوں کی جان نکل جاتی ہے شاید تم نے مجھے دیکھنے کے لئے بلایا ہے۔“

وہ بستر کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ مراد نے کہل۔ ”میں ایک دوسری عورت کو خیشہ کے روپ میں دیکھ رہا ہوں۔ تم درست کہتی ہو، کسی کو دیکھ لو اور وہ پسند آجائے تو اس کے لئے جان جاتی ہے مگر آدمی جاتی ہے۔ آدمی انکی رہتی ہے۔ یہی پھانس نکالنے کے لئے تمہیں یاد کیا ہے۔“

”بڑے آرام سے نکال دوں گی۔ قصہ کیا ہے؟“

وہ قصہ سنائے لگ۔ بوڑھی خراثن سن رہی تھی اور طنز بہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے کہل۔ ”جس طرح تم مونا کے متعلق بتا رہے ہو، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خیشہ تمہیں مار نہ سکی، یہ مار ڈالے گی۔ کیا میں یہ سمجھ لوں کہ پرسوں اس کے جاتے ہی تم خودکشی کرنا چاہو گے اور اس کے لئے میری ضرورت ہے؟“

”میں اسے جانے نہیں دوں گا۔“

”کیسے روکو گے؟“

”موت روکے گی، میں اسے کسی صورت میں جانے نہیں دوں گا۔ وہ میرے ساتھ زندہ رہتی تو کیا ہی اچھا ہوتا لیکن اس کی ضد نے سمجھا دیا ہے کہ اسے مار کر ہی جانے سے روک سکتا ہوں۔ لہذا وہ میرے گھر میں، میرے ساتھ جان دے گی۔“

”اور اس کا شوہر کامران؟“

”گیہوں کے ساتھ کھن بھی پس جاتا ہے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ مرے گا۔“

”یعنی تین جائیں ایک ساتھ؟ ایک وقت میں جائیں گی۔“

”ہاں، اور اس کا معاوضہ بھی تمہیں گنا لے گا۔“

”معاوضہ چھ گنا ہو گا۔“

”وہ کیوں؟“

”یہ خیشہ کے وقت تمہیں بتا چکی ہوں۔ میں قاتل نہیں ہوں، کسی کو جبرا نہیں مارتی۔ اس کی مرضی ہو تو خودکشی کے سلسلے میں مشکل آسان کرتی ہوں۔ خیشہ کے کیس میں، میں نے کہا تھا، اگر اپنے بھائی بان کو یا خیشہ کو مارنا چاہتے ہو تو میں کسی دوسرے سے یہ کام لوں گی۔ اس کا معاوضہ دو گنا ہو گا۔ ہاں اگر خودکشی کرنا چاہو تو تمہاری مشکل آسان کرنے کے لئے کم سے کم معاوضہ لے کر یہ کام کر سکتی ہوں۔“

وہ چپ چاپ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ بوڑھی سرلا دیوی نے کہل۔ ”موجودہ کیس میں بھی تین افراد ہیں جن میں سے ایک تم ہو، جان بوجھ کر اپنے آپ کو مارنا چاہتے ہو۔ اس کا مطلب ہے خودکشی کرنا چاہتے ہو، میں تمہاری مشکل آسان کر سکتی ہوں۔ یہ میرا پنا کیس ہے لیکن کامران اور مونا کو تو جبرا ہلاک کرنا ہو گا۔ ان کی نادانستی میں انہیں ملک عدم پہنچانا ہو گا۔ یہ کیس میرا نہیں میرے بزنس پارٹنر کا ہے میں اس کے ذریعے یہ کام کرا سکتی ہوں۔“

”میں اس سلسلے میں کسی کو راز دار بنانا نہیں چاہتا۔ صرف تم یہ کام کرو گی اور اس کا معاوضہ چھ گنا لے گا۔“

وہ سوچنے لگی۔ مراد نے پوچھا۔ ”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے۔“

وہ بولی۔ ”اپنے اپنے مزاج کی بات ہے۔ میں کبھی کسی کی مرضی کے بغیر اسے ہلاک نہیں کرتی۔ یہ کام قاتلوں کا جادوں کا ہوتا ہے۔ جادوں کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے۔ اگر وہ موت کی سزا پانے والے مجرم کو پھانسی پر چڑھاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اپنے کسی دشمن کو بھی پھانسی پر چڑھا سکتے ہیں۔ وہ قاتلانہ مزاج نہیں رکھتے صرف اپنے پیسے کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اسی طرح میں اپنے کسی دشمن کو ہلاک کرنے کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتی۔ یہ میرا مزاج ہی نہیں ہے۔ ہاں کسی کی مشکل آسان کرنا ہو، وہ بے چارہ مرنا چاہتا ہو اور مرنے سے ڈرتا ہو یا کوئی دشواری پیش آتی ہو تو میں ان دشواریوں کو ختم کر دیتی ہوں۔ اس کے لئے آسانیاں فراہم کر دیتی ہوں۔“

”یعنی تم میرا کام نہیں کرو گی۔“

”میں کروں یا میرا پارٹنر کرے، ایک ہی بات ہے۔“

”میری خودکشی سے تمہیں کتنا منافع حاصل ہو گا؟“

”تمہارا بینک بیلنس کیا ہے؟“

”عورت اپنی صحیح عمر اور مرد انا صحیح بینک بیلنس کسی کو نہیں بتاتا۔ تاہم مرنا ہی

ٹھیکرا تو بتا دیتا ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں اس وقت بارہ ہزار پونڈ ہیں۔“

”بینک میں پچاس پونڈ چھوڑ دو۔ باقی لے آؤ۔“

”میں سودا نہیں کروں گا کیونکہ میرے بعد یہ رقم بینک میں پڑی رہے گی۔

تمہارے ہی کام آ جائے۔ میرا کیا جائے گا؟ کل بارہ بیسے تک تمہاری مطلوبہ رقم تمہیں مل جائے گی۔ اور کچھ؟“

”مونا اور کامران کون سی ڈش زیادہ پسند کرتے ہیں۔“

”کامران تو وہی کھائے گا جو مونا کھائے گی اور مونا کو سوٹ ڈش پسند ہے۔“

”کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو؟“

”وہ میرے ساتھ ایک بار بیچ اور دو بار ڈنر کھا چکی ہے ہر بار اس نے کھانے کے

بعد بڑے شوق سے سوٹ ڈش کھائی ہے لیکن تم جو میٹھی ڈش تیار کرو گی اس میں

کڑواہٹ لازمی ہو گی۔“

”ہرگز نہیں، بلکہ سی کڑواہٹ ایسی ہو گی جو بھلی لگے گی۔ تم خود کھاؤ گے اور

اعتراف کرو گے کہ میٹھا ذرا سی کو کہتے ہیں۔ جو انسانی جسم میں یا اس کے مزاج میں تحلیل

ہو جائے۔“

”میں یہی چاہتا ہوں۔ مونا اور کامران کو شبہ نہیں ہونا چاہئے۔“

”نہیں ہو گا۔ اب میرے تحفظ کی بات کرو۔ جہاں خودکشی کا کیس ہوتا ہے وہاں

میں اپنی موجودگی کا نشان تک رہنے نہیں دیتی۔ یہ میرا پسلا کیس ہے، میں پرسوں تمہارے

ڈنر آف ڈیٹھ (موت کا عشاء) میں موجود ہوں گی۔ یہاں کے لوگ اور پڑوسی مجھے دیکھ

سکتے ہیں۔ لہذا میرے سامنے ابھی خودکشی کا اعتراف نامہ لکھو۔“

”کیا لکھوں؟“ وہ سر ہالے والی میز کی دراز کھول کر اپنا لیر پیڈ اور قلم نکالنے لگا۔

جگ اپنی سرلا دیوی نے مشورہ دیا۔ ”پہلے تو مختصر آکام عبت کی روداد لکھو۔ پھر

”بات ایک نہیں ہے۔ میں نے پرسوں شام انہیں کھانے پر بلایا ہے۔ کھانے کا

اہتمام تم کرو گی۔ تمہارا پارٹنر قتل کرنا ہو گا لیکن تمہاری طرح ڈشیں تیار نہیں کر سکتا۔“

”تمہاری پلاننگ کیا ہے؟“

”میں نے زہر منگوایا ہے۔ تم اسے سوٹ ڈش میں ملا کر ہم تینوں کو کھلاؤ گی۔“

وہ تعجب سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ جب تم نے زہر منگوایا

لیا ہے، یہاں انہیں بلا کر کھلا سکتے ہو تو زہر بھی ملا سکتے ہو۔“

”یہی نہیں کر سکتا۔ تمہیں یہ نہیں بتایا ہے کہ موتا جب پہلی بار میرے ہاں آئی تو

میں نے اس کی کافی میں خواب آور دو ملائے کی کو مشق کی تھی لیکن اس نے دیکھ لیا تھا۔

میری چال کو سمجھ گئی تھی۔ اس بار بھی مجھ سے بھول چوک ہو سکتی ہے۔ میں نہیں چاہتا

کہ ان کے سامنے کچن میں جاؤں۔ ان کی موجودگی میں کھانے کو ہاتھ لگاؤں گا۔ جو کرو گی،

تم کرو گی۔“

وہ چپ رہی۔ مراد نے کہا۔ ”پھر سوچنے لگیں۔“

”پلیز مجھے سوچنے کی مہلت دو۔“

اس نے اپنے پرس میں سے سگریٹ کا پینک نکالا۔ اس میں سے ایک سگریٹ

سلا گیا۔ اس کا ایک سش لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹک گئی۔ آہستہ آہستہ ڈھواں

چھوڑنے لگی۔ مراد بیزار ہو رہا تھا۔ بے چین ہو رہا تھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ”جب مرنا ہی

ہو تو بے چینی کسی؟ اطمینان رکھو۔ میں ہی تمہارا کام تمام کروں گی مگر یہ بتاؤ، یہاں

تمہارا اچھا خاصا کاروبار ہے تم نے خوب دولت کمائی ہے، تمہارے بعد ان کا کیا ہو گا؟“

”میں دنیا سے بھگانا چاہتا ہوں، دولت اور کاروبار کی پروا کیا کروں گا۔“

وہ ہنسنے لگی پھر ہنستی چلی گئی۔ مراد اسے سوائے نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے

کہا۔ ”میں کام ایسا کرتی ہوں کہ مجھ پر قتل کا یا جبر کا الزام نہ آئے۔ ایک طرح سے

تمہارے جیسے لوگوں کی مشکل آسان کر کے نکلی کماتی ہوں۔ خوب سوچ سمجھ کر کسی کی خود

کشی کے معاملے میں ہاتھ ڈالتی ہوں۔ اس میں میرا اتنا فائدہ ہے جتنا کسی قاتل اور چھوٹے

مومنے اسلحہ کو بھی نہیں ہوتا۔“

اپنے مزاج کے متعلق لکھو کہ کسی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور کسی کے ساتھ مرنے کا عزم کا کرچے ہو۔ کیوں مر رہے ہو؟ خود کشی کی تحریک کیوں پیدا ہوئی؟ پھر تمہیں خود کشی پر کس نے مجبور کیا؟ اگر مجبور نہیں کیا تو خود کشی کے ذمہ دار تم خود ہو یا موتا بالواسطہ ہے اور وہ بھی تمہارے ساتھ مر رہی ہے۔“

اس نے لیٹر پیڑ کو کھول کر اپنے سامنے رکھا۔ قلم کو منبھلا پھر سوچ سوچ کر انگریزی زبان میں لکھنے لگا۔

”میں مسمی کارمن مرتضیٰ سابقہ نام رضا مراد ولد شاد مراد پوری طرح ہوش و حواس میں رہ کر یہ اعتراف نامہ لکھ رہا ہوں تاکہ میری خود کشی کا الزام کسی اور پر نہ آئے۔

اگرچہ میں نے ایک دوست سے دوستی نبھانے کی خاطر اپنا نام تبدیل کیا۔ رضا مراد سے کارمن مرتضیٰ بن گیا۔ تاہم اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک ٹاکام اور نامراد انسان ہوں۔ اس لئے میرا نام رضا مراد نہیں ہونا چاہئے۔ میں نے پہلے شینہ نامی ایک حسین لڑکی کو چاہا لیکن وہ بے وفا تھی۔ دوسری بار میں نے موتا کو دیکھا تو مجھے وہ ساری باتیں نظر آئیں جو شینہ میں تھیں۔ یہ الفاظ دیگر موتا شینہ کی کسی پوری کر سکتی تھی۔ اس لئے میں نے اسے دل و جان سے اپنانے کی کوشش کی۔ کبھی محبت سے، کبھی غصے سے، کبھی جبر سے، کبھی صبر سے، لیکن میری کوئی کوشش بار آور نہیں ہو رہی ہے میں ٹاکام ہو رہا ہوں میں پہلے بھی نامراد تھا اب بھی نامراد ہوں۔

مجھے اس بات کا دکھ ہے کہ شینہ کی طرح موتا دولت کی چمک دکھ کی طرف مائل کیوں نہ ہوئی۔ اگر مائل ہو جاتی تو میں عورت کی لالچی طبیعت اور اس کی بے وفائی پر اسے خوب گالیاں دے کر آرام سے زندہ رہتا۔ اصل صدمہ اسی بات کا ہے شینہ جو بے وفائی وہ بھی میری نہ ہو سکی موتا جو وفا کر سکتی ہے وہ بھی میری نہیں ہو سکتی۔ میں نے بار بار خوابوں میں دیکھا۔ خیالوں میں دیکھا۔ میرے تصور میں بار بار شینہ آئی اور طنزیہ انداز میں مسکرا کر کہتی رہی، میں موتا کے روپ میں آئی ہوں۔ دوسری بار تمہیں گلست دے رہی ہوں۔

اگر شینہ خواب ہے، خیال ہے تو پھر موتا مجھے گلست کیوں دے رہی ہے۔ وہ میری کیوں نہیں بن جاتی۔ وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے یعنی مجھ سے اتنی نفرت ہے کہ اپنے شوہر کو بھی میری وجہ سے چھوڑ رہی ہے۔ وہ میرے شرمسار رہتا نہیں چاہتی۔ میرے گھر میں رہنا نہیں چاہتی اور میرے دل میں تو رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ میں اسے جانے نہیں دوں گا۔ وہ میرے ساتھ جی نہیں سکتی میرے ساتھ مروت سکتی ہے۔

میں اس سلسلے میں ایک دعوت کا، ام کر رہا ہوں۔ میں نے موتا اور کارمن کو ذرا پر بلایا ہے۔ وہ آئیں گے۔ میرے ساتھ بیٹھ کر کھائیں گے۔ میں ان کی لاعلمی میں انہیں زہریلی سوئٹ ڈش کھلاؤں گا۔ ان کے ساتھ خود بھی کھلاؤں گا۔

نفرت کی جنگ ہو تو ہم مقابل کو مار کر زندہ رہتے ہیں۔ محبت کی جنگ میں کوئی مقابل نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو اس کے ساتھ خود مرنا پسند کرتے ہیں۔ میں شینہ کے بعد پاگلوں جیسی زندگی گزارتا رہا۔ موتا کے بعد پاگل خانے جانا گوارا نہیں کروں گا۔ اس سے بہتر موت ہے لہذا میں موتا کے ساتھ جان دینے جا رہا ہوں۔

میرے بعد میرے کاروبار کا کیا ہو گا۔ میں نہیں جانتا۔ مرنے والے کو اس سے کیا غرض کہ اس کے بعد دنیا کا کیا ہو گا۔ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا یہ اعتراف نامہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں پوری طرح ہوش و حواس میں ہوں۔ میری خود کشی کی ذمہ داری کسی پر عائد نہ کی جائے۔ میں خود اس کا ذمہ دار ہوں۔ فقط بقلم خود کارمن مرتضیٰ سابقہ رضا مراد ولد شاد مراد۔“

اس نے لکھنے کے بعد اس کاغذ کو پیڑ میں سے الگ کیا۔ پھر جگ آٹنی کی طرف بڑھا۔ دیبا۔ سرلا دیوی اسے پڑھنے لگی۔ پڑھنے کے بعد مطمئن ہو کر سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اسے اپنے پاس رکھوں گی۔ اس کی ایک اور نقل تیار کروں گی۔ نقل ہمیشہ میرے پاس رہے گی۔ تمہاری خود کشی کے بعد یہ تحریر تمہاری جیب میں چھپ جائے گی۔ تاکہ پولیس والے تلاشی لیں۔ تمہارے بارے میں معلوم کرنا چاہیں تو یہ اعتراف نامہ تمہاری جیب سے برآمد ہو سکے۔“

وہ اعتراف نامے کو اپنے پرس میں رکھنے لگی۔ اسی وقت کل تیل کی آواز سنائی دی۔ جگ آئی نے چونک کر ادھر دیکھنا پھر پوچھا۔ ”تمہارے پاس کون آ سکتا ہے۔ کیا ڈاکٹر؟“

”ہو سکتا ہے ڈاکٹر جان بڑھو۔ میرا ملازم بھی ہو سکتا ہے۔“

وہ اٹھ کر کمرے سے باہر گئی۔ پھر بیرونی دروازے کو کھول دیا۔ وہاں شیدے کھڑا ہوا تھا۔ کسی اجنبی عورت کو دیکھ کر ذرا گھبرا گیا۔ جیسے چوری کرنا ہوا بھلا گیا ہو۔ بوڑھی آئی نے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

”جی میں صاحب کا ملازم ہوں۔“

”اندرا جاؤ۔“

وہ جگ آئی کے ساتھ مراد کے بیڈ روم میں آیا۔ مراد نے پوچھا۔ ”کیا تم نے میرا کام کیا ہے؟“

شیدے جگ آئی کو دیکھ کر ہچکچانے لگا۔ مراد نے کہا۔ ”یہ خاتون میری راز دار ہیں۔ ان سے نہ چھاؤ۔ زہر لائے ہو تو مجھے دے دو۔“

اس نے ہچکچاتے ہوئے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پھر ایک چھوٹی سی شیشی نکالی۔ اس شیشی کے لیبل پر ایک انسانی کھوپڑی بنی ہوئی تھی۔ کھوپڑی کے نیچے دو انسانی ہڈیاں ایک دوسرے کو کراس کر رہی تھیں۔ نیچے لکھا ہوا تھا۔ ”پوڑنا (زہرا)“

شیدے نے کہا۔ ”جو کچھ میں کر رہا ہوں اس پر میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے۔

اس سے پہلے کہ آپ اسے استعمال کریں میں یہاں سے جانے کا انتظام کر چکا ہوں۔ میرا ایک دوست کل صبح کی فلائٹ سے پاکستان جانے والا تھا۔ میں نے اس سے گزرا کر اکتھا کی تو وہ اپنا ٹکٹ مجھے دینے پر راضی ہو گیا ہے۔ اگر آپ مجھے رقم عنایت کریں تو میں ٹکٹ اسی سے لے لوں گا اور کل یہاں سے چلا جاؤں گا۔“

مراد نے کئیے کے نیچے سے چابیوں کا گچھا نکالا پھر ایک چابی کو دکھاتے ہوئے کہا۔

”اس نے الماری کھولی۔“

اس نے حکم کی قیاس کی۔ چابیوں لے کر گیا۔ پھر اس نے الماری کھولی۔ مراد نے

کہا۔ ”اب اس کی چابی دراز کھولو۔“

اس نے دوسری چابی سے اس دراز کو کھولا۔ وہاں نوٹوں کی کچھ گڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مراد نے کہا۔ ”اس میں سے تین ہزار پونڈ نکال لو۔“

اس نے ہدایت کے مطابق اپنے لئے رقم نکالی۔ دراز اور الماری کو بند کیا پھر چابی واپس کر دی۔ مراد نے کہا۔ ”میں بھی یہی چاہتا تھا تم جلد سے جلد چلے جاؤ۔ یاد رکھو صبح تک کسی سے میرے بارے میں ذکر نہ کرو۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ہنک کسی کے کان میں پڑی اور مجھے معلوم ہو گیا تو میں بری طرح پیش آؤں گا۔“

اس نے دونوں کان پکڑ کر قسم کھائی کہ وہ اپنے سامنے سے اور گونگی دیواروں سے بھی نہیں کئے گا۔ چپ چاپ یہاں سے چلا جائے گا۔ پھر وہ چلا گیا۔

بوڑھی آئی نے اس کے جانے کے بعد دروازے کو اندر سے بند کیا۔ پھر بیڈ روم میں آکر پوچھا۔ ”تمہیں ایک ملازم کو راز دار بنانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”جب مجھے معلوم ہوا کہ صوبہ پاکستان جا رہی ہے تو میں بالکل اپ سیٹ ہو گیا۔ یوں ہاتھ پاؤں مارنے لگا جیسے ڈوب رہا ہوں۔ کسی کا سارا تلاش کر رہا ہوں۔ میرے سامنے یہی شیدے آیا۔ میں نے اس کا سارا لے لیا۔ ویسے یہ وفادار ہے۔ کسی سے کچھ نہیں کئے گا۔ چپ چاپ چلا جائے گا۔“

”کیا وفادار ملازم ایسے ہی تھوٹے ہیں کہ مالک کو مار ڈالنے کے لئے زہر لا کر دیں؟“

”وہ مجبور تھا۔ اس کی وفاداری اگرچہ میرے لئے ہے لیکن برسوں سے اپنی بیوی اور بچی سے بچھا رہا ہے۔ ان سے ملنے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ وہ جدائی کے اس مرحلے پر پہنچ گیا ہے جہاں انسان تمام پابندیوں کو توڑ کر جائز اور ناجائز قانونی اور غیر قانونی باتوں کو نظر انداز کر کے کسی بھی طرح اپنی محبتوں تک پہنچ جانا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنی بیوی تک پہنچنے کے لئے میرے لئے زہر لے آیا۔ انسان تمام تر فرشتہ نہیں ہو کہ اس میں کچھ خامیاں ہوں تو اسے معاف کر دینا چاہئے۔“

جگ آئی اچانک ہی فتنہ لگانے لگی۔ اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ”کیا بات ہو گی؟“

”جب ٹینے نے دولت کی خاطر بے وفائی کی تو اس وقت تم نے یہ نہیں سنا کہ وہ تمام تر فرشتہ یا حور صفت نہیں ہے اس نے ایک غلطی کی ہے اسے معاف کر دینا چاہیے لیکن نہیں انسان کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ ایک ہی غلطی پر کسی کو سزا دیتا ہے اور کسی کو معاف کر دیتا ہے۔“

مراد نے حیرانی سے کہا۔ ”تعب ہے‘ میں تمہیں اپنا تمام بینک بیلنس دے رہا ہوں اور تم مجھے طے دے رہی ہو۔ کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں ٹینے کی بے وفائی کو بھل جاؤں‘ زندہ رہوں‘ تم سے خود کشی کے سلسلے میں کوئی معاہدہ نہ کروں اور تمہیں ایک کوڑی نہ دوں۔“

”میں لالچی نہیں ہوں۔ اگر تم زندہ رہنا چاہو گے تو معاہدہ منسوخ ہو جائے گا۔ میں تمہارے بینک بیلنس سے ایک تھکا بھی نہیں لوں گی بلکہ تمہیں نئی زندگی کی مبارکباد دوں گی۔“

وہ غصے سے جھنجھلا کر بولا۔ ”تم مجھے نصیحت کر رہی ہو۔ کیا موت کو نصیحت کرنے سے روک سکتی ہو؟“

”کسی کو میں آنے سے روک سکتی ہوں نہ جانے سے۔ زندہ رہنے سے روک نہیں ہوں نہ مرنے سے۔ میں تو صرف اپنے اصول کی بات کر رہی ہوں۔ میں لالچ میں آکر کسی کو قتل نہیں کرتی۔ کوئی خود کشی کرنے والا میرا سہارا لیتا ہے تو میں اس کی مشکل آسان کرتی ہوں۔ تمہاری بھی مشکل آسان کروں گی لیکن پرسوں تک بڑا وقت ہے۔ اگر زندہ رہنے کا فیصلہ کرو تو مجھے اطلاع دے دینا۔ ورنہ میں تمہارے کام کے لئے حاضر ہو جاؤں گی اور کل بارہ بجے میری مطلوبہ رقم مجھ تک پہنچا دینا۔ میں جا رہی ہوں۔“

مراد ابھی تک ہاتھ میں وہ زہر کی شیشی پکڑے ہوئے تھا۔ جگ آئی نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیا اسے بھی ساتھ لے جاؤ گی؟“

”میں معلوم کروں گی کہ یہ کس نوعیت کا زہر ہے اور مٹھی دُش میں اس کی کتنی مقدار حل کرنی چاہیے۔“

اس نے شیشی کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اس منضی سی شیشی کے باہر زندگی تھی اور

اندر موت۔ ویسے حرام موت مرنے والا کسی لمحے بھی اسے کھول سکتا تھا لیکن موت کے لئے وہ پرسوں کھلنے والی تھی۔

جگ آئی نے اسے پرس میں رکھا۔ پھر مسکراتے ہوئے الوداعی انداز میں ہاتھ ملائے ہوئے رخصت ہو گئی۔

☆ ----- ☆ ----- ☆

فاروق رانہور صاحب کے ہاں پچھادوں لگ چلو مونا!

وہ سب کار میں بیٹھ گئے۔ مونا کو گیارہ بجے ڈیوٹی پر جانا تھا۔ اس وقت تک کامران کے ساتھ تنہائی نصیب ہو سکتی تھی۔ وہ سیر و تفریح کر سکتی تھی، اس کے ساتھ کہیں لکھا کھا سکتی تھی لیکن یہ وقت ایک اہم میٹنگ میں گزر گیا۔ وہ گیارہ بجے سے کچھ پہلے اپتال کے سامنے گاڑی سے اترتے ہوئے ہوئی۔ ”تم کل بریڈ فورڈ اپنے گھر لے جانے کے پٹے دیکھ رہے ہو، آج دیکھو کیا ہو رہا ہے۔ جو تفریح کا وقت تھا، اسے ایک اہم مقصد کے لئے قربان کرنا پڑا۔ پائیس کیا ہونے والا ہے۔“

”جو بھی ہو گا میں اپنے طور پر یہی کوشش کروں گا کہ اپنی دلہن کو اپنے گھر لے جاؤں۔“

وہ اتر کر جانے لگی۔ اس نے کہا۔ ”ڈیوٹی سے آزاد ہونے کے بعد میرا انتظار کرنا۔ میں گاڑی لے کر آؤں گا۔ پھر ہم چلیں گے۔“

وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا، مسکراتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو سیدھی طرح سیٹ پر بیٹھ گیا، گفتاتے ہوئے دوبارہ کار اشارت کی، پھر اسے ڈرائیو کرتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”مونا کل صبح سے شام تک جلوس، چلے وغیرہ میں مصروف رہے گی۔ اس وقت تک میں بریڈ فورڈ جاؤں گا اور وہاں اس کے استقبال کی تیاری کروں گا اپنے کمرے کو دلہن کی طرح سجا دوں گا۔ یہ سچ ہے کہ عورت اپنی ازدواجی زندگی کے پہلے سرخ جوڑے کو کبھی نہیں بھولتی۔ اگر وہ جوڑا کسی کام نہ آیا ہو تو اسے اور نہیں بھولتی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شادی کا سرخ جوڑا ساتھ لائی ہے۔“

وہ مسکراتے اور گفتاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ”میں وہ سرخ جوڑا اسے پہننے کے لئے کھوں گا۔ میری رہائش گاہ کے اطراف بچے ایشیائی خاندان آباد ہیں جب انہیں معلوم ہو گا کہ میں دلہن لایا ہوں تو ان کی عورتیں خود ہی مونا کو دلہن کی طرح ہتا ستار کر میرے کمرے میں لے آئیں گی۔ مونا کو اور کیا چاہئے! وہ سوچ رہا تھا، ڈرائیو کر رہا تھا اور مسی میں گفتات جا رہا تھا۔

دوسرے دن کے اخبارات نے چھوٹی بڑی سرخیوں کے ساتھ امیگریشن کے متعلق کچھ خبریں شائع کی تھیں۔ ان میں گفتات پائے اور فاروق رانہور کا بیان بھی شامل تھا۔ انہوں نے کہا تھا۔ امیگریشن کے قوانین میں اہم ترمیم کی ضرورت ہے۔

یہ سطر جلی حرفوں میں شائع کی گئی تھی۔ ”تقریباً ساٹھ ہزار ایشیائی خاندانوں کو امیگریشن کے قوانین نے تقسیم کر کے رکھ دیا ہے۔“

اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی تھی۔ ”وہ قانون انتہائی غیر انسانی ہے جو انسان کو انسان سے الگ کر دے۔ بیوی کو شوہر سے اور والدین کو ان کے بچوں سے اس طرح جدا کرے کہ برس برس گزر جائیں اور وہ ملنے نہ پائیں۔ میاں بیوی کی طویل جدائی سے اس کی آئندہ نسلیں دوطبقہ طبقہ سے دوچار ہو رہی ہیں۔ اگر بچے دیس میں اپنی ماں کے پاس ہیں یا پردیس میں اپنے باپ کے پاس ہیں وہ سب کچھڑی تہذیب کو زہر مار کر رہے ہیں۔ میاں انگریزی تعلیم پانے والے انگریزی معاشرے میں زندگی گزارنے والے، اپنے آباؤ اجداد کے دین و دھرم سے بیگانے ہوتے جا رہے ہیں۔“

لندن میں جو ایشیائی بچے جوان ہوتے ہیں، وہ اپنے آباؤ اجداد کی تہذیب کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ جوان لڑکیاں مشرقی شرم و حیا کا لباس پہننے کی بجائے چست جینز، کپلے مگر بیان کی خیانت اور بلاؤز پہنتی ہیں۔ جوان لڑکے ایک ہی وقت میں کئی لڑکیوں سے دوستی کرتے ہیں اور ماں باپ کے سامنے اتنی بے حیائی کی باتیں کرتے ہیں کہ والدین اپنا منہ پھیر لیتے ہیں یا اپنا سر پیٹ لیتے ہیں۔

لندن میں جوان ہونے والی بے ایشیائی نسلیں ماں باپ کی پسند کی شادی اور ارمیڈھ صبر کو تسلیم نہیں کرتیں جس کی وجہ سے بے شمار مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ لندن میں روزنامہ جنگ کے نمائندہ معروف صحافی جناب ظہور نیاز ی صاحب لکھتے ہیں۔

”بریڈ فورڈ میں پاکستانیوں کی اتنی بڑی تعداد آباد ہے کہ وہ ننھا پاکستان کھلاتا ہے۔ اس کے باوجود پاکستانی برادری اپنے بچوں کے خصوصاً لڑکیوں کے معاملے میں بے حد متشکر

چک اور ذرا سی ترمیم کر دی جائے تو بے شمار انسانی، سماجی اور اخلاقی مسائل حل ہو جائیں گے۔

ایک ہی مسئلے کے کئی قیادی تھے۔ جب اخبارات میں ان کے بیانات شائع ہوئے تو چچا چلا، صرف مسز مونا کامران ایسی نہیں تھی جو کسی دوسرے کو شوہر بنا کر اپنے شوہر سے ملے لندن آئی تھی۔ اخبارات میں کئی عورتوں نے بیان دیے۔ ان میں سے کچھ نے اپنا نام ظاہر کیا، کچھ اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ یہ عورتیں پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، سری لنکا، افغانستان، ایران، ترکی، مصر اور لیبیا جیسے ملکوں سے آئی تھیں اور دہری زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کا اپنا شوہر کوئی اور تھا لیکن برطانوی قانون کے کھاتے میں کسی اور کا نام درج تھا۔

مونا نے بیان دیا تھا ”ہمارے جیسی اور درجنوں عورتیں اس شہر میں ہیں جو اخبارات میں بیان دینے سے گریز کر رہی ہیں۔ میں ان بھائیوں اور بہنوں سے کہتی ہوں، غلطی چھپانے سے کبھی اصلاح نہیں ہوتی۔ ہمیں ایسے عوامل کی نشاندہی کرنا چاہئے جو ہماری غلطیوں کا سبب بنتے ہیں۔ کسی بھی ملک کے میاں بیوی سے ایسی غلطیاں ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ انسان ہیں۔ زوئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں صرف فرشتے بستے ہوں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کسی بھی ملک کا قانون میاں بیوی کو ایک طویل جدائی کی آگ میں جلا کر انہیں اس قدر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ ملنے کے لئے چور دروازے اختیار کرنے لگتے ہیں۔“

اخبارات میں یہاں کے والدین نے جوان لڑکیوں اور لڑکوں نے بھی اپنے بیانات دیئے تھے۔ تمام بیانات سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ برطانیہ میں امیگریشن کا موجودہ قانون انسانی حقوق کو پامال کر رہا ہے۔

سینکڑوں طویل اور مختصر بیانات شائع ہوئے تھے۔ اخبارات امیگریشن کے موضوع سے بھرے پڑے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام سے لے کر حکام تک اس جلوس کا چچا ہونے لگا جو اب شاہراہوں پر نکل آیا تھا۔ جلوس میں شریک ہونے والے ہزاروں افراد تھے۔ ان میں عورتیں، مرد، بچے بوڑھے سبھی شامل تھے۔ سینکڑوں افراد نے اپنے اپنے

نظر آتی ہے۔ پاکستانی مختلف شہروں، علاقوں اور ملکوں میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ باہمی رابطے کا فقدان ہے چنانچہ جو جوان لڑکیوں کے لئے رشتے نہیں آتے۔ جو آجاتے ہیں وہ معیار پر پورے نہیں اترتے۔ پھر خاندان، قبیلوں، برادریوں اور ملکوں کا قصہ بچ میں آ جاتا ہے۔

یہ بے چارے والدین پاکستان جا کر لڑکا تلاش کرتے ہیں تو برطانوی حکومت اس کی برطانیہ میں قدم رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ امیگریشن حکام انٹری کلیرنس سرٹیفیکٹ دینے سے انکار کرتے ہیں۔

یہ حکام سمجھتے ہیں کہ پاکستان سے لڑکا آئے گا اور یہاں برطانوی شہریت رکھنے والی پاکستانی لڑکی سے شادی کر لے گا تو پھر قانوناً ہمیں کا ہو جائے گا۔

اگر امیگریشن قوانین سے مجبور ہو کر یہاں کے والدین اپنی لڑکی کو پاکستان لے جا کر کسی لڑکے سے بیاہنا چاہتے ہیں تو لڑکی کو پاکستان کا ماحول پسند نہیں آتا۔ صرف لڑکیاں نہیں لڑکے بھی یہاں شادی کے لئے لائے جائیں تو پاکستانی لڑکیوں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ سماعت مجبوری شادی کر بھی لی تو لڑکی پاکستانی دولہا اور لڑکا پاکستانی دولہن کو ہمیشہ احساس کمتری میں جلا رکھتے ہیں۔“

جناب قلمور نیازی صاحب لکھتے ہیں۔ ”میں اکثر والدین کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ وہ معاشی اوسدگی کے حصول میں اس قدر منہمک رہے کہ بچوں کو قرآن نماز اور اردو زبان تک نہ سکھا سکے۔ ننھے بچوں کے لئے تو ان دنوں مساجد اور ہفتہ وار تعلیمات کے دوران خصوصی مدرسوں میں قرآن اور اردو کی تعلیم کا انتظام کر دیا گیا ہے لیکن جو جوان ہو چکے ہیں، ان کے لئے اب کیا کیا جاسکتا ہے؟

چنانچہ میں نے والدین اپنے پوتوں اور پوتیوں کے لئے ایسی ماں تلاش کرنا چاہے ہیں جو انہیں اپنی تہذیب اور تمدن سے روشناس کرا سکے۔ قرآن اور نماز سکھا سکے چنانچہ ایسی ماں کے لئے ان کی نظرس پاکستان کی طرف اٹھتی ہیں۔“

لیکن ایسی ماں پاکستان سے حاصل کرنے کے لئے بھی امیگریشن قوانین سے گزرنا پڑتا ہے۔ سارا دار و مدار انہی امیگریشن قوانین پر ہے اگر اس میں ذرا سی نرمی، ذرا سی

ہاتھوں میں پلے کارڈز اور بڑے بڑے بیڑا اٹھا رکھے تھے۔

ایک بیڑ پر لکھا ہوا تھا۔ ”ہم انسانیت کے نام پر اپیل کرتے ہیں“ انگریزوں نے موجودہ قانون کے ذریعے انسان کو انسان سے اور محبت کو محبت سے الگ نہ کیا جائے۔ ”
مونا جیسی عورتوں نے اپنے اپنے ہاتھوں میں جو پلے کارڈز اٹھا رکھے تھے۔ ان پر لکھا ہوا تھا۔ ”میاں بیوی لائف پارٹنر (شریک زندگی) ہوتے ہیں۔ انہیں الگ رکھنے کا قانون نہ بناؤ۔“

ایک بیڑ پر لکھا ہوا تھا۔ ”ہم ایشیائی لوگ یہاں کی معیشت پر بوجھ نہیں ہیں۔ ہم انجینئرز، ڈاکٹر ہیں، اکاؤنٹنٹ ہیں۔ یہاں کے پیشتر اداروں میں بہترین منتظم سمجھے جاتے ہیں۔ یہاں کی لوں اور کارخانوں میں مزدور بھی ہیں اور محترمانہ کارگیر اور ہنرمند بھی۔ ہماری محنت ہماری ہنرمندی، ہماری وفاداری، حکومت برطانیہ کے لئے ہے ہم یہاں کے قانون کا احترام کرتے ہیں۔ پھر قانون ہماری قدر کیوں نہیں کرتا؟“

دنیا میں جہاں کہیں بھی تحریک چلتی ہے، اس سے متاثر کرنے کے لئے مخالف قوتیں اپنا زور لگاتی ہیں۔ ایشیائی لوگوں میں ایسے افراد زیادہ تھے جو اس تحریک کے خلاف تھے ان کا کہنا تھا۔ اگر حکومت برطانیہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ کتنے لوگ چور دروازے سے آتے ہیں اور کتنے لوگ بلیڈر ٹرپ کے بمانے اپنی بیوی سے یا اپنے میاں سے ملاقات کرتے ہیں اور مختلف جیلوں بمانوں سے بیس رہ جانے کی کوششیں کرتے ہیں پھر ریش پائڑے پیسے عیاش لوگ تھے جو بظاہر شکشا جیسی بیویوں کے سامنے تو کچھ نہیں بولتے لیکن ان کے پیچھے یہی کوشش ہوتی تھی کہ تحریک کا سیلاب نہ ہونے پائے۔ وہاں جی بھر کر عیاشی کرنے والے یہ نہیں چاہتے تھے کہ سوسائٹی میں ان کی بدنامی ہو۔ چور دروازوں سے آنے والے خود کو ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سیاسی پناہ لینے والے بھی اسی بات پر جھنجھلا رہے تھے کہ حکومت برطانیہ نے انگریزوں کے سخت قوانین کے مطابق اقدامات کئے تو انہیں مزید سیاسی پناہ نہیں ملے گی۔ انہیں اس ملک سے باہر جانا پڑے گا۔

وہ جلوس نمائند ہی منظم اور پرامن طریقے سے مارچ کرتا ہوا پارلیمنٹ اسٹریٹ تک پہنچا۔ وہیں اچانک اشتعال انگیزی شروع ہو گئی۔ پتا نہیں کہاں سے، کس نے کسے

لڑاکا دیا۔ کسی نے ایک پولیس والے پر ایک چھری سے حملہ کر دیا وہیں سے ہنگامہ بھا ہوا جمیل دونوں طرف غلطی فنی پیدا ہوئی۔ پولیس والوں نے سمجھا، جلوس میں شریک ہونے والوں نے ان کے ساتھ زیادتی میں پھل کی ہے اور جلوس میں شریک ہونے والوں نے یہ سمجھا کہ قانون انہیں جبراً حقوق کا مطالبہ کرنے سے روک رہا ہے۔ اس لئے اب یہ لوگ جلوس کو منتشر کر رہے ہیں۔ اس کے لئے ہر وہ حربہ استعمال کر رہے ہیں جو قانون کے مخالف کرتے آئے ہیں۔

جلوس میں اتحاد اور تنظیم برقرار رکھنے والے پریشان ہو گئے۔ شکشا پائڑے فاروق رائٹور، مونا اور کتنی ہی سرکردہ افراد دوسرے ادھر بھاگتے پھر رہے تھے۔ پولیس والوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اپنے لوگوں کو مشتعل ہونے سے باز رکھ رہے تھے لیکن بات بگڑ چکی تھی اس لئے ایسی بھگدڑ مچی کہ کبھی پولیس والے پیچھے ہٹ رہے تھے، کبھی جلوس کے شرکا پیسا ہو رہے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پولیس والوں کے لئے مزید ملک پہنچ گئی اور جلوس اس طرح منتشر ہوا کہ سب رفتہ رفتہ فرار ہو گئے۔ کوئی وہاں ٹھہر نہ سکا صرف جلوس کے منتظمین رہ گئے تھے۔ انہیں گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں مونا اور کامران بھی تھے۔

وہ ہنگامہ دن کے ایک بجے ہوا تھا۔ دو بجے تک وہ لوگ جیل کی سلاخوں کے پیچھے پھنچائے گئے۔ پھر ایک انفرانٹری دی۔ لوگ ادھر سے ادھر ٹپٹی فون کے ذریعے اطلاعات پہنچاتے رہے کہ جلوس کی قیادت کرنے والے کتنے گرفتار ہوئے ہیں اور ان کی ضمانت کے کیا انتظامات کئے جاسکتے ہیں۔

فاروق رائٹور، شکشا پائڑے اور مونا وغیرہ کی ضمانت لینے کے لئے صرف ایشیائی معززین ہی نہیں، وہاں کے انگریز اعلیٰ عہدیدار اور کچھ سیاسی لوگ آگے آ گئے۔ شام تک ان کی ضمانت ہو گئی۔ مونا اور کامران کی ضمانت لینے والوں میں ڈاکٹر جان ہنر بھی شامل تھا۔ انہیں ان شرائط پر رہا کیا گیا کہ وہ عدالتی فیصلوں تک لندن کی حدود میں رہیں گے۔ یہاں سے باہر نہیں جائیں گے۔

دوسری شرط یہ تھی کہ گرفتار ہونے والوں میں اگر کوئی خود جلا وطن ہونا پسند

کرے یا چور دروازے سے آنے والا خود ہی یہاں سے جانا چاہے تو قانون کے مطابق اسے ایئر پورٹ یا بندرگاہ تک لے جائیں گے اور خود ہی جہاز پر سوار کر دیں گے تاکہ اس ملک کے قانون کے خلاف کوئی جیسے کرنے والا، جلوس نکالنے والا یا چور دروازے سے آنے والا نہ رہے۔

مونا دنیہ نے ایک بار درست کہا تھا۔ یہاں پولیس والے کتنے لوگوں کو گرفتار کر سکتے ہیں کتنے لوگوں کا کامبہ کر سکتے ہیں۔ ایک دو ہوں، دس ہوں، سینکڑوں ہوں تو شاہ انہیں جیلوں میں غولس دیا جائے لیکن ہزاروں کی تعداد میں ہوں تو حکام یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، انہیں لٹکے کا موقع دیا جائے۔ ایسے لوگوں کو گرفتار کئے بغیر ان پر مقدمہ چلائے بغیر ان سے چشم پوشی کر کے نجات مل جائے تو بہتر ہے رضا مراد گھر سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے ریڈیو کے ذریعے خبر سنی کہ امیگریشن کے انتہائی جلوس میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ پولس والوں سے تصادم ہوا جس کے نتیجے میں جلوس کے منتظمین گرفتار کر لئے گئے ہیں۔

گرفتار ہونے والوں کے نام نہیں بتائے گئے تھے لیکن رضا مراد سمجھ گیا، مونا اس معاملے میں پیش پیش تھی۔ یقیناً وہ بھی گرفتار کی گئی ہوگی۔ اس نے فوراً ہی ریسپورٹ اٹھا کر ڈاکٹر بنز سے رابطہ قائم کیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں نے بھی یہ خبر سنی ہے۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ ابھی جا کر معلوم کرتا ہوں۔ اگر مونا کو گرفتار کیا گیا ہو گا تو میں ضمانت پر رہا کرانے کی کوشش کروں گا۔“

”ڈاکٹر ضمانت کے لئے خواہ کتنی ہی رقم کی ضرورت ہو۔ میں اپنا سارا کاروبار داؤ پر لگا دوں گا لیکن مونا کو رہا ہونا چاہئے۔ میری زندگی بہت تھوڑی ہے۔ میں مرنے سے پہلے کل رات اس کے ساتھ ڈنر کھانا چاہتا ہوں۔“

ڈاکٹر نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”تمہاری خواہش بھی عجیب ہے۔ اول تو ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے۔ خدا خواستہ موت کا وقت آ ہی گیا ہو تو یہ کیا بات ہوئی کہ اس کے ساتھ ڈنر کھانا لڑی ہے؟“

”ہاں ڈاکٹر! میں سمجھتا ہوں، جسے حاصل نہ کر سکا اس کی روانگی سے پہلے اس کے

ساتھ ایک بار کھانا کھالوں۔ اس طرح میرا دم آسانی سے نکلے گا۔“

”بھئی تمہاری بات سمجھ میں نہیں آئی لیکن امید ہے کہ کل رات تم اپنی خواہش پوری کر سکو گے وہ تمہارے ذہن میں شریک ہوگی۔ میں اس کی ضمانت کے لئے جا رہا ہوں۔ اوکے بائی۔“

دوسری طرف سے ریسپورٹ رکھ دیا گیا۔ مراد نے بھی ریسپورٹ رکھتے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنے دل کو تھام لیا۔..... دل کی دھڑکن ست ہو رہی تھی، دل ڈوب رہا تھا۔ وہ چنگ پر بیٹھا ہوا تھا لیکن نیچے ہی نیچے ہوتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ جیسے پستی میں دھنسا جا رہا ہو۔

اسے ایک خیال ستا رہا تھا۔ اگر مونا کو جیل ہو گئی، وہ کل رات کو نہ آسکی، زندگی نے ساتھ نہ دیا اور وہ مر گیا تو حسرت دل میں ہی رہ جائے گی۔ ایک بار شکست کھانے کے بعد وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ دوسری بار شکست دینے والی کو ساتھ لے ڈوبے گا۔ جیسے گا تو اس کے ساتھ، مرے گا تو اس کے ساتھ۔

اس وقت کالج کے باہر ایک گاڑی کی آواز سنائی دی۔ وہ کان لگا کر سننے لگا۔ ڈرائیور بعد ہی کال تیل کی آواز سنائی دی، کوئی آیا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ کمزوری محسوس کرنے کے باوجود آہستہ آہستہ چلتے چلتے لگے بکسز کا سہارا لے کر کبھی دیوار کا سہارا لے کر بہرونی دروازے تک پہنچا۔ کال تیل کی آواز پھر سنائی دی تھی۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ باہر جگ آنتی سرلا دیوی نظر آئی۔

وہ اندر آ کر دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے افسوس ہے تمہیں اس حالت میں آنا پڑا۔ تم میرا سہارا لے کر چل سکتے ہو۔“

وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر چلتے لگا۔ اتنی کمزوری محسوس کر رہا تھا کہ سہارا لے کر چلتے ہوئے بھی ہانپ رہا تھا۔ چنگ کے قریب پہنچ کر۔ دم سا ہو کر بہتر گر پڑا۔ قہوڑی دیر تک چاروں شانے چت لیٹا، گہری گہری سانس لیتا رہا۔ جگ آنتی اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے اس پر ترس آ رہا ہو۔ پھر وہ بولی۔ ”تمہارے اس ملازم نے تمہارے ساتھ فراڈ کیا ہے۔ کیا تم خاصا کا جو زہر کے عوض تم سے تین ہزار پونڈ لے گیا ہے؟“

وہ منگل خود کشی سے پہلے ہی مر گیا تو یہ انکشاف ہوا کہ کوئی موت کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا اور کوئی موت سے پہلے مر نہیں سکتا۔

وہ پلٹ کر جانے لگی۔ مراد نے کہا۔ ”معمود اس کا مطلب کیا ہوا؟“

”میں نے اپنے تجربے کی ایک بات کہہ دی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ تم بھی کسی تجربے سے گزرنے کے بعد کچھ سیکو۔ دوسروں کا تجربہ بہت کچھ سکھاتا ہے۔ ہم اکثر یہ دیکھتے آئے ہیں کہ انسان قانون قدرت کے خلاف حرکتیں کرتا ہے اور اس کا نتیجہ اس کی توقع کے خلاف ہوتا ہے۔“ زندہ رہنا چاہتے ہیں، موت ہمیں زندہ رہنے نہیں دیتی اور ہم مرنا چاہتے ہیں تو قدرت ہماری موت سے انکار کرتی ہے اور موت بھی ہمیں زندگی سے چھیننا نہیں چاہتی۔“

”کیا تم یہ کتا چاہتی ہو کہ میں اپنی پلاننگ کے مطابق اس کے ساتھ مر نہیں سکوں؟“

”ہاں؟“

”میں نے کب انکار کیا ہے۔ میری تو پوری کوشش ہو گی۔ اکثر لوگ اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں کیونکہ قدرت کے فیصلے کے مطابق وہی موت کی گزری ان کے لئے ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے تمہاری موت مونا اور کامران کی موت ایک ساتھ لکھی ہو اور کل ایک ساتھ تینوں کی زندگی کا آخری فیصلہ ہو جائے۔“

”ضرور فیصلہ ہو گا اور میری پلاننگ کے مطابق فیصلہ ہو گا۔ اس سے پہلے نہ میں مونا گا نہ مونا اور کامران کو قانون مجھ سے دور لے جائے گا۔ میں انہیں کل تک اپنے قریب لے آؤں گا اور وہ میرے ساتھ زندگی کا آخری کھانا کھائیں گے میں ہمیشہ شکست کھانے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہوں۔ یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری جیت ہو گی۔“

جب آہنی نے ہاتھ اٹھا کر اسے آگے کھینچے روکے ہوئے کہا۔ ”مگر تم اسی طرح آندھی اور طوفان کی مانند سوچتے رہے اور بھجان میں جلا ہوتے رہے تو کل تک بولنے کے قاتل نہیں رہو گے۔ مونا کے ساتھ مرنا چاہتے ہو تو اپنے اندر کے طوفان کو دبائے رکھنے کی کوشش کرو۔ سہولت سے رہو، سہولت سے سوچو، سہولت سے بولو تاکہ مقررہ وقت تک پہنچ رہنے والے ریکارڈ کی طرح کل شام تک پہنچے رہو۔“ وہ چلی گئی۔ مراد

اس نے ہانپتے ہوئے حیرانی سے کہا۔ ”کیا وہ زہر نہیں ہے؟“

”بھئی ایک کڑوی سی دوا تھی۔ میں نے اسے پیونگ دیا ہے۔ میں ایسے کھیلوں میں مات نہیں کھاتی۔ خود کشی کو آسان بنانے سے پہلے ہر پہلو کا جائزہ لیتی ہوں۔ اگر میں اس زہر کو چپک نہ کرتی تو تم مجھ پر الزام دیتے کہ میں نے معاہدے کے مطابق اپنا کام نہیں کیا۔“

”مجھے یقین ہے، تم میرا کام ہر حال میں کرو گی۔“

”کیوں نہیں کروں گی۔ کیا زہر حاصل کرنا کوئی مشکل کام ہے۔ تم نے خواہ مخواہ ملازم کو اس معاملے میں ملوث کیا تھا۔“

”مجھ سے ایک غلطی ہو گئی، اس کا ذکر نہ کرو۔ کام کی باتیں کرو۔“

”میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آئی ہوں۔ میری مطلوبہ رقم مجھے اپنے پائرنر کے ذریعے مجھے مل گئی ہے۔ جب تم لین دین میں اتنے کھڑے ہو تو میں کب پیچھے رہ سکتی ہوں۔ ہمارے زبانی معاہدے کے مطابق کل تمہارا کام ہو جائے گا۔“

یہ مرا کو دل کی بات تھی اور جو دل کی بات ہوتی ہے وہ حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ بیمار کو بھی بستر سے اٹھا کر بٹھا دیتی ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جب آہنی نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج سے دو برس پہلے تمہارے جیسا ایک منگل میرے پاس آیا تھا۔ وہ خود کشی کرنا چاہتا تھا۔ جانتے ہو کیا ہوا؟“

”کیا ہوا؟“

”وہ خود کشی نہ کر سکا، اس سے پہلے ہی مر گیا۔ طبی موت مر گیا۔“

وہ مضطرب ہنسنے لگا۔ ”میں نہیں مرنے لگا۔ میں کل تک زندہ رہوں گا۔“

”میں تمہارے لئے دعا کروں گی۔“

”تم دعا کرو، میں حوصلہ کرتا ہوں۔ کل مونا گا تو اس کے ساتھ ہی مرنے لگا۔ اس سے پہلے ہرگز نہیں۔“

جب آہنی سرلا دیوی نے ایک گہری سانس لی۔ پھر وہاں سے جانے لگی۔ مراد اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئی۔ پھر وہاں سے پلٹ کر بولی۔ ”جب میرا

تھل لٹ جاتا تو کروٹیں بدلتا تھا۔ اٹھ کر بیٹھ جاتا تو بستر سے اتر کر ٹھلنے رہنے کو ہی چاہتا تھا لیکن ٹھلنے کی ہمت نہیں تھی۔

اس نے ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے۔ رابطہ قائم ہونے پر پوچھا۔ ”کیا مونا ہے؟“
”وہ موجود نہیں ہے۔“

”کیا بتا سکتی ہو وہ کہاں گئی ہے کس کے ساتھ گئی ہے؟“

”کہاں گئی ہے یہ نہیں جانتی۔ ہاں شوہر کے ساتھ گئی ہے۔“

اس کے اندر کھلبلی مچ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”کب تک واپس آئے گی؟“

دوسری طرف سے جواب ملا۔ ”عورت شوہر کے ساتھ جانے کے بعد تینکے نہیں

آتی ہاٹل کیا آئے گی۔ آپ اپنا نام اور پیغام نوٹ کر ادیں۔ ہو سکتا ہے“ وہ آجائے۔“

مراد نے ریسپور رکھ دیا۔ بے چینی اور بڑھ گئی۔ اگرچہ اس نے اپنی کار دے دی

تھی، انہیں گھونسنے کی آزادی دے دی تھی، اس کے باوجود جانتا تھا، انہیں خاطر خواہ تھالی

نصیب نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر کے سامنے اپنی فراخ دلی کا ثبوت پیش کرنے کے لئے کہہ دیا تھا کہ

وہ دونوں اس کالج کے کمرے میں رہ سکتے ہیں اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مونا اس کالج

میں رات نہیں گزارے گی خواہ شوہر کے ساتھ ہی کیوں نہ گزارنا پڑے۔ وہ انکار کر دے

گی اور ڈاکٹر نے بھی اپنے الفاظ میں اس کی تصدیق کر دی تھی۔

اب اس کے اندر سوالات گونج رہے تھے۔ ”زور زور سے چیخ رہے تھے۔“

رات کو کامران کے ساتھ کہاں گئی ہے؟

ہاٹل نہیں آئی۔ کیا وہ لندن کی بیر کر رہے ہیں۔

رات کے ایک بجے یہ جی میں آیا کہ پھر فون پر مونا سے رابطہ قائم کرے۔ معلوم

کرے وہ ہاٹل آئی ہے یا نہیں؟

لیکن وہ ریسپور کی طرف ہاتھ نہ بڑھا سکا۔ دل میں ایک طرح کا ڈر تھا۔ اگر وہ

نہیں آئی ہوگی تو اضطراب اور بڑھ جائے گا۔ اندر ایسی کھلبلی مچے گی کہ غبارے کی طرح

پھٹ پڑے گا۔ اپنے آپ کو نوپتے کھسونے لگے گا اور شاید پاگل ہو جائے گا۔

رات کے دو بج گئے، پھر چار بج گئے۔ پھر صبح ہوئے گی۔ وہ اچانک ہی پاگلوں کی

طرح قہقہے لگانے لگا اور اپنے سینے پر ہاتھ بھرتے ہوئے کہنے لگا۔ ”مگر مکی، رات گزر

اچکی۔ ان کی رات بھی گزر گئی میری رات بھی گزر گئی۔ وہ دونوں مجھے کلاٹوں کے بستر پر

ملا کر خود پھولوں کے بستر پر نہ سو سکے۔“

اچانک اس کے قہقہے رک گئے۔ یکبارگی اس نے سوچا۔ ان فراق کے ماحول کا کیا

اگلا؟ وہ اپنی اپنی رات بھر جاتے رہے ہوں گے اور جدائی کی آگ میں جلتے رہے

ہوں گے۔ پھر بھی آرام سے ہوں گے لیکن میں کیوں جاٹا رہا؟ میں کیوں غریب رہا؟ میں

کہیں جلا اور مرنا رہا؟

سامنے قد آدم آئینے میں اسے اپنا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ دائمی کچھ اور بڑھ گئی

تھی۔ گل چپک چپکے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنسن گئی تھیں۔ چہرہ یوں زور پڑ گیا تھا جیسے

رات بھر مونا اور کامران مل کر اس کا لوٹو بچھڑتے رہے ہوں۔ میں مر نہیں سکتا۔ میں شام

تک زندہ رہوں گا۔“

اس نے گھبرا کر کہہ ”نن“ نہیں۔ کوئی میرا لو نہیں بچھڑ سکتا۔ میں مر نہیں سکتا۔

میں شام تک زندہ رہوں گا۔“

وہ بستر سے اٹھ گیا۔ لیکن میں جا کر کچھ کھانا چاہتا تھا اپنے اندر توانائی پیدا کرنا چاہتا

تھا لیکن اٹھ کر کھڑے ہوتے ہی سر پکڑنے لگا۔ وہ بستر کا سمار لے تھوڑی دیر تک جھکا

کھڑا رہا۔ پھر سیدھا ہو کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کمرے سے باہر آیا۔ وہاں سے چلا ہوا

فریج کے پاس پہنچا۔ اسے کھول کر کھانے کے لئے کچھ نکالا۔ اس نے دو چار تھکے کسی طرح

طلق سے اتارے، اسی وقت بیرونی دروازے پر آہٹ ٹائی دی۔ وہ آہستہ آہستہ چلا ہوا

دروازے پر پہنچا۔ اسے کھول کر دیکھا، کوئی نہیں تھا۔ دروازے کے پاس دودھ کی بوتلی

رکھی تھی۔ کوئی دودھ والا بھی وہاں سے گزر رہا تھا۔

وہ چاہتا تھا، ناشتہ کرنے اور دودھ وغیرہ پینے تک شام ہو جائے۔ وقت تیزی سے

گزر جائے۔ جب وہ اپنے بیڈ روم میں واپس آکر بستر پر بیٹھا تو بیڈ نہ سکا چاروں ٹھلنے

چٹ ہو گیا۔ بہت زیادہ تھک گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ریسپور اٹھا کر نمبر ڈائل کئے

رابطہ قائم ہونے کے بعد اس نے کہہ ”میں مونا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ پلیز اسے فون

پر بلائیں۔

دوسری طرف سے انتظار کرنے کے لئے کہا گیا۔ وہ بڑی بے چینی سے انتظار کرنا لگا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک ایک پہل ایک ایک صدی کی طرح گزر رہا ہو۔ پھر کسی کی نسواں آواز سنائی دی۔ ”آپ کون ہیں۔ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟“

”میں مراد ہوں، مونا سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں ٹھٹھا پاؤں بول رہی ہوں۔ مونا سو رہی ہے۔ رات کے دو بجے آئی تھی۔ تھکی ہوئی ہے۔ اسے جگانا مناسب نہیں ہے۔ کوئی ضروری پیغام ہو تو میں اسے پوچھا دوں گی۔“

”اس سے اتنی ہی کہہ دینا“ میں رات کے کھانے پر انتظار کروں گا۔ ہو سکے تو کامران کے ساتھ شام کو جلد چلی آئے۔“

اس نے بیسور رکھ دیا۔ پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے وقت گزارنے اور اپنے آپ کو بھلانے کے لئے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ وہ زیادہ ٹھٹھا بھی نہیں چاہتا تھا اور مصروف بھی رہتا چاہتا تھا۔ دن کے ایک بجے اس نے شیوید۔ غسل کیا، لباس پہن کر اپنے آپ کو دیکھلے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ بہت تیار نظر آ رہا تھا، اس کے باوجود صاف ستھرا ہونے کے بعد ابلے لباس میں کچھ ڈھنگ کا لگ رہا تھا۔

دوپہر کو جب آئی ایک عورت کے ساتھ کھانے پکانے کا سامان لے آئی۔ وہ مصروف ہوئی کہ مراد کا وقت بھی آسانی سے گزرنے لگا۔ شام کے پانچ بجے مونا اور کامران پہنچ گئے کامران نے آتے ہی کہا۔ ”میں اس لئے جلد آیا کہ تم تنہا ہو گے، تمہارا دل بیلے گا۔“

وہ کامران کی باتیں سن رہا تھا اور مونا کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ آج کے بعد کوئی کسی کو دیکھ نہیں سکے گا۔ اگر موت کے بعد زندگی ملتی ہے تو صرف مجھے اور مونا کو ملے گی۔ کامران مڑوہ ہی رہے گا۔

جب آئی مرلا دیوی نے آکر پوچھا۔ ”مزمز مونا کامران! آپ کو کون سی ڈش سب سے زیادہ پسند ہے میں ہر طرح کے ہندوستانی کھانے پکالتی ہوں۔“

مونا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”جو مل جائے گا کھاؤں گی۔“

”کیا سوٹ ڈش زیادہ پسند ہے؟“

کامران اور مراد نے ایک ساتھ کہا۔ ”ہاں زیادہ پسند ہے۔“

جب آئی نے دونوں کو گھور کر کہا۔ ”میں مونا سے پوچھ رہی ہوں۔“

کامران نے کہا۔ ”میں مونا کے ہی بارے میں کہہ رہا ہوں۔“

مراد نے بھی کہا۔ ”میں بھی مونا کی پسند کو سمجھتا ہوں کیوں مونا کیا یہ لفظ ہے؟“

وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”کھانے کے بعد کوئی میٹھی سی چیز کھانا ہمارے لہجہ

میں ہے۔ اس لئے میں میٹھی ڈش پسند کرتی ہوں۔“

مراد اور جب آئی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھلے پھر آئی وہاں سے کچن کی طرف چلی گئی۔ وہ تینوں باتیں کرنے لگے۔ باتوں سے مراد کا دل نہیں بھل رہا

تھا۔ وہ بار بار اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے تک جاتا تھا۔ دور کچن کی طرف دیکھتا تھا پھر

پوچھتا تھا۔ ”کتنی دیر میں کھانا تیار ہو جائے گا۔“

کامران نے کہا۔ ”تم اتنے بے چین کیوں ہو بھئی وقت پر تیار ہو گا۔ ہم کھا کر

جائیں گے۔“

وہ پھر کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ کہنے لگا۔ ”میں چاہتا ہوں جلدی کھانے سے فارغ ہو

کر مونا کو ذرا اندون کی سیر کراتے ہوئے ایئر پورٹ لے چلیں۔“

ٹھیک آدھ بجے جب آئی نے سیر پر کھانا جن دیا۔ کھانے کی خوشبو دُور تک آ رہی

تھی۔ وہ تینوں میز کے اطراف بیٹھ گئے۔ کامران نے کہا۔ ”یہاں کبھی کبھی مشرقی کھانا نظر

آتا ہے، تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا ہے پیاسے کو بڑی دھانڈ اور منتوں کے بعد

صحرا میں دو گھونٹ پانی مل گیا ہو۔“ جب آئی نے کہا۔ ”یہ دو گھونٹ نہیں چار بہترین

ڈشیں ہیں۔ اس کے علاوہ میٹھی ڈش ہے اگر اسے کھو لگے تو چھوڑو گے نہیں۔ کھاتے

ہی چلے جاؤ گے۔“

مراد نے کہا۔ ”آئی! تمہاری زبان سے تعریفیں سن کر می چاہتا ہے پہلے میٹھی ڈش

سے ہی کھانا شروع کریں۔“

”کیا ہرج ہے۔ بیٹے سے ہی سی۔“

کامران نے کلمہ ”لیکن یہ الٹا دستور ہو گا۔ بیٹھا آخر میں کھایا جاتا ہے جیسا کہ مونا نے کہا تھا۔“

مونے نے کلمہ ”بات اصل میں یہ ہے کہ تم مجھے تمام دن سمجھاتے پھرتے رہے اور خوب کھلاتے رہے۔ میرا بیٹ بھرا ہوا ہے۔ مراد صاحب نے اتنے غلوس سے کھانے کا اہتمام کیا ہے۔ نہیں کھاؤں گی تو شکایت ہوگی ورنہ میں صرف بیٹھی ڈش پر اکتفا کرتی ہوں۔“

مراد نے جواباً کلمہ ”لوگ اپنی زندگی میں کتنی ہی ایسی چالیں چلتے ہیں۔ ہم بھی پہلی ڈش کی بجائے آخری ڈش سے کھانا شروع کر سکتے ہیں۔ تم بیٹھا کھاؤ گی تو ہم بھی یہی کھائیں گے بعد میں ہمیں کھانے کی ڈش چھ لی جائے گی۔“

جب آئی نے کلمہ ”واہ یہ کوئی بات ہوئی۔ میں نے بڑی محنت سے پکایا ہے۔ تم ایسا کرو، توڑا توڑا ہر ڈش کو پچھ لو۔ اس کے بعد بیٹھا کھالینا۔“

سب نے جب آئی کے مشورے کو قبول کیا اور نمکین ڈش چکھنے لگے۔ مراد کن انکھیں سے جب آئی کو گھور رہا تھا۔ اس نے بظاہر اس کا مشورہ تسلیم کر لیا تھا لیکن چاہتا تھا جلد ہی تینوں بیٹھی ڈش تک پہنچ جائیں۔ جو ہونی ہے وہ فوراً ہو جائے۔

وہ کب سے اس گھڑی کے انتظار میں تھا۔ وہ گھڑی آئی تھی۔ مونے نے جب بیٹھی ڈش کو ہاتھ لگایا تو مرا، کے دماغ میں سنسناہٹ ہی ہونے لگی۔ دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ مونے کے بعد مراد اور کامران نے بھی اس ڈش سے اپنے لئے چند تھپے لئے اور اسے چکھنا شروع کیا۔ پہلے انہوں نے چکھ کر دیکھا، بیٹھا بڑا لذیذ تھا۔ وہ تعریفیں کرنے لگے۔ مراد نے متنی خیر نظروں سے آئی کو دیکھتے ہوئے کلمہ ”واقعی یہ لاجواب ہے لیکن ہلکی سی کڑواہٹ ہے ایسا کیوں؟“

مونے نے بھی تائید کی۔ ”ہاں ہلکی سی کڑواہٹ ہے مگر ہرگز نہیں کیوں اچھی لگ رہی ہے۔“

جب آئی سرلا دیوی نے چٹنے ہوئے کلمہ ”میاں بیوی کے درمیان لڑائی نہ ہو ہلکی

سی سختی پیدا نہ ہو تو ازدواجی زندگی کی مجلس میں مزہ نہیں آتا۔ یہی ہے تمام سچی اس میں ہے۔“

کامران نے کلمہ ”آئی! آپ نے بڑی خوبصورت بات کہہ دی لیکن ہم اسے بد نصیب ہیں کہ ہماری ازدواجی زندگی میں لڑنے والی ہلکی سی بیٹھی سی، سچی سی نہ ہو سکی۔ اس کا موقع ہی نہیں ملا۔“

مونے نے بیٹھے کا لقمہ بچھ میں لیا۔ پھر کلمہ ”زندگی رہی تو یہ بھی موقع مل جائے گا لیکن زندگی کا کیا مہرہ؟“

اس نے زہریلی ڈش کا وہ لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ مراد نے خوش ہو کر دیکھا۔ جیسے دنیا جہاں کی خوشیاں مل گئی ہوں۔ پھر اس نے بھی لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ وہ کھا رہا تھا مگر مونا کو دیکھتا جا رہا تھا کن انکھوں سے کبھی کبھی کامران کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ جب مونا ایک بچھ کھاتی تو وہ بھی ایک بچھ منہ میں رکھتا تھا گویا اس کے ہر تھپے کا حساب کر رہا تھا اور اسی حساب کے ساتھ خود کھاتا جا رہا تھا۔ جیسے موت کے آخری سبک میل تک پہنچنے کے لئے مونے کے ساتھ ایک ایک قدم ملا کر چل رہا ہو۔

بیٹھا بیٹھا انہوں نے اپنی اپنی پلیٹ میں نکالا تھا، اس کے ختم ہونے تک مراد کو پسینہ آنے لگا۔ بیٹھا محسوس ہونے لگی۔ آنکھیں ذرا سی دھندلا رہی تھیں۔ اس نے غور سے مونا کو دیکھا، وہ آٹھلے سے اپنے چہرے کو پونچھ رہی تھی گویا اسے بھی پسینہ آ رہا تھا۔ مراد نے کانپتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے بیٹھی ڈش کو تمام لیا۔ پھر اس کے سامنے پیش کرتے ہوئے کلمہ ”توڑی سی اور پچھ لو۔“

وہ سنجیدگی سے مسکرائی۔ پھر بولی۔ ”واقعی جب آئی نے کمال کی ڈش تیار کی ہے۔“

کامران نے کلمہ ”بھئی میں توڑا اور کھاؤں گا۔“

مونے نے کلمہ ”میں کب انکار کروں گی۔“

وہ ہنسنے لگی۔ ”چٹنے چٹنے گویا پھر موت کا سامان کرنے لگے۔ وہ توڑا اور کھانا چاہتے تھے لیکن کھانا کوئی سا ہو، اگر لذیذ ہو تو کوئی حد مقرر نہیں ہوتی۔ توڑا کہہ کر زیادہ کھایا

لے چلیں؟

”نہیں۔ اب تو بیش کے لئے سنا ہے اور ابدی نیند کی ابتداء اسی سے ہو گی۔“ پلیز، مونا آخری خواہش پوری کر دو۔ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ ہم سب آرام سے جا رہے ہیں۔ اس دنیا سے جا رہے ہیں۔“

مونے تنبیہ کی گئی کہ ”میں دھما سے نہیں تمہارے شر سے جا رہی ہوں۔ بہت مجبور ہو کر اپنے کامران سے جدا ہو رہی ہوں۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ ہم دنیا سے جا رہے ہیں۔ میں تیار ہوں۔ بہت زیادہ کمزور ہوں اس لئے زہر مجھ پر جلد اثر انداز ہو رہا ہے۔ تم دونوں صحت مند ہو۔ اس لئے آرام سے رک رک کر‘ ٹپ ٹپ کر مرنا گھر مجھے اپنا ہاتھ دے دو تاکہ میں آرام سے مر سکوں۔ یہ حسرت تو نہ رہے کہ آخری وقت تم میرے ساتھ نہیں تھیں۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہونا چاہئے پلیز مونا پلیز۔“

مونا گھبرا کر کامران کو، پھر جب آنٹی کو دیکھنے لگی۔ اپنے حلق پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ”کیا؟ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا ہم نے زہر کھلیا ہے؟“

وہ اور کامران اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کامران نے کلمہ ”نہیں آنٹی ایسا نہیں ہو سکتا کھانا تم نے تیار کیا ہے۔ کیا مراد تمہارے پاس کچن میں آیا قتلہ کیا وہ ایسی کوئی حرکت کر سکتا ہے؟“

مونا دوڑتی ہوئی کامران کے پاس آئی، پھر اس کے بازو سے لگ کر بولی۔ ”ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ ایسا کر سکتا ہے، جب کانی میں خواب آور دوا ملا سکتا ہے تو زہر بھی کھلا سکتا ہے۔ پلیز کامران۔ فون کرو۔ ہمیں فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔“

مراد قہقہہ لگنے لگا لیکن اب اسے قہقہہ نہیں کہہ سکتے تھے۔ ٹھوڑی ہنسی تھی۔ قہقہے کے طور پر کھٹکنا چاہتی تھی لیکن اس کا دم گھٹ رہا تھا قہقہے رک رہے تھے پھنس رہے تھے۔ آدھی سے پہلے اس کی ہنسی مرنے والی تھی وہ میز پر اونچا ہوا گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ ہیز یوں پھیل گئے جیسے وہ ساری زندگی دوڑتے دوڑتے تھک کر بے دم ہو کر گر پڑا ہو۔ وہ دونوں پھیلے ہوئے بازو گویا دروازے کے لئے پر تول رہے تھے لیکن موت کے ان

جاتا ہے۔ یہی حال ان کا قتلہ ان تینوں نے اپنی پلیٹ میں کچھ زیادہ ہی میٹھا لیا۔ جب آنٹی نے خالی ڈش اٹھا کر ہونے کلمہ ”میں اور لے آئی ہوں۔“

مونے انکار کرتے ہوئے کلمہ ”ہاں اور نہیں۔“

جب آنٹی نے فاتحانہ نظروں سے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے کلمہ ”جو چیز زود اثر ہو، اسے زیادہ کھانا ضروری نہیں ہے جتنا کھایا، اتنا ہی کافی ہے یہی ہمیشہ یاد رہے گا۔“

وہ تینوں کھا رہے تھے۔ اب مراد کا ہاتھ کاپ رہا قتلہ وہ چیخ سے میٹھا اٹھا کر منہ تک لے تو آتا لیکن صحیح طور پر لقمہ منہ تک نہیں پہنچا قتلہ مونا اور کامران نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیا تمہاری طبیعت پھر خراب ہو رہی ہے؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس میرا دل بھر گیا ہے لیکن تم لوگوں کا ساتھ دے رہا ہوں۔“

مونے کلمہ ”کوئی ضروری نہیں ہے ہم نے اپنی پلیٹ میں جتنا نکل لیا ہے، اتنا ضرور کھائیں گے۔ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کمزوری میں میٹھا زیادہ کھایا جائے تو سر پکڑانے لگتا ہے۔“

وہ مراد کو مزید زہر کھانے سے منع کر رہی تھی۔ واقعی اس کا سر پکڑا رہا قتلہ اس نے چیخ کو پلیٹ پر رکھ دیا۔ اسے کھاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ کامران کی پروا نہیں تھی، وہ تو صرف مونا کے ساتھ بیٹھا جتنا جتنا قتلہ جتنے سکا، اب اس کے ساتھ مر رہا قتلہ۔

جب مونے اپنے چیخ میں ٹھننے کا آخری لقمہ اٹھا تو وہ ہنسنے لگا۔ مونا اس آخری لقمے کو منہ تک لے جاتے لے جاتے رک گئی۔ حیرانی سے سواہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی جیسے پوچھ رہی تھی، اس ہنسی کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟

وہ ہنسنے ہنسنے ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس کے حلق سے ایک کراہ نکلی۔ وہ دل کو قحط کر میز پر جھٹکے لگا پھر ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”پلیز میرا ہاتھ قحط لویا اپنا ہاتھ مجھے دو۔“

مونے نے حیرانی سے کچھ پریشان ہو کر کامران کو دیکھا۔ وہ بھلا اپنا ہاتھ مراد کے ہاتھ میں کیوں دیتی۔ کامران نے پوچھا۔ ”مراد کیا ہے؟ کیا ہم جسے سمارا دے کر بیڑہ دم میں

دیکھتے ہاتھ ان پردوں کو کھتر رہے تھے۔

چند لمحوں تک گہری خاموشی چھائی رہی۔ پھر کامران اس کی طرف بڑھتا چاہتا تھا لیکن رک گیا۔ جگ آگئی کہہ رہی تھی۔ ”مراد بہت ہو چکا۔ اب اٹھ جاؤ۔ نہ تم مرو گے نہ تمہارے مصلح۔ میں انسان ہو۔ خود زندہ رہتا چاہتی ہوں اور دوسروں کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں۔“

جگ آگئی نے دل میں کلمہ ”لیکن تمہیں اس لئے زندہ رکھنا چاہتی ہوں کہ ابھی اور مصلح حاصل کرنا ہے تم نے جو خود کشی کے سلسلے میں تحریری بیان دیا ہے وہ عدالت تک پہنچ جائے تو اقدام خود کشی کے جرم میں سزا ہو سکتی ہے تمہارے کاروبار کو ضبط کیا جا سکتا ہے اور تمہیں اس ملک سے نکالا جا سکتا ہے۔“

وہ مراد کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں چاہتی کہ تمہیں ارادہ خود کشی کے جرم میں سزا سنائی جائے میں چاہتی ہوں تم زندہ رہو خوش رہو اور اپنے کاروبار کو دن و رات چمکنی ترقی دو۔“

اس نے دل میں کلمہ ”تمہارا کاروبار زیادہ سے زیادہ منافع بخش ہو گا تو مجھے بھی مصلح حاصل ہو گا۔ تم مجھے میرا حصہ دینے سے انکار کرو گے تو میں تمہارا وہ تحریری بیان قانون کے حوالے کر دوں گی۔“

اس نے مونا اور کامران کو سناتے ہوئے کلمہ ”مراد تم نے پہلے اپنے ملازم سے زہر منگوایا جو زہر نہیں تھا۔ پھر مجھ سے توقع کی کہ میں ان ممالوں کو تمہارے ساتھ زہر کھلاؤں گی تم خود کشی کرو گے اور میں ان کی ہلاکت کا سبب بنوں گی۔ میں نادان نہیں ہوں۔ دیکھ لو یہ زندہ ہیں۔“

اس نے دل میں کلمہ ”اور تمہیں بھی زندہ رکھا ہے تاکہ بلیک میل کرتی رہوں۔ میں خود کشی کرنے والوں کی مشکل آسان کرتی ہوں تو میرا طریقہ یہی ہوتا ہے جب وہ تعاقب میں خود کشی کرنے کا اعتراف کرتے ہیں تو چپکے سے ان کی آواز ریکارڈ کرتی ہوں یا ان کا تحریری بیان لیتی ہوں۔ جب میرے منگووں پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ میں دراصل بلیک میلر ہوں تو وہ اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں اور جو جان پر کھیلنے سے ڈرتے ہیں وہ

میرے ہاتھوں بلیک میل ہوتے رہتے ہیں۔ تم پر تو دہرا الزام ہے ایک تو خود کشی کرنا چاہتے تھے دوسرے مونا کو اپنے ساتھ مارنا چاہتے تھے۔ مجھے مونا سے دلچسپی نہیں ہے میں تو صرف اپنا مصلح دیکھتی ہوں۔“

اس نے پھر زبان سے کلمہ ”مونا عورت ہے۔ میری بیٹی جیسی ہے میں بھلا اسے ہلاک کر سکتی ہوں؟ یہ یہاں سے بھیرت پاکستان جائے گی۔ اپنے شوہر کے لئے زندہ رہے گی اور ایک دن یہ دونوں ضرور ملیں گے۔“

مونا اور کامران بڑی عقیدت سے جگ آگئی کو دیکھ رہے تھے۔ کامران نے کلمہ ”آگئی! یو آر گرینٹ“ تم ایک عظیم خاتون ہو۔ آج تم نے میری اور مونا کی جان بچائی ہے۔“

مراد بیڑ پر اسی طرح اوندھے منہ ”دونوں بازو پھیلانے پڑا ہوا تھا۔ اس کا دل تقریباً ڈوب چکا تھا۔ دماغ بھی تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ اس کے گلن اس دنیا کی آواز نہیں سن رہے تھے لیکن کچھ مردہ سی آواز کانوں میں آرہی تھی۔ وہ زندگی اور موت کے درمیان تھا۔ لیکن وہ مرے گا۔ اس نے بھی تو زہر نہیں کھلایا تھا۔“

کیا اس کی شکست اسے بہت پہلے سے مارنی آرہی تھی۔ کیا احساس محرومی اسے آہستہ آہستہ قتل کرتا رہا تھا یا وہ نفسیاتی مریض بہت عرصے سے اندر ہی اندر کھوکھلا ہوتا چلا آ رہا تھا۔ اور اب انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

ایسے ہی وقت اسے جگ آگئی کی دھیمی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”مراد میں پہلے ہی تم سے کہہ چکی تھی۔ کوئی شخص موت سے پہلے نہیں مر سکتا۔ اور کوئی موت کے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ مونا بھی موت سے پہلے کبھی نہیں مرے گی۔“ یہ بات مراد کے کانوں میں دھماکا بن گئی۔ ”مونا موت سے پہلے کبھی نہیں مرے گی؟ مونا نہیں مرے گی؟“

پھر جیسے دیا آخری بار بھڑکتا ہے ’اسی طرح مراد نے بھڑک کر گردن اٹھائی۔“ مونا نہیں مرے گی؟“

اس نے دھندلائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر پھر اس کی گردن دھچک گئی۔

☆-----☆

مونا کی روانگی میں چار گھنٹے رہ گئے تھے۔ کامران کے ساتھ یہ چار گھنٹے بھی گزارنے کا ٹھیک طرح موقع نہیں مل رہا تھا۔ پہلے تو انہوں نے ڈاکٹر بنز کو فون پر مراد کی موت کی اطلاع دی تھی۔ پھر اس کے مٹی کی بجائی کے ملازمین کو کالچ بھیجنے کے لئے کہا تھا۔ وہ سب پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر بنز نے مراد کی لاش کو دیکھ کر ایک گہری سانس لی۔ پھر گمک "افسوس" یہ اپنی جان سے خود گیمک میرے سمجھانے کا ایک اثر نہ ہوا۔"

کامران نے پوچھا۔ "کیا اس کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے؟"

ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کیوں؟ پوسٹ مارٹم کی کیا ضرورت ہے۔ میں ابھی طرح جانتا ہوں" یہ اپنی موت آپ مڑا ہے۔ اسے فینے اور مونا نے نہیں مارا۔ اسبابی محرومی نے مارا ہے۔"

مراد کا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ کوئی ہو بھی تو اس نے کبھی کسی سے ذکر نہیں کیا تھا۔ ایک کامران جیسا دوست تھا اسے بھی دشمن بنا چکا تھا۔ آخر وقت بھی دوستی کا فریب دے کر جان لینے کی کوشش کی تھی۔ ایسے میں بھلا کامران اور مونا اس کی تجویز و تحفین تک کیسے رک سکتے تھے۔ انہوں نے اس کی آخری رسومات کی ذمہ داری سنی کیب ابجی کے ملازمین پر چھوڑ دی۔ مونا پہلے ہی ہاسٹل سے اپنا سامان لے آئی تھی۔ وہاں سے انہوں نے جیسی لی، مراد کی کار اس کے کالچ کے سامنے ہی چھوڑ دی۔ پھر ایئر پورٹ پہنچ گئے۔

وہاں بھی قانونی کارروائیوں میں بڑی دیر ہو گئی چونکہ وہ خفاقت پر رہا کی مٹی تھی، اس لئے قانوناً کچھ خلعہ پری لازمی تھی۔ مونا سے ضبط نہیں ہو رہا تھا۔ وہ آنسو بھری آنکھوں سے کبھی قانون کے مجاہدوں کو دیکھتی تھی کبھی کامران کو۔ کہ وہ چاقی تو فرضی کامران کی بیوی بن کر رہ سکتا تھی اور اپنے کامران کے ساتھ زندگی گزار سکتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی اس نے حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ جھوٹ اور فریب سے توبہ کر لی تھی۔ وہ ایگریٹیشن کے ایک دفتر میں کمرے میں تھی۔ وہاں کے ایک آفیسر کو آنسو بھری

آنکھوں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ میں قانون کے سامنے لڑاؤ کی بن گئی۔ میں نے یہ ثابت کیا کہ میں ایگریٹیشن کی مادی نہیں ہوں، میرے بھی ہزاروں محرمات ہیں، مونا اور بچے یہاں ایگریٹیشن قانون کی خفتیاں پھیل رہے ہیں۔ اس لئے وہاں کے قانون میں چلک پیدا کرنے کے لئے بہت کچھ کر لیا لیکن بات نہیں بنی۔ اب کیا کیا جائے؟ کون سا راستہ اختیار کیا جائے؟ جب کوئی راستہ نہیں رہتا تو صرف دو راستے بھٹائی دیتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ دعا کی جائے، دوسرا یہ کہ مردہ ضمیر کو بھٹھوڑا جائے، اسے زندہ کیا جائے۔ کیا یہاں بیٹھے ہوئے ایگریٹیشن کے اس آفیسر کا ضمیر زندہ ہو سکتا ہے۔ کیا آج سے قانون میں کوئی چلک پیدا ہو سکتی ہے؟

اس کی وحند لائی ہوئی آنکھوں کے سامنے منظر وحند لانے لگا۔ جب وہ منظر آہستہ آہستہ واضح ہونے لگا تو اس کے سامنے عدالت کا کردہ تھا۔ ضمیر کی عدالت کا۔

منصف اعلیٰ قانون کے جھوڑے کو میز پر بجاتے ہوئے کہہ رہا تھا "ادب" ادب یہ ضمیر کی عدالت ہے یہاں کون شور مچا رہا ہے؟"

مونا دوڑتی ہوئی پہنچی ہوئی، فریاد کرتی ہوئی آ رہی تھی۔ عدالت کے کمرے سے گزر رہی تھی۔ پھر درج کے سامنے پہنچ کر بولی۔ "دہائی ہے، اے منصف اعلیٰ دہائی ہے۔ میں سات سمندر پار کر کے اپنے کامران تک پہنچ گئی ہوں پھر یہاں سے واپس جا رہی ہوں۔"

ایک آواز آئی۔ "اے منصف اعلیٰ" یہ اپنی مرضی سے واپس جا رہی ہے۔"

مونا نے کلمہ "بے شک" اپنی مرضی سے جا رہی ہوں مگر دل سے نہیں جا رہی ہوں۔ میرا دل تو تیسریں سے میں انصاف کا تقاضا پورا کرنے کے لئے، قانون کا احترام کرنے کے لئے اپنی غلطیوں کا اعتراف کرنے کے لئے جا رہی ہوں۔ کیا غلطیوں سے توبہ کرنے اور قانون کا احترام کرنے کا اجماع ملے نہیں لے گا؟"

منصف اعلیٰ نے کلمہ "بے شک" اچھائی کا صلہ اچھائی سے ملتا ہے۔ میں حکم دیتا ہوں، محبت کے رشتوں کو قانون کی چھری سے نہ کاٹو۔ انسانیت کے نام پر اپنے ضمیر کو بیدار کرو۔"

”جو لوگ اپنے ہی ملکوں میں اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکتے وہ ہمارے ملک میں اپنے حقوق کی باتیں کیوں کرتے ہیں؟“

”اور منصف اعلیٰ تم ہو کہ ضمیر کی باتیں کرتے ہو“ ضمیر کی باتیں۔ ا ا ا ا ا

پھر چاروں طرف سے قہقہے بلند ہوئے گئے۔ منصف اعلیٰ بے بسی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ انہیں تاریکی سے روشنی میں نہیں لاسکتا تھا۔ وہ جتنے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ”ضمیر؟ کیسا ضمیر؟ سرحدی قوانین بنانے والوں کے سینوں میں تو دل نہیں ہو کہ تم ضمیر کی بات کرتے ہو۔“

پھر قہقہے بلند ہوئے گئے۔ قہقہوں کی گونج میں آواز آرہی تھی۔ ”ضمیر مُردہ باز“ ضمیر مُردہ باز“ ضمیر کی عدالت کا پانچواں تک پہنچ گیا تو پھر کسی ملک کی کوئی سرحد نہیں رہے گی۔ ہر جگہ ضمیر روشن رہے گا اور جہاں ضمیر روشن ہو گا وہاں انسانیت رہے گی اور جہاں انسانیت رہے گی وہاں سرحدیں نہیں رہیں گی۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے تک ایک ہی ملک، ایک ہی برادری، ایک ہی انسانیت کے ظہور وار لوگ ہوں گے۔ اس لئے ضمیر مُردہ باز“ ضمیر کی عدالت کا پانچواں تک پہنچو، ”مرد“ منصف اعلیٰ کو زندہ نہ چھوڑو۔“

پھر وہاں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ منصف اعلیٰ کے چہرے پر کیلے کے جھلکے، ٹماڑ اور گندے اٹوے آکر ٹوٹ رہے تھے، بکھر رہے تھے۔ روشن ضمیر کو آلودہ کر رہے تھے اور منصف اعلیٰ کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ان آنسوؤں میں منظر وحدت رہا تھا۔

مونا کارمران کے بازو سے لگ کر رونے لگی۔ وہ اسے سارا دے کر ایئر پورٹ کی عمارت کے اس حصے میں آگیا جہاں اسے جدا ہونا تھا۔ ان کے پاس بولنے کے لئے بہت کچھ تھا لیکن جب کچھ ہو نہیں سکتا تھا تو وہ کیا بولتے۔ پرواز کا وقت ہو رہا تھا۔ کارمران نے صرف اتنا ہی کہا۔ ”میں آؤں گا بہت جلد آؤں گا اور دو لہجہیں کر آؤں گا۔“

وہ جھکیاں لے کر کر رونے لگی۔ اس کے حلق سے جھپٹیں نکلتا چاہتی تھیں اس لئے دوپٹے کے سرے کو منہ میں ٹھونس لیا۔ فوراً ہی وہاں سے پلٹ کر تیزی سے جانے

پہلے کہہ کر وہ سامنے کھڑے ہوئے لوگوں کو دیکھنے لگا۔ عدالت کے کمرے میں نیم تاریکی تھی۔ وہاں جتنے لوگ کھڑے ہوئے تھے، وہ سب سامنے کی طرح نظر آ رہے تھے کسی کا چہرہ واضح نہیں تھا۔ وہ مُردہ ضمیر کی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ منصف اعلیٰ نے اپنے باوقار لیجے میں کہا۔ ”میں ضمیر کی عدالت میں روشنی کا پتھر ہوں“ جو اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں انہیں روشنی دیتا ہوں۔ روشن ہو جاؤ، اے لوگو! روشن ہو جاؤ! مل کو پیٹنے سے بہن کو بھائی سے بیٹی کو باپ سے اور بیوی کو شوہر سے الگ رکھنا سب سے بڑا جرم ہے۔ ایسا قانون بھی نہ بنائو جو انسان کو انسان سے الگ کر دیتا ہو۔“

اس کے جواب میں خاموشی رہی۔ وہ تاریکی میں ڈوبے ہوئے لوگوں کو روشن کرنا چاہتا تھا۔ انہیں روشنی میں لانا چاہتا تھا لیکن وہ بدستور تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس نے پھر قانون کے ہتھوڑے کو میز پر بجاتے ہوئے کہا۔ ”میں خدا کے نام پر انسانیت کے نام پر تمہاری ماؤں بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کے نام پر احتجاج کرتا ہوں“ اپنے ضمیر کو روشن کرو اور انسان کے لئے انسانی قانون بنادو۔“

جواب میں اچانک ہی قہقہے بلند ہوئے گئے۔ تاریکی میں جتنے سامنے کھڑے ہوئے تھے، وہ سب قہقہے لگا رہے تھے۔ عدالت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ان کے بے تحاشے قہقہے یوں گونج رہے تھے جیسے وہ منصف اعلیٰ کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ پھر وہ تاریک سامنے کیے بعد دیکرے پوچھنے لگے۔

”کیسا ضمیر؟“

”کس کا ضمیر؟“

”آج تک کسی بھی سرحد کے اطراف کسی نے ضمیر کی آواز نہیں سنی۔ شاید کسی نے ضمیر کا نام بھی نہیں سنا۔“

”ہاں، نہیں سنا اگر نہ سنا ہے تو اے منصف اعلیٰ جواب دو۔ کیا فلسطینی باشندوں کو اپنے ہی ملک میں آنے، رہنے اور بسنے کی اجازت ہے؟“

”اے منصف اعلیٰ! جواب دو۔ کیا ایک سابقہ پاکستان کے بھاریوں کو اپنے ہی پاکستان میں آکر آباد ہونے کی قانونی اجازت ہے؟“

گئی۔

پھر وہ جانے والی چلی گئی۔ اس کے آنسو اور آپیں اس کے تصور میں رہ گئے۔
 ”اے ضمیر! یہ اچھی بات ہے کہ تو ایک ہی بار نہیں مرتا۔ کبھی مرتا ہے کبھی زندہ
 ہوتا ہے جب تک انسان کے دم میں دم ہے، جب تک موتا اور کامران کے دم میں دم
 ہے وہ قانون سازوں کے ضمیر کو بیدار کرنے کے جدوجہد کرتے رہیں گے۔“

☆-----☆ ختم شد ☆-----☆